ذوالفقار علی بھٹو

کوثر نیازی

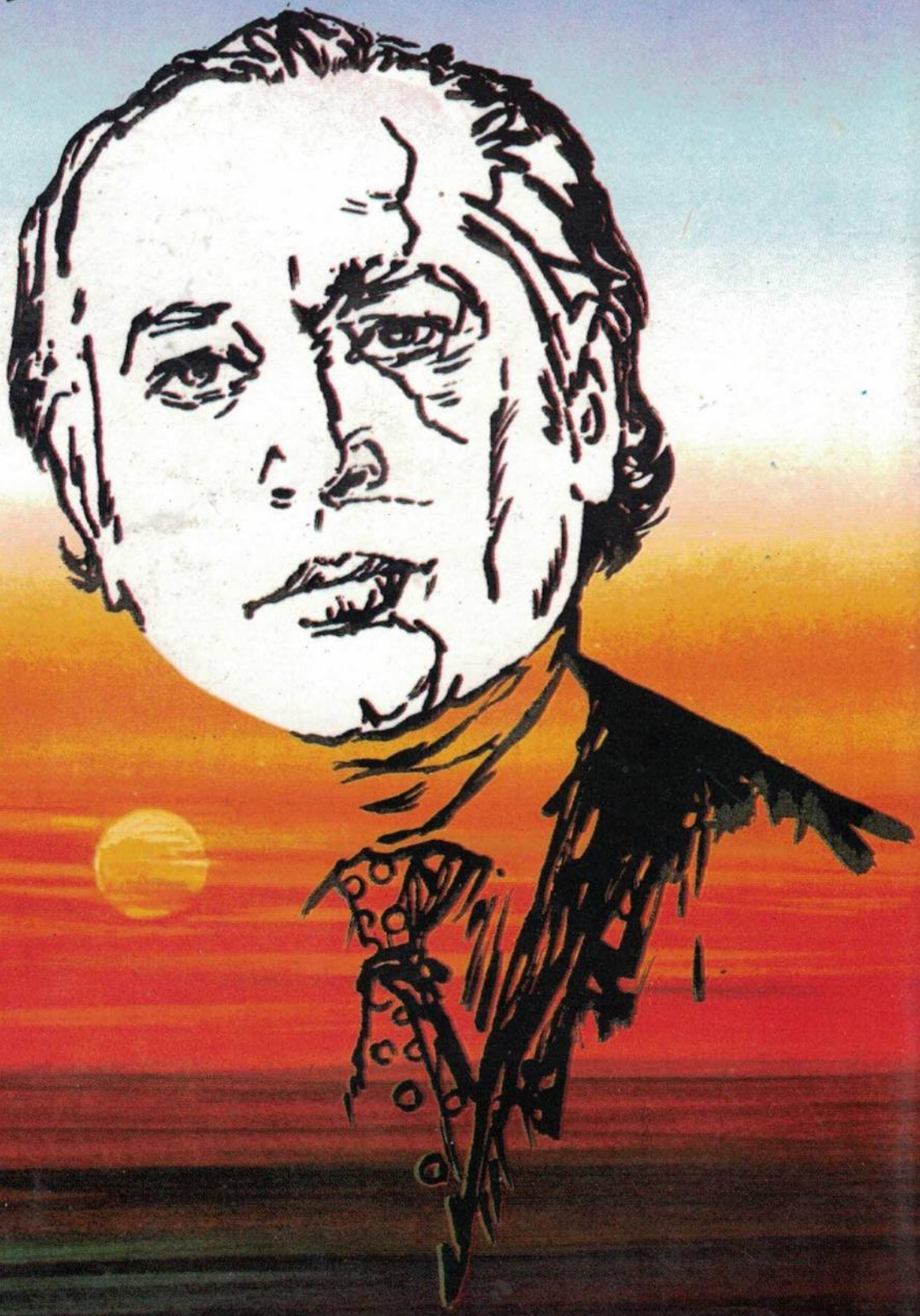

جنگ پبلشرز

www.bhutto.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

www.bhutto.org

مصنف اور ذوالفقار علی بھٹو

www.bhutto.org

اکیسویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ
ہر عمر اور ہر ذوق کے قارئین کے لئے
خوبصورت اور معیاری مطبوعات

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت اوّل	مئی ۱۹۸۹ء
اشاعت دوم	فروری ۱۹۹۰ء
اشاعت سوم	نومبر ۱۹۹۰ء
اشاعت چہارم	مارچ ۱۹۹۱ء
تعداد (ہر اشاعت)	۱۰۰۰
قیمت (پیپر بیک)	[redacted] روپے
بیرون ملک قیمت	۹ امریکی ڈالر
پروڈکشن انچارج	گوہر سلطانہ عظمیٰ
اہتمام	مظفر محمد علی
ناشر	جنگ پبلشرز۔ لاہور
مطبع	جنگ پبلشرز پریس
	۱۲۔ سر آغا خان روڈ۔ لاہور

www.bhutto.org

انتساب

راز دنیا پہ کھلا ہے یہ ترے قتل کے بعد
لوگ مر کے بھی رہا کرتے ہیں زندہ کیسے؟

کون کتنا ہے ترے قتل کی سازش میں شریک
اک نہ اک روز نقاب اٹھے گا ہر چہرے سے

شہر تو محو مناجات و دعا تھا' پوچھو
حاکم شہر نے وہ رات گزاری کیسے ؟

جیسے دراصل ہوا کرتے ہیں کوثرؔ حالات
بسا اوقات نظر آتے نہیں ہیں ویسے

www.bhutto.org

ترتیب

	نقش ثانی	9
	نقش اول	11
پہلا باب	بڑے باپ کا بیٹا	13
دوسرا باب	ہر موڑ پر اک رام چندانی	31
تیسرا باب	ایوب خان کی کابینہ میں	37
چوتھا باب	پاک چین تعلقات کا بانی	41
پانچواں باب	راستے جدا ہوتے ہیں	45
چھٹا باب	بھٹو اور برٹرینڈرسل	65
ساتواں باب	پیپلز پارٹی کا قیام	99
آٹھواں باب	جدوجہد کے میدان میں	107
نواں باب	گرفتاری اور رہائی	123
دسواں باب	مشرقی پاکستان میں عوامی تحریک	127
گیارھواں باب	طوفانی دورے اور انتخابی مہم	137
بارھواں باب	مشرقی پاکستان کی علیحدگی	157
تیرھواں باب	گرداب میں کنارا	175

www.bhutto.org

چودھواں باب	داخلی محاذ	185
پندرھواں باب	بچھڑے ہوئے بھائیوں سے ملاپ	191
سولھواں باب	عالم اسلام اور بھٹو	197
سترھواں باب	خارجہ پالیسی کا معمار	209
اٹھارھواں باب	اپوزیشن کا کردار	219
انیسواں باب	شخصیت..... تاثرات و مشاہدات	227
بیسواں باب	مستقبل کا صورت گر	253
	پس نوشت	263

www.bhutto.org

نقشِ ثانی

زیرِ نظر تصنیف پہلی مرتبہ 1977ء کے اوائل میں "دیدہ ور" کے نام سے منظرِ عام پر آئی تھی' اس وقت سے لے کر اب تک ہزاروں لاکھوں افراد اس کا مطالعہ کر چکے ہیں مگر قدرتاً مارشل لا کے گیارہ سالہ تاریک اور طویل دور میں کسی پبلشر نے اسے دوبارہ شائع کرنے کی ہمت نہیں کی' اس زمانے میں کئی اخباری مکالموں میں بعض دوستوں نے طنزاً اور بعض نے استفساراً اس کتاب کے بارے میں مجھ سے سوالات کئے اور میں نے واضح لفظوں میں یہ جواب دیا کہ اس کے مندرجات پر میں اب بھی قائم ہوں' آخر افکار و نظریات لباس کی مانند نہیں ہوتے جنھیں ہر موسم کی تبدیلی پر اتار پھینکا جائے' ان میں ارتقاء ضرور ہوتا ہے لیکن تغیّر نہیں ہوتا کہ دن رات بن جائے اور رات دن میں تبدیل ہو جائے۔

یہ صحیح ہے کہ اس کتاب سے 77ء کے دور کے بعد کے حالات پر روشنی نہیں پڑتی مگر غائر نظر سے اس کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں آنے والے واقعات کی پیش بینی ضرور ملتی ہے' اس وقت اس کے آخری باب "مستقبل کا صورت گر" میں' میں نے مستقبل کے چند امکانات کا تذکرہ کیا تھا' قارئین کرام پہلے دو ایڈیشنوں میں بھی انہیں ملاحظہ فرما سکتے ہیں اور اس تازہ نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن میں بھی انہیں آخری صفحات میں دیکھا جا سکتا ہے' میں نے لکھا تھا:

> "اب ہم اپنی تاریخ کے نازک ترین دور میں آ چکے ہیں بالخصوص آئندہ چار ماہ میں منعقد ہونے والے انتخابات میں وہ طبقے جن کے مفادات کو بھٹو نے زِک پہنچائی ہے اپنی زندگی اور موت کی آخری جنگ لڑیں گے' ان انتخابات میں یہ فیصلہ ہونا ہے کہ ملک میں عوامی انقلاب کا جو عمل بھٹو نے شروع کیا ہے اسے آگے بڑھانا ہے یا ایک بار

www.bhutto.org

پھر استحصالی طبقوں نے اُبھرتے ہوئے محنت کشوں کی قوت کو کچل دینا ہے"

بدقسمتی سے زندگی اور موت کی اس آخری جنگ میں استحصالی طبقے اپنی سازشوں میں کامیاب ہوئے اور جناب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا' یہ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ اس کی تفصیلات میں جانے کا یہاں موقع نہیں' جن حضرات کو اس موضوع سے دلچسپی ہو وہ اس سلسلے میں میری ایک دوسری تصنیف "اور لائن کٹ گئی" کا مطالعہ کریں جو اس کتاب کے دوسرے حصّے کی حیثیت رکھتی ہے' اس میں تفصیل سے ان بیرونی عوامل کا بھی ذکر ہے جنھوں نے اس منتخب عوامی حکومت کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا اور ان غلطیوں کا تجزیہ بھی موجود ہے جو ایک بھیانک مارشل لا کے نفاذ پر منتج ہوئیں' کسی قائد کو دیدہ ور اور لیڈر ماننے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اسے منزہ عن الخطا اور ایک مافوق البشر شخصیت بھی تسلیم کیا جائے۔ بڑے آدمیوں کی غلطیاں بھی بڑی ہوتی ہیں اور اگر بعد کے مراحل میں اس طرح کے بعض امور کی میں نے نشان دہی کی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے اپنے "دیدہ ور" قائد کے مقام اور منزلت میں کمی کی ہے۔ ایک سیاسی رفیق اور ایک جاگیر پر کام کرنے والے مزارع کے حقوق و فرائض میں جو فرق روا رکھا جانا چاہئے وہ نظر میں ہو تو قارئین کو اس سلسلے میں کوئی اشکال لاحق نہ ہوگا۔

میں "جنگ پبلشرز" کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کے نظر ثانی شدہ ایڈیشن کو نئے ٹائیٹل اور نئے اہتمام سے شائع کرنے کی حامی بھری کتاب کا ٹائیٹل ضرور بدلا گیا ہے لیکن اس کے مندرجات وہی ہیں کہیں کہیں میں نے زبان کی اصلاح کی ہے اور کہیں کہیں طوالت کو اختصار میں تبدیل کیا ہے' مجھے امید ہے کہ نئے دور میں جمہوریت کی طرف پیش رفت کرتے ہوئے پاکستان کے انقلابی کارکنوں کے سفر میں یہ کتاب حقیقی معنوں میں زادِ راہ ثابت ہوگی۔

کوثر نیازی

8 رجنوری 89ء

www.bhutto.org

نقشِ اوّل

میں کافی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ پاکستان کی تاریخ کے سب سے منفرد، عہد آفریں اور صاحب اسلوب سیاسی راہنما جناب ذوالفقار علی بھٹو کی ہمہ صفت شخصیت و طرزِ سیاست کے مطالعے پر مبنی کوئی کتاب لکھوں، لیکن کچھ اپنی ذمہ داریوں اور کچھ اس کام کی نزاکت و نوعیت کی بناء پر یہ حوصلہ نہیں پڑتا تھا کہ اتنے اہم کام میں ہاتھ ڈالوں اس کے علاوہ یہ احساس بھی دامن گیر تھا کہ میں خود اپنے ممدوح کی پارٹی کا ایک رکن اور ان کی کابینہ کا وزیر ہوں اور بعض لوگ شاید اسے خوشامد پر مبنی قرار دے ڈالیں لیکن اس کے ساتھ ہی جب میں قرطاس و قلم کی دنیا پر نگاہ ڈالتا تو یہ دیکھ کر اس کی کوتاہ دامنی کا خیال ابھرتا کہ ایسے عظیم راہنما کی طویل جدوجہد، شخصیت کی عظمت اور منفرد اسلوبِ سیاست کا احاطہ کرنے والی کوئی ایسی قابل ذکر کتاب موجود نہیں جو ایشیا کے اس انقلابی لیڈر کی مجاہدانہ جدوجہد اور سیاسی مہارت کے مطالعے و تجزیئے کا پورا حق ادا کر سکے۔ اس سلسلے میں جتنی کتابیں میری نظر سے گزریں وہ مقصد سے خلوص اور جناب بھٹو کی شخصیت کے احترام کی حامل ہونے کے باوجود ایک تشنگی کا احساس چھوڑ جاتی ہیں۔ کئی ایک کتابیں تو محض اخباری تراشوں ترتیب دار مجموعوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر بار بار خیال آتا کہ کیوں نہ تصنیف و تالیف کے ساتھ اپنے دیرینہ تعلق کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی بساط کے مطابق یہ فرض پورا کرنے کی کوشش کروں۔ جہاں تک خوشامد کے الزام کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں یہ سوچ کر میں اپنے دل کو تسلی دے سکتا تھا کہ کم از کم ہم لوگوں پر یہ الزام عائد نہیں کیا جا سکتا جو جناب بھٹو کے دکھ درد کے ساتھی ہیں، ہم نے ان کی قیادت قبول کرنے کا فخر اس وقت حاصل کیا جب ان کا ساتھ دینے کا مطلب دار و رسن کی آزمائش میں پڑنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہم تو مقتل کی راہ سے گزر کے ان کے نقوشِ قدم پر چلے ہیں، ہم ان کے اقتدار ہی کے رفیق نہیں پُرخطر جدوجہد کے کڑے لمحوں کے بھی شریک ہیں۔

اس قسم کے احساسات سے تقویت پا کر آخر کار میں نے شدید مصروفیات کے باوجود اس کٹھن لیکن خوشگوار کام کی ابتدا کر ہی دی، ہر چند میں ایک عرصہ سے ان کی قربت کی دولت سے مالا مال تھا لیکن پھر بھی موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کے پیش نظر مجھے اَن گنت کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا۔ بھٹو

www.bhutto.org

صاحب کی تقریروں اور تحریروں پر ایک بار پھر نگاہ ڈالنی پڑی اور اس طرح ہر ممکن حد تک کوشش کی کہ ایک معیاری اور مستند کتاب کی تصنیف کے تقاضوں کو پورا کر سکوں' ہر چند میں وہ معیار قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا جس کا تعین میں نے اپنے ذہن میں کیا تھا لیکن پھر بھی اتنا ضرور ہے کہ موضوع کی بے پناہ وسعتوں کے باوجود میں ایک قابل مطالعہ اور مستند کتاب مکمل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ میرے لیڈر کی طرف سے میری ذات پر یہ ایک پُرانا قرض تھا جسے ادا کر کے میں آج خود کو سرخرو محسوس کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس کتاب میں طویل اقتباسات اور تراشوں کی ثقالت نہیں پائیں گے' میں نے ایک سوانح نگار یا تاریخ نویس کا انداز اختیار کرنے کے بجائے ایک طالب علمانہ مطالعے کا انداز اختیار کیا ہے جس میں محض واقعات ہی نہیں انکے پس منظر' تہہ منظر میں کام کرنے والے محرکات کی تفصیل اور ان کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے' اس کے باوجود یہ ایک نقشِ اوّل ہے۔ پاکستانی عوام کے محبوب قائد کی شخصیت وسیاست کا ایک ایسا مطالعہ ہے جس میں خلوص وعقیدت ہی نہیں ایک بے لاگ سائنسی تجزیئے کے عناصر بھی شامل ہیں اور اس لحاظ سے تو یہ کتاب بہرحال اپنی نوعیت کی پہلی کتاب کہلانے کا حق رکھتی ہے اس کے مصنف کو جناب بھٹو کی ذات کے قریب رہ کر مشاہدے ومطالعے کی سہولتیں حاصل تھیں' یہ پہلی کتاب ہے جسے ان کے کسی قریبی ساتھی نے لکھا ہے۔

مجھے یہ کہنے میں تامّل نہیں کہ اس کتاب کی اشاعت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا اگر مجھے قدم قدم پر اپنے پُرانے دوست اور رفیق اور ملک کے مشہور صحافی جناب نذیر ناجی کا تعاون حاصل نہ ہوتا۔ انہوں نے اس کتاب کی ترتیب اور تسوید میں جس ذوق وشوق سے میری مدد کی ہے اس کا شکریہ ادا نہ کرنا احسان فراموشی کے مترادف ہو گا۔

میں اس سلسلے میں خاتونِ اوّل محترمہ بیگم نصرت بھٹو کا بھی شکر گزار ہوں کہ کتاب کی تکمیل کے دوران مجھے جب بھی کسی حوالے یا دستاویز کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے اہم ترین مصروفیات کے باوجود اس کام میں گہری دلچسپی لے کر میری مدد کی اور پھر اپنا قیمتی وقت نکال کر اس کے مسوّدے کا مطالعہ فرمایا اور مجھے قابل قدر مشوروں سے نوازا۔ سچ پوچھئے تو مسوّدے کے مطالعے کے بعد انہوں نے جس طرح اظہارِ پسندیدگی کیا اس نے میرا حوصلہ بڑھایا اور میں اس کی اشاعت کے لئے آمادہ ہوا۔ جناب یوسف بچ بھی میرے جذبۂ تحسین وتشکر کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بھی منصبی ذمہ داریوں کے باوجود اس کتاب کا مسوّدہ توجہ کے ساتھ پڑھا اور اپنی گراں قدر رائے سے نوازا۔ میں اپنے دوست خان محمد حنیف خاں وزیر اطلاعات ونشریات کا بھی ممنون ہوں جن کا پُرزور اصرار کتاب کی ترتیب واشاعت کا باعث بنا۔

کوثر نیازی

اسلام آباد۔ 5/جنوری 77ء

www.bhutto.org

باب اول

بڑے باپ کا بیٹا

"میں بارہ سال کی عمر میں ایک مرتبہ بذریعہ بس سری نگر جا رہا تھا۔ مسافروں کی حالت زار دیکھ کر میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ ٹرانسپورٹ کو قومی ملکیت میں لے لوں گا۔"

کوئی دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ لمحہ بُت شکنی سے بہت پہلے اسے جنم دے لیا کرتا ہے۔

بارہ سالہ ذوالفقار علی بھٹو کی یہ سوچ' جس کا اظہار انہوں نے پاکستان کی قیادت سنبھالنے کے بعد لاہور کے ایک اجتماع میں کیا' اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ عہد ساز شخصیتیں اچانک منظر عام پر نہیں آجایا کرتیں بلکہ نرگس کی ہزاروں سالہ بے نوری کا وہ اجر ہوتی ہیں' جو ایک خاص وقت پر چمن کو نور کی صورت میں ملنا ودیعت کر دیا گیا ہوتا ہے۔ بلکہ میں تو اس سے بھی آگے یہ کہوں گا کہ قدرتِ خداوندی کسی عہد کی قیادت کرنے والے جوہرِ قابل کو جنم دینے سے قبل اس کی پرورش و پرداخت کے لئے گہوارے کا انتخاب بھی پورے اہتمام و التزام کے ساتھ پہلے ہی سے کر لیتی ہے۔

(مشاہیر عالم میں سے کسی کی سوانح اٹھا کر دیکھ لیں۔ آپ کو پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو جائے گا کہ اس شخصیت کی نشوونما کے لئے اسی ماحول کی ضرورت تھی)

ماؤزے تنگ کو گاؤں کے ایک غریب گھرانے ہی میں پیدا ہونا تھا۔ چو این لائی کو شہری اشرافیہ کے بورژوا ماحول ہی کی ضرورت تھی۔ آگے چل کر ان دونوں نے تاریخ میں اپنا جو کردار انجام دیا ہے وہ خود اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ چین کے انقلاب کو کسانوں کے دہقانی ٹھیٹ پن اور درمیانہ طبقے کی معاملہ فہمی اور نرم و ملائم ڈپلومیسی کا توازن دینے کے لئے ان دونوں رہنماؤں کو یہی خاندانی پس منظر درکار تھا۔

www.bhutto.org

خود ہمارے قائداعظمؒ درمیانہ طبقے کے تاجر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آگے چل کر انہوں نے ہندو سرمایہ دار اور انگریز سامراجیوں کے خلاف مسلمانوں کی جنگ آزادی کی جو بے مثال قیادت کی' وہ صرف ایک وکیل کے بس کا کام نہیں تھا بلکہ اس کے معاشی پس منظر کو سمجھنے کے لئے اس بصیرت کی بھی ضرورت تھی' جو قائداعظمؒ کو اپنے خاندانی پس منظر کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ میں سامنے کی ان چند مثالوں پر اکتفا کر رہا ہوں۔ لیکن اس کلیئے کی روشنی میں آپ دنیا کی کسی عظیم شخصیت کی سوانح کا مطالعہ کر لیں آپ پر یہ حقیقت واضح ہوتی چلی جائے گی۔

ذوالفقار علی بھٹو کو جنم دینے کے لئے گھرانے کا انتخاب کرتے وقت بھی شاید قدرت انہی اصولوں پر کاربند تھی۔

حصار کے راجپوت مسلمانوں کی ایک شاخ جب آج سے تقریباً تین سو سال قبل ایک مذہبی خاندان کی محبت و عقیدت سے مغلوب ہو کر سندھ میں آکر آباد ہوئی تو گویا ایک نئے مزاج کی بنیاد رکھ دی گئی۔ ایسا مزاج جس کے عناصر میں ایک طرف راجپوتوں کی روائتی جرأت' بے باکی اور دلیری شامل تھی تو دوسری طرف اسلامی مزاج کی حق پرستی' جہاں بینی و دانائی موجود تھی۔ نسل در نسل یہ عناصر ایک دوسرے میں بہتر سے بہتر انداز میں تحلیل ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ میرانِ تالپور کے عہد میں اس خاندان میں ایک اور عنصر کا اضافہ ہوا۔ اس خاندان سے ربط و ضبط اور قربت کے باعث بھٹو خاندان میں آدابِ حکمرانی بھی آگئے' یہ اور بات ہے کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو کے والد گرامی سر شاھنواز جب عملی زندگی میں داخل ہوئے تو اندازِ حکمرانی بدل چکے تھے۔ اس وقت برّصغیر میں حالات ایک عظیم تاریخی کروٹ بدلنے سے پہلے اپنے مضمحل قویٰ کو خوابیدگی سے آزاد کرانے کے لئے جھٹکے دے رہے تھے۔ سر شاھنواز 1920ء میں لاڑکانہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے صدر منتخب ہوئے۔ ان کے سیاسی رول کا جائزہ لینے سے قبل ایک نظر برّصغیر کے مجموعی حالات پر ڈال لی جائے تو نامناسب نہ ہو گا۔

یوں تو برّصغیر میں محمد بن قاسم کی آمد کے ساتھ ہی مسلم قومیت وجود میں آگئی تھی اور اس وقت کے فرسودہ اور ظالمانہ نظام کے ساتھ اسلام کے عادلانہ و منصفانہ نظریۂ حیات کا ٹکراؤ شروع ہو گیا تھا لیکن آنے والی کئی صدیوں تک یہ تضاد معاندانہ حیثیت اختیار نہ کر سکا اور اس کی بہت سی وجوہ تھیں۔ اسلام اپنے جدید اور انقلابی ضابطۂ حیات کی وجہ سے ہندو مت کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ اور عوام کا نجات دہندہ مذہب تھا۔ مسلمانوں کا طرزِ حکومت مقامی ہندو راجاؤں کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ عادلانہ و منصفانہ تھا۔ سندھ میں نوجوان محمد بن قاسم کی تیز رفتار فتوحات کی وجہ صرف مسلمانوں کی جنگ جوئی نہ تھی بلکہ اس میں اور بھی بہت سے عناصر کارفرما تھے جہاں مسلمانوں کو اپنے عقیدے پر بھرپور ایمان تھا اور وہ دل کی گہرائیوں سے اپنے منصفانہ نظام حیات کے قائل تھے وہاں سندھ کے محنت کش اور غریب عوام کے پاس

www.bhutto.org

سوائے غربت اور ظلم و جبر کے بچانے کے لئے کچھ نہ تھا۔ جنگوں میں فیصلہ کن چیز قوموں کے ہتھیار اور افواج کی تعداد ہی نہیں ہوا کرتے بلکہ وہ نظام ہائے حیات بھی ہوتے ہیں جن کے تحفظ اور فروغ کے لئے قومیں نبرد آزما ہوتی ہیں' یہ حقیقت کل کی طرح آج بھی ناقابل تردید ہے۔

سندھ کے مظلوم عوام راجہ داہر کے مظالم سے اس قدر تنگ آئے ہوئے تھے کہ انہوں نے صرف مسلمان فاتحین کی مزاحمت نہ کی' بلکہ انہیں اپنا نجات دہندہ تصوّر کر کے خوش دلی سے قبول بھی کیا' بعد میں آنے والے بعض مسلمان بادشاہوں کے ذاتی افعال پر حرف گیری کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ بات بہرحال ناقابل تردید ہے کہ اسلامی تعلیمات کی وجہ سے ان بادشاہوں کا طرزِ حکومت بھی ہندو راجاؤں کے ظالمانہ و جابرانہ طرز حکومت کے مقابلے میں ہزار درجہ ترقی پسندانہ تھا' یہی وجہ ہے کہ وہ اقلیت میں ہونے کے باوجود صدیوں تک ان ہندو راجاؤں پر فتح حاصل کرتے رہے اور طویل عرصے تک مستحکم حکومتیں چلانے میں کامیاب رہے۔ عوام کی اکثریت کے تعاون کے بغیر مستحکم حکومت قائم کرنا ممکن ہی نہیں ہوا کرتا۔

جدید علم و دانش کی روشنی میں بعض مسلمان بادشاہوں کو ہدفِ تنقید بنانے والے نام نہاد ترقی پسند دانشور' ان کے تاریخی کردار کا جائزہ لیتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ اس زمانے میں ان کے مقابل ہندو ازم پر مشتمل راجے مہاراجوں کا جو طرزِ حکومت تھا وہ نہ صرف بدترین قسم کا استحصالی نظام تھا بلکہ اس کی ایک ایک سطر مظلوم انسانوں کے خون سے لکھی گئی تھی' یہ دانشور مسلمان بادشاہوں پر تنقید کرتے وقت خود اپنی منطق کی بھی نفی کر جاتے ہیں۔ وہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی فرسودہ اور رجعت پسند نظام اپنے سے بہتر اور ترقی یافتہ نظام کے مقابلے میں کبھی فتح یاب نہیں ہو سکتا' جس طرح قبائلی نظام کے مقابلے میں بادشاہت ترقی یافتہ نظام تھی' لہٰذا فتح اس کا مقدر تھی۔ بادشاہت کے مقابلے میں سرمایہ دارانہ نظام ترقی یافتہ تھا' لہٰذا اسے فتح یاب ہونا ہی تھا۔ علیٰ ہذا القیاس' لیکن برّصغیر میں مسلمان بادشاہوں کی رجعت پسند ہندو حکمرانوں کے خلاف کامیابیاں اور صدیوں تک ان کی مستحکم حکومتیں انہیں اس سائنسی کلیئے کی روشنی میں ناقابل فہم نظر آتی ہیں' حالانکہ ان کا استحکام خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے مدمقابل ہندو راجاؤں سے بہرحال ترقی پسند تھے۔ واضح رہے کہ ترقی پسندی کی اصطلاح اس دور کے معروضی حالات کے مدِنظر استعمال کی گئی ہے' مشہور ترقی پسند مفکر ایم این رائے بھی تسلیم کرتا ہے کہ:

"ہندوستان کو ظلم' جبر' ناانصافی اور جہالت سے نجات دلانے والی قوّت مسلمانوں کی تھی۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں برّصغیر نے ہر لحاظ سے شاندار ترقی کی۔"

زراعت کے لحاظ سے یہ دنیا کا خوشحال ترین خطّہ تھا' صنعت میں برّصغیر نے یہاں تک ترقی کی کہ بنگال کی کالی سلک کے خواب یورپ کی شہزادیاں دیکھا کرتی تھیں' مغلوں کے دورِ عروج میں برّصغیر کے عوام یورپ کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ آزاد اور خوشحال تھے۔ عام محنت کش ہندوؤں اور مسلمانوں میں

www.bhutto.org

کوئی نمایاں تضاد نہ تھا۔ البتہ ہندوؤں کے مذہبی لیڈر جو مسلمانوں کی حکومت میں روائتی استحصال کو قدیم ظالمانہ انداز میں' کھلے بندوں جاری نہ رکھ سکتے تھے اور پرانے راجواڑے جو ان پنڈتوں سے مل کر من مانیاں کرتے تھے اور ان کے حواری جو عوام کا خون چوسنے میں ان کے ساجھے دار ہوا کرتے تھے ان کا مسلمان حکمرانوں سے تضاد فطری بات تھی' اور یہ تضاد ایسا تھا جسے اکبر کی حد سے بڑھی ہوئی لبرل ازم بھی ختم نہ کر سکی تھی۔ اکبر کتنا بھی لبرل ہو جاتا لیکن بہرحال اس کی تربیت مسلمان گھرانے میں ہوئی تھی اور اس کا ذہن حکومتی مصلحتوں اور سمجھوتے بازیوں کی تمام حدیں پھلانگ کر بھی اس غیر انسانی استحصال پر آمادہ نہ ہو سکتا تھا جس کے یہ مراعات یافتہ ہندو طبقے متقاضی تھے' ظاہر ہے یہ بیل منڈے نہ چڑھ سکی' رائے عامہ پر چونکہ یہی طبقے اثر انداز ہوتے ہیں۔ لہٰذا بالائی سطحوں پر ٹھوس وجوہ کی بنا پر موجود یہ ہندو مسلم تضاد' عوام پر کسی نہ کسی انداز میں اثر انداز ہوتا رہا لیکن عوامی سطح پر اس تضاد نے معاندانہ شکل اختیار نہ کی۔

برِ صغیر میں انگریزوں کی آمد کے بعد جن لوگوں نے مغلوں سے غداری کر کے انگریزوں کی خفیہ اور بعد میں برملا مدد کی وہ ہندو عوام نہ تھے' بلکہ وہی مراعات یافتہ بنئے تھے' جو مغلوں کی موجودگی میں اپنی انسانی خون کی پیاس نہیں بجھا سکتے تھے۔ ابتدائی دنوں میں انہی ہندو بنیوں نے انگریزوں کو خفیہ مدد پہنچائی اور اس طرح انگریزوں کو مستقبل کی حکمتِ عملی تیار کرنے میں بالواسطہ مدد دی کہ اس خطّے پر غلبہ حاصل کرنے کا سب سے بڑا ہتھیار ہندو مسلم تضاد ہے' بشرطیکہ اسے محلوں اور حویلیوں سے نکال کر گلیوں اور کھیتوں میں عوام کے اندر پہنچا دیا جائے۔

برّصغیر کی تاریخ کا مطالعہ یہ حقیقت واضح کر دیتا ہے کہ اس خطّے میں مسلمانوں کی آمد سے لیکر انگریز کی آمد تک ہندو مسلم تضاد کا مطلب صرف نسبتاً بہتر اور منصفانہ طرزِ حکومت (جو مسلمان بادشاہوں نے تھوڑی بہت اسلامی روایات کی روشنی میں اختیار کیا تھا) اور ہندوؤں کے ظالم اور مراعات یافتہ رجعت پسند طبقوں کا باہمی تضاد تھا' ہندو عوام ان حکمرانوں سے خوش تھے۔ یہی وجہ ہے کہ برّصغیر کی تاریخ میں انگریزوں کی آمد سے قبل کسی ایک بھی ہندو مسلم فساد کا ذکر نہیں ملتا۔ حکومتوں کے لئے مختلف جنگیں اور معرکے ضرور ہوتے رہے لیکن ان میں دونوں طرف کی فوجوں میں ہندو اور مسلمان شامل ہوا کرتے تھے۔ بعد میں انگریز نے بھی جب برّصغیر پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے ہندو مسلم تضاد کو استعمال کرنے کی حکمت عملی کو اپنی پالیسی کا بنیادی جزو قرار دیا تو وہ بھی اس کو معاشی بنیاد فراہم کئے بغیر اس میں کامیاب نہ ہوا۔ حکمرانوں اور مراعات یافتہ طبقوں میں تو یہ تضاد پہلے سے موجود تھا' لیکن محنت کش عوام میں یہ تضاد صرف ایک نظریاتی حقیقت تھی۔ اس کی معاشی بنیاد موجود نہ تھی۔ سب سے پہلے بنگال میں انگریزوں نے عمل داری حاصل کرتے ہی ہندو بنیوں کو مالیہ وصول کرنے کے اختیارات دے کر پہلی بار اس تضاد کو معاشی بنیاد فراہم کی' برّصغیر کا باقی حصہ پھر بھی اس باہمی نفرت کے اثرات قبول نہ کر سکا۔ 1857ء کی

www.bhutto.org

جنگ آزادی ہندوؤں اور مسلمانوں نے شانہ بشانہ لڑی اور دونوں نے مشترکہ طور پر مغل بادشاہ کو اپنا رہنما تسلیم کیا' اگر نام نہاد ترقی پسند دانشوروں کی منطق تسلیم کر کے مغل بادشاہوں پر محنت کش ہندو عوام کے ساتھ ظالمانہ سلوک کا الزام تسلیم کر لیا جائے تو کیا یہ ممکن تھا کہ 57ء کی جنگ آزادی لڑنے والے محنت کش ہندو خون کی ندیاں پار کر کے دہلی جاتے اور ایک کمزور اور بوڑھے 'نام کے مغل بادشاہ کو اپنا رہنما تسلیم کرتے؟

1857ء کی جنگ آزادی میں برِصغیر کے عوام کی المناک شکست کے بعد جب انگریزوں نے باقاعدہ اپنی حکومت قائم کر لی تو پہلے سے طے شدہ حکمت عملی کے مطابق عوامی سطح پر ہندو مسلم منافرت کو معاشی بنیاد فراہم کرنے کے منصوبے پر عمل در آمد شروع کر دیا گیا۔ دہلی پر قبضے کے بعد ہندوؤں کو بہت جلد شہر میں عام داخلے کی اجازت مل گئی لیکن مسلمان کئی برس تک سرکاری ٹکٹ کے بغیر شہر میں داخل نہ ہو سکتے تھے اور اس کے بعد تو مسلمانوں پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔ صدیوں سے بے بسی کی زندگی گزارنے والے مراعات یافتہ ہندو طبقے نے آگے بڑھ کر انگریز کی سرپرستی حاصل کر لی۔ وہ تو پہلے ہی سے تیار تھا۔ مسلمانوں کو بلا امتیاز نشانہ ستم بنایا گیا اور ہندوؤں کو ہر سطح پر نوازا گیا' اور چند ہی برسوں میں صدیوں سے موجود اس تضاد کو معاشی بنیاد فراہم کر کے محنت کش عوام کی سطح پر بھی معاندانہ حد تک بھیانک بنا دیا گیا۔

بیسویں صدی کی ابتدا تک اس تضاد کو اتنی ٹھوس بنیادیں فراہم کی جا چکی تھیں کہ قائداعظمؒ جیسا عظیم مسلم رہنما بھی اپنی مخلصانہ کوششوں کے باوجود ہندو مسلم اتحاد کے مشن میں کامیاب نہ ہو سکا۔ 1920ء کا زمانہ وہ تھا جب ابھی روشن خیال مسلمان رہنما ہندو مسلم اتحاد کے مستقبل سے پوری طرح مایوس نہیں ہوئے تھے' لیکن دوسری طرف غیر منظم انداز میں علیحدگی کا تصوّر بھی ابھرنا شروع ہو گیا تھا۔ یہ اس صدی کا تیسرا عشرہ تھا۔ اس دور میں سر شاھنواز بھٹولاڑکانہ میں مقامی سیاست سے نکل کر صوبائی سطح پر سندھ کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے سوچنے لگے تھے۔ ان دنوں سندھ بمبئی کا ایک حصہ تھا اور اس صوبے پر بمبئی کے سرمایہ داروں نے مقامی جاگیرداروں کے تعاون سے اپنی گرفت مضبوط کر رکھی تھی اور اس گٹھ جوڑ کے استحصال کا سب سے بڑا شکار سندھ کے مسلمان تھے۔ بمبئی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر اور سندھی ممبروں کے سربراہ کی حیثیت میں ہی سر شاھنواز نے محسوس کر لیا تھا کہ بمبئی کے ساتھ رہ کر سندھ کے مسلمان شاید کبھی بھی ان ترقی یافتہ طبقات کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ اس عشرے کا اختتام علامہ اقبالؒ کے خطبہ الہ آباد کے ساتھ ہوا جس میں انہوں نے مسلمانوں کی ان منتشر اور غیر واضح سوچوں کو ایک ٹھوس شکل دے دی تھی۔ کانگریس کی طرف سے شروع ہونے والی تحریک میں مسلمانوں نے اجتماعی طور پر شرکت سے انکار کر دیا تھا حتیٰ کہ علی برادران نے بھی خاموشی اختیار کر لی تھی گویا اب علیحدگی کے نہ صرف خدوخال واضح ہونے لگے بلکہ عملی سیاست میں بھی اس کا اظہار شروع ہو چکا تھا۔

www.bhutto.org

سر شاھنواز بھٹو اس صدی کے تیسرے عشرے کے درمیان ہی سندھ کو علیحدہ صوبہ قرار دلوانے کا واضح پروگرام بنا چکے تھے۔ چنانچہ آخر کار وہ سندھ مسلم ایسوسی ایشن کی تشکیل میں کامیاب ہوگئے جس کا پہلا مطالبہ سندھ کو علیحدہ صوبہ قرار دینے کا تھا اور اسی سال یہ مطالبہ قائداعظمؒ کے چودہ مطالبات کا حصہ بن گیا۔ قائداعظمؒ دسمبر 1928ء میں کلکتہ کے نیشنل کنونشن میں ہندو لیڈروں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے مایوس ہو چکے تھے۔ 1929ء میں انہوں نے مسلمانوں کی تمام جماعتوں کا مشترکہ کنونشن بلایا اور اس میں چودہ نکات پر مشتمل جو مطالبات پیش کئے ان میں سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کا مطالبہ بھی شامل تھا۔ یوں سر شاھنواز بھٹو نے سندھ کے مسلمانوں کی نجات کے لئے جو خواب دیکھا تھا وہ برّصغیر کے تمام مسلمانوں کا مشترکہ مطالبہ بن گیا۔

سر شاھنواز خان بھٹو شروع ہی سے سندھی مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہیں انگریزوں کی طاقتور آھنی حکومت کی مخالفت بھی مول لینا پڑی تو انہوں نے اس سے بھی گریز نہیں کیا۔ اس سلسلے میں دو مثالیں کافی ہوں گی۔ 1918ء کے اواخر میں حیدر آباد ہوم سٹیڈ ہال میں مسلم ایجوکیشن کانفرنس کا اجلاس تھا جس کے مہمان خصوصی گورنر بمبئی سر لزلے ولسن تھے۔ سیکرٹری مسٹر نور محمد سجاول نے خطبہ استقبالیہ کے دوران مسلمانان سندھ کی طرف سے یہ شکایت پیش کی کہ سندھ تالپوروں کے زمانے میں مسلم صوبہ تھا اور صوبے کے تمام اعلیٰ عہدوں پر مسلمان فائز تھے لیکن انگریزی عہد میں مسلمانوں کے خلاف متعصبانہ رویّہ اختیار کیا گیا ہے اور جان بوجھ کر اعلیٰ انتظامی عہدوں پر ہندو اور دوسرے غیر مسلموں کو فائز کیا جارہا ہے۔ صوبے میں مسلمانوں کی آبادی 72 فی صد ہے لہٰذا سرکاری ملازمتوں میں انہیں آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے۔ اس کے جواب میں سر ولسن نے کہا کہ اس خطے میں تالپوروں کے زمانے میں سرکاری ملازموں کی اکثریت کو مسلمان قرار دینا غلط بیانی ہے' درحقیقت تالپوروں کے دور میں بھی ہندو یہاں "عامل" کے نام سے جانے جاتے تھے۔ گورنر کے اس جواب نے اجلاس میں موجود تمام مسلمان شرکاء کو مایوس کیا لیکن کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ انگریز حاکم کے سامنے احتجاج کر سکتا یا اس کی صریح غلط بیانی کا نوٹس لیتا۔

سر شاھنواز خان بھٹو کی ذمہ داری گورنر کی آمد پر ان کا شکریہ ادا کرنا تھی۔ جب وہ تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو سب کا خیال یہی تھا کہ وہ اپنا رسمی فرض ادا کر کے بیٹھ جائیں گے۔ انہوں نے اپنا رسمی فرض پورا بھی کیا لیکن اچانک دوران تقریر انہوں نے گورنر کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"جناب محترم! آپ نے مسلمانوں کی شکایت اور مطالبے کے جواب میں جو دلائل دیئے ہیں وہ غلط ہیں میں ان سے اتفاق نہیں کر سکتا"

www.bhutto.org

یہ الفاظ سنتے ہی تمام حاضرین پر سکتہ طاری ہو گیا اور خود گورنر لے ولسن جو ہمیشہ مسکرانے والے گورنر کے نام سے یاد کئے جاتے تھے' ان کے چہرے سے مسکراہٹ ایکدم غائب ہو گئی۔ سر شاھنواز کہہ رہے تھے:

"آپ کے جواب نے ہمیں سخت مایوس کیا ہے۔ آپ اپنی بات ثابت کرنے کے لئے معقول دلائل و شواہد پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں اور اسی وجہ سے آپ ہمارے مطالبے کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے۔ آپ نے عامل کے لفظ کو انتظامیہ کا متبادل قرار دیا ہے' لیکن درحقیقت یہ بھائی بند دُکاندار اور چھوٹے تاجر ہوا کرتے تھے اور یہاں ان کے لئے یہ لفظ استعمال کیا جاتا تھا' تالپوروں کے عہد میں اگر کوئی ہندو سرکاری ملازم ہوتا تو اسے "منشی" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا' دیوان تو کوئی ہندو تھا ہی نہیں۔"

آج آپ کو یہ الفاظ ممکن ہے زیادہ سخت نظر نہ آئیں لیکن اس دور میں جبکہ برطانوی اقتدار کا ستارہ عروج پر تھا اور کوئی ہندوستانی باشندہ انگریز حاکموں کے سامنے سر اٹھا کر بات نہ کر سکتا تھا سر شاھنواز بھٹو کی یہ جرأتمندانہ تقریر اس امر کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے وہ کسی قسم کی مصلحت کا شکار نہیں ہوتے تھے۔

کسی سیاستدان کے کردار کو پرکھنے کے لئے اس کے ہم عصر سیاستدانوں کی رائے بھی کافی اہمیت کی حامل ہوا کرتی ہے۔ سیّد میراں محمد شاہ سر شاھنواز کے ہم عصر سیاستدان تھے اور سندھ کے صوبائی انتخابات کے دوران ان کے مخالف گروپ میں شامل تھے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں جو 19 نومبر 1961ء کے "ڈان" میں شائع ہوا' اس سے بھی سر شاھنواز کی اس بےباکی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس کا مظاہرہ وہ انگریز حکمرانوں کے سامنے کیا کرتے تھے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"جس زمانے کا ذکر میں کر رہا ہوں ان دنوں جیکب آباد میں گھوڑوں اور مویشیوں کی ایک نمائش منعقد ہوا کرتی تھی' جس کا انتظام عموماً سرکاری افسروں کے سپرد ہوا کرتا تھا اور وہی مسلمانوں کے لئے بھی حسبِ مراتب نشستوں کی ترتیب کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ جس نمائش کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کا بندوبست ایک انگریز ڈی آئی جی پولیس مسٹر اومانی کے سپرد تھا۔ نمائش کے افتتاح کے روز جب میں سر شاھنواز بھٹو کے ساتھ پنڈال میں پہنچا تو انہوں نے دیکھا کہ بمبئی کی قانون ساز کونسل کے ممبروں کی نشستیں سرکاری عہدے داروں کے بعد رکھی گئی تھیں۔ سر شاھنواز نے اسے عوامی نمائندوں کی توہین قرار دیا اور بطور احتجاج اپنے رفقاء کے ساتھ تقریب سے

www.bhutto.org

واک آؤٹ کر گئے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے گورنر بمبئی کو ایک سخت قسم کا احتجاجی مراسلہ روانہ کیا اور ان افسروں کے خلاف تادیبی کارروائی کا مطالبہ کیا جنھوں نے عوامی نمائندوں کی توہین کی۔ سندھ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی عوامی نمائندے نے حکومت برطانیہ کے عہدیداروں کے خلاف ایسا شدید احتجاج کیا تھا۔ اس احتجاج کا نتیجہ یہ ہوا کہ متعلقہ انگریز ڈی آئی جی کو نہ صرف سر شاھنواز بھٹو سے معافی مانگنا پڑی بلکہ وہاں سے اس کا تبادلہ بھی کر دیا گیا"۔

ان کے ایک دوسرے ہم عصر اور قائداعظم کے ساتھی حاجی عبداللہ ہارون نے مورخہ 27 جنوری 1930ء کو لکھے گئے ایک خط میں سندھ کے مسلمانوں کے لئے سر شاھنواز بھٹو کی عظیم خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانوں کے لئے آپ نے جو عظیم اور ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں ان کا مقابلہ کسی بھی اور قوم کے کسی ایک لیڈر کی خدمات سے نہیں کیا سکتا۔ آپ کی خدمات بے مثال ہیں۔ ہندوستان کے کسی ایک رہنما نے اپنی قوم کی اتنی بھرپور خدمات نہیں دیں جتنی آپ نے مسلمانوں کی انجام دی ہیں"۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایک ہم عصر سیاسی لیڈر کا دوسرے لیڈر کے لئے یہ اتنا بڑا خراج تحسین ہے جو بے لوث اور بھرپور خدمات انجام دیئے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سر شاھنواز اگر انگریز حکمرانوں میں قابل توجہ سمجھے جاتے تھے تو اس کا سبب ان کی خوشامد یا کاسہ لیسی نہیں تھا جیسا کہ دوسرے بعض مسلمان رہنماؤں کا وطیرہ تھا' بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سندھ کے مسلمانوں کے محبوب رہنما تھے اور انگریز انہیں نظرانداز کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ وہ اپنی جو بات بھی حکمرانوں سے منواتے اپنی عوامی تائید و حمایت کے بل پر منواتے۔ ورنہ انگریزوں کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ اس کا تھوڑا سا اندازہ آپ کمشنر کراچی کے اس خط سے کر سکتے ہیں جو ڈپٹی گورنر کے اختیارات رکھتا تھا۔ یہ خط اس نے مئی 1927ء کو کراچی سے سر شاھنواز بھٹو کے نام تحریر کیا۔ اس خط کا متن یہ ہے:

"آپ کے 19 مئی کے خط کا بہت بہت شکریہ! مجھے خوشی ہے کہ مسلم کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ ابھی تک نہیں ہوا' مجھے امید ہے کہ اس تقریب کے لئے لاڑکانہ کے سوا کوئی دوسرا مقام منتخب کیا جائے گا۔ اگر کانفرنسوں کے دوران وہاں کوئی گڑبڑ ہوئی تو پبلک ممکنہ طور پر اور حکومت لازمی طور پر اس کا ذمہ دار محمڈن ایسوسی ایشن کو

www.bhutto.org

ٹھہرائے گی۔ آپ کسی ایسے مقام کا انتخاب کریں جہاں فرقہ وارانہ کشیدگی کا امکان نہ ہو۔"

اس خط میں کمشنر نے جو دھمکی آمیز لہجہ اختیار کیا ہے وہ اس امر کا شاہد ہے کہ سر شاھنواز بھٹو برطانوی حکومت کے ان وفاداروں میں شامل نہ تھے جن پر حکمران بھروسہ کر سکیں بلکہ انہوں نے جو مقام و مرتبہ بھی حاصل کیا ہے وہ اپنے صوبے کے مسلمان عوام کی تائید و حمایت کے ذریعے حاصل کیا۔ انگریز چالاک حکمرانوں کی طرح ایسے رہنماؤں سے حتی الامکان بہتر تعلقات رکھنے کی کوشش کرتے تھے' جنھیں عوام کی بھرپور حمایت حاصل ہو' ورنہ مولانا محمد علی جوہر ایسا سامراج دشمن اور برطانوی حکومت کا مخالف کبھی اس تمنا کا اظہار نہ کرتا کہ:

"میری خواہش ہے کہ جب میں زندگی کا آخری سانس لوں تو شاھنواز بھٹو میرے قریب موجود ہوں۔"

مولانا جوہر ایسا بطل حریت کسی فرد کے دم مرگ اپنے قریب ہونے کی تمنا نہیں کر سکتے تھے جسے انگریز پسند کرتے ہوں یا جس نے کسی بھی لمحے ان سامراج حکمرانوں کا ساتھ دیا ہو۔

اور سر شاھنواز بھٹو ان لوگوں میں سے تھے جن کو ہندو انگریز کی مشترکہ سازشوں کا شکار گھوارے ہی میں ہونا پڑ گیا تھا۔ ان کے والد محترم غلام مرتضٰی خاں بھٹو جو اپنے علاقے کے بڑے طرح دار' رکھ رکھاؤ والے' کلے ٹھلے کے زمیندار تھے' انہیں ایک انگریز افسر اور علاقے کے ہندوؤں کی مشترکہ سازش کا شکار ہو کر نہ صرف کئی برس تک پنجاب میں غریب الوطنی کی زندگی گزارنا پڑی بلکہ ان کی تمام جائیداد بحق سرکار ضبط کر لی گئی۔ واقعہ یوں ہوا کہ علاقے کا کلکٹر کرنل ایلفرڈ مے فیو ایک نوجوان انگریز ہوا کرتا تھا جو برطانوی عہد کے ابتدائی انگریز حکمرانوں کی طرح بے پناہ سخت گیر اور ظالم تھا۔ جناب مرتضٰی خاں بھٹو کے ساتھ اس کے قریبی تعلقات تھے اور وہ انہیں "چاچا" کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ جناب مرتضٰی خاں بھٹو بھی اس کے ساتھ شفقت سے پیش آتے۔ علاقے کے ہندوؤں کو ایک مسلمان نواب کا یہ اثر و رسوخ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ یوں بھی جناب غلام مرتضٰی خاں بھٹو جس ٹھاٹ باٹھ اور کرّ و فر کے ساتھ زندگی گزارتے تھے اس کی وجہ سے ان کے بہت سے حاسد پیدا ہو گئے تھے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے روائتی طمطراق کے ساتھ طلائی کام سے مزین پگڑی باندھے سہون شریف کے عرس میں شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے کہ ان کے گاؤں گڑھی بھٹو میں ایک ہندو جے رام داس کا قتل ہو گیا۔ اس واقعے کی آڑ لے کر حاسدوں اور ہندوؤں نے ایک سازش کے ذریعے قتل کا الزام جناب غلام مرتضٰی خاں بھٹو پر عائد کر دیا اور کرنل ایلفرڈ مے فیو کو بھی غلط اطلاعات پہنچا کر اپنا ہم نوا بنا لیا۔

www.bhutto.org

جناب غلام مرتضیٰ خاں بھٹو جو اپنے خاندانی اور ذاتی وقار کے بارے میں از حد حساس تھے اور اپنے دور کے ایک جری در عنا جوان تھے' ایسے گھٹیا الزام سے سخت پریشان ہوئے۔ کرنل ایلفرڈ نے ان کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے اور یہی نہیں بلکہ اپنے علاقے کے وکلاء کو بھی وارننگ دی کہ جس کسی نے غلام مرتضیٰ خاں بھٹو کی پیروی کرنے کی کوشش کی وہ اس کے نتائج بھگتنے کے لئے بھی تیار رہے۔ جناب غلام مرتضیٰ خاں نے انگریز حاکم کے اس چیلنج کو قبول کیا اور اپنے ایک دوست کے ذریعے لاہور ہائی کورٹ کے سینئر بیرسٹر سر ولیئم ہنری ریٹیگن کو ایک ہزار روپیہ یومیہ پر اپنا وکیل مقرر کیا۔ یہ فیس بعد میں بارہ سو روپے روز ہو گئی۔ اس زمانے میں یہ کسی بھی وکیل کے لئے سب سے زیادہ فیس تھی۔ اس فیس کی گرانقدری کا اندازہ آپ یوں کر سکتے ہیں کہ اس دور کا ایک سو روپیہ آج کے دس ہزار روپے کے برابر قدر و قیمت رکھتا تھا۔ سر ولیئم نے شکارپور آکر جناب غلام مرتضیٰ خاں بھٹو کے مقدمے کی پیروی کی۔ یہ مقدمہ سیشن کورٹ میں بیس روز تک جاری رہا۔ چونکہ یہ مقدمہ محض ایک سازش کے تحت قائم کیا گیا تھا لہٰذا الزام ثابت نہ کیا جا سکا اور غلام مرتضیٰ خاں بھٹو باعزت بری کر دیئے گئے۔ اس کے علاوہ ان پر ایک مقدمہ ایک سرکاری افسر کے فرائض کی بجا آوری میں مداخلت کے جرم میں بھی قائم کیا گیا لیکن جناب بھٹو اس میں بھی باعزت بری ہو گئے۔ لیکن مقدمات کا یہ سلسلہ تو ہندوؤں اور انگریز حاکموں کی سازش کی وجہ سے شروع ہوا تھا لہٰذا ان میں کسی ثبوت یا شہادت کی کیا ضرورت تھی؟ ظاہر ہے کرنل ایلفرڈ اور اس کے سازشی ساتھی جناب غلام مرتضیٰ خان کی اس باعزت بریت پر خوش نہ تھے' ان کی تو کوشش یہ تھی کہ اس باوقار مسلمان شخصیت کو بے آبرو کیا جائے۔

لہٰذا کرنل ایلفرڈ نے بغیر کسی بنیاد کے دفعہ ایک سو دس کے تحت ان کے تازہ وارنٹ جاری کر دیئے۔ جناب غلام مرتضیٰ خاں بھی ایک افسر کے ہاتھوں بے عزت ہونے یا شکست تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے' انہوں نے جب دیکھا کہ کلکٹر تمام قانونی و اخلاقی آداب کو پس پشت ڈال کر انہیں بے عزت کرنے پر تُلا ہوا ہے تو انہوں نے بھی گرفتار نہ ہونے کا عہد کیا اور روپوش ہو گئے۔ کرنل ایلفرڈ بھی موقع کی تاک میں تھا۔ اس نے روپوشی کا فائدہ اٹھا کر بھٹو خاندان کی تمام املاک کو بحق سرکار ضبط کر لیا۔ جناب غلام مرتضیٰ خاں بھٹو نے اپنے دونوں لڑکوں شاھنواز بھٹو اور علی گوہر بھٹو کو اپنے ایک قریبی دوست وکیل غلام محمد کے حوالے کیا اور خود پنجاب چلے آئے اور دل میں عہد کر لیا کہ خواہ کچھ ہو جائے وہ اس انگریز کلکٹر کے سامنے سر نہیں جھکائیں گے۔ وہ اپنے اس عہد پر پورے اترے اور جب تک وہ انگریز ریٹائر ہو کر واپس برطانیہ نہیں چلا گیا وہ اس کے ہاتھ نہیں لگے۔ اس دوران انہوں نے بے پناہ تکالیف سے روپوشی کی زندگی گزاری' چونکہ ایلفرڈ بھی ہر قیمت پر انہیں نشانہ انتقام بنا کر اپنی انا کو تسکین دینا چاہتا تھا اس لئے اس کے جاسوس پورے ہندوستان میں جناب غلام مرتضیٰ بھٹو کی تلاش میں پھیل گئے۔ ان جاسوسوں سے بچنے

www.bhutto.org

کے لئے جناب غلام مرتضٰی خاں بھٹو نے ایسا بھیس بدلا کہ وہ سارے وسائل کے باوجود ان کا سراغ نہ لگا سکے۔

جب ایلفرڈ واپس چلا گیا تو جناب غلام مرتضٰی خاں بھٹو نے فیصلہ کیا کہ اب کراچی جا کر قانونی ذرائع سے ان جھوٹے مقدمات کا مقابلہ کریں گے کیونکہ اب کرنل ایلفرڈ کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے دھاندلی کے امکانات ختم ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے چلے جانے کے باوجود اس کے جاری کردہ وارنٹ علاقہ پولیس کے پاس موجود تھے اور ان کے دشمن اب بھی یہ کوشش کر رہے تھے کہ انہیں ان وارنٹوں کی بنیاد پر گرفتار کرا کے ان کی توہین کی جائے۔ لیکن جناب غلام مرتضٰی خاں بھٹو مخالفین کو یہاں بھی شکست دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھیس بدل کر کراچی کا سفر اختیار کیا۔ ادھر پولیس نے ان کے گاؤں اور کراچی کو جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی تھی اور بڑی احتیاط کے ساتھ تمام مسافروں کی چیکنگ کی جاتی تھی۔ غلام مرتضٰی خاں کو بھی اس کارروائی کا علم تھا چنانچہ انہوں نے دریائے سندھ سے پہلے ہی اتر کر پیدل کنارے کنارے سفر کیا اور کافی دور سے جہاں پولیس کا خیال تک نہ تھا کشتی کے ذریعے دریا پار کر لیا۔

اسی دوران انہوں نے سہون شریف سے اپنے دوست وکیل غلام محمد کو ساتھ لیا اور ان دونوں نے کراچی کی ٹرین پکڑلی، لیکن دریا پار کر کے بھی ان کی مشکلات ختم نہ ہوئیں۔ ان دنوں سندھ کے اندرونی علاقوں میں پلیگ کا مرض پھیلا ہوا تھا اور کراچی میں داخل ہونے والی تمام ٹرینوں کے مسافروں کو ملیر پر روک کے کیمپوں میں رکھا جاتا اور ان کا معائنہ کر کے قرنطینہ میں ڈال دیا جاتا۔ چنانچہ انہیں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ ملیر کے عارضی کیمپ میں روک لیا گیا۔ جناب غلام مرتضٰی خاں کو اس پر تو کوئی گھبراہٹ نہ تھی، لیکن خدشہ یہ تھا کہ کہیں علاقہ پولیس کو ان کی خبر نہ ہو جائے۔ ہر چند وہ "دیال سنگھ" کے بھیس میں تھے، لیکن ان کا راجپوت مسلمانوں والا جاہ و جلال اور شخصیت کا بارعب انداز پگڑی، کنگھا، کچھ، کڑا اور کرپان کے ہوتے ہوئے بھی نہیں چھپ رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے کیمپ سے جلد نکلنے کا ایک منصوبہ بنایا۔

اگلی صبح انہوں نے کیمپ کمانڈر نیبلاک سے ملاقات کا وقت مانگا اور اسے کہانی سنائی کہ میں پنجاب کا رہنے والا ہوں، مجھے سندھ میں پلیگ پھیلنے اور کراچی میں اس سے متعلق قانونی پابندیوں کا کوئی علم نہیں، میں کراچی میں قیام کرنے کا بھی ارادہ نہیں رکھتا۔ اصل بات یہ ہے کہ میری لڑکی کی شادی ہے اور برات گاؤں میں آچکی ہے۔ میں نے اس شادی کے لئے زیورات بننے کے لئے کراچی کے ایک سنار کو دے رکھے ہیں، میں صرف زیورات لے کر پہلی ٹرین سے واپس پنجاب چلا جاؤں گا۔ اگر آپ چند گھنٹوں کے لئے مجھے کراچی جانے کی اجازت دے دیں تو ممنون ہوں گا۔ کیپٹن نیبلاک کو اس کہانی پر ذرا بھی شبہ نہ ہوا اور جناب غلام مرتضٰی خاں کا اندازِ بیان بھی ایسا تھا کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے انہیں

www.bhutto.org

کراچی جانے کی اجازت دے دی۔ اس طرح انہوں نے کراچی پہنچتے ہی اعلیٰ عدالت سے ضمانت قبل از گرفتاری منظور کرائی اور اس کے بعد انہوں نے قانونی چارہ جوئی کے ذریعے اپنی املاک بھی واگزار کرالیں۔

اس واقعے سے آپ کو جہاں بھٹو خاندان کے افراد کا اپنی عزت و وقار کے تحفظ کے لئے گہرے احساس کا اندازہ ہو گا ساتھ ہی یہ محسوس کرنے میں بھی کوئی دقّت نہ ہوگی کہ اس عہدِ تاریک میں بھی اس خاندان کے ایک بزرگ نے انگریز افسر کی حاکمیت کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس خاندان کو ابتدا ہی سے ہندوؤں اور انگریزوں کی مشترکہ سازشوں کا شکار ہو کر مصائب و تکالیف کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ظاہر ہے سر شاھنواز بھٹو بھی جو اس سازش کی وجہ سے خاندان پر پڑنے والی مصیبتوں کا براہ راست بچپن ہی میں نشانہ بن گئے تھے' اس کے اثرات لئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے' اور اس خاندانی تجربے کے اثرات جناب ذوالفقار علی بھٹو کی ذات سے بھی الگ نہیں کئے جا سکتے۔ کیونکہ اپنے خاندان کا پس منظر جو بزرگوں کی پرانی باتوں کے دوران بچے پر ظاہر ہوتا ہے اپنے اثرات چھوڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وہ تجربات تھے جو باشعور سر شاھنواز بھٹو کی اگلی جدوجہد کے لئے خام مواد کا درجہ رکھتے تھے اور انہوں نے گول میز کانفرنس میں سندھ کے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے ان سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔

1931ء کی گول میز کانفرنس میں سندھ کے مسلمانوں کا جو چار رکنی وفد منتخب کیا گیا' سر شاھنواز بھٹو اس کے قائد تھے۔ ہر چند ان کا مرکزی مشن یہی تھا کہ وہ سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کا مطالبہ دلائل و براہین کی روشنی میں پوری شدت کے ساتھ اٹھائیں' لیکن ان کی خدمات کے پیش نظر گول میز کانفرنس میں پیش ہونے والے اہم مسائل پر سوچ بچار کرنے والی چار کمیٹیوں میں انہیں مسلمانانِ ہند کے نمائندہ کے طور پر شریک کیا گیا۔ دلیپ مکرجی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ گول میز کانفرنس کی سب کمیٹیوں کے اجلاس کے دوران قائداعظم نے سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کی تجویز کی مخالفت کی تھی۔ ہمارے ایک تاریخ دان نے اس کی تردید کرتے ہوئے قائداعظم کے اس اقتباس ہی کو بنیاد بنا کر کمزور وکالت کرنے کی کوشش کی ہے جس کا حوالہ دلیپ مکرجی نے دیا تھا۔ حالانکہ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ جو قائداعظم 1929ء میں اپنے چودہ مطالبات میں سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کا مطالبہ کرتے ہیں اور پھر مسلمانان سندھ کے وفد کے رہنما کے طور پر اس مطالبے کے سب سے بڑے علمبردار کو نمائندہ تسلیم کرتے ہیں' وہ بعد میں لندن جا کر اس تجویز کی مخالفت کیسے کر سکتے ہیں؟ امر واقعہ یہ ہے کہ سر شاھنواز اس گول میز کانفرنس میں دوسرے مسلمان رہنماؤں کی طرح قائداعظم کے ایک قابلِ اعتماد رفیقِ کار کی حیثیت میں شریک تھے۔ اس دوران بارہا ان کی قائداعظم کے ساتھ کئی خصوصی نشستیں ہوئیں جن میں سر شاھنواز نے نہ صرف سندھ بلکہ پورے برّصغیر کے مسائل پر اپنے رہنما کے ساتھ تبادلہ خیال کیا اور ان کے زرّیں

www.bhutto.org

خیالات سے مستفید ہوئے۔

سر شاھنواز بھٹو کو اپنے اس مطالبے میں مسلمانان ہند کی تائید تو 1929ء ہی میں حاصل ہو چکی تھی، لندن میں قائداعظم کے ساتھ متعدد ملاقاتوں کے بعد ان کے عزائم مزید بلند ہو گئے۔ جب کانفرنس کے دوران سندھ کے مسئلے کو ٹالنے کی کوشش کی گئی تو سر شاھنواز نے لنچ کے دوران وزیر اعظم میکڈانلڈ کا ہاتھ اپنی گرفت میں لے کر تمام حاضرین اور مندوبین کی موجودگی میں سندھ کے مسئلے کو نظر انداز کرنے پر احتجاج کیا اور وزیر اعظم برطانیہ کو وعدہ کرنا پڑا کہ شام کے اجلاس میں وہ اس مسئلے پر اظہارِ خیال کر سکیں گے۔ شام کے اجلاس میں سر شاھنواز بھٹو نے پورے جذبے اور دلائل کے ساتھ سندھ کے مسلمانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے علیحدہ صوبہ بنانے کے حق میں بھرپور دلائل دیئے اور مندوبین کو اپنے نقطۂ نظر کا قائل کر لیا اور کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ سندھ کی علیحدگی کا جائزہ لینے کے لئے ایک سب کمیٹی تشکیل دی جائے جس کے سربراہ لارڈ رسل ہوں۔

ادھر سر شاھنواز بھٹو یہ کمیٹی بنوانے میں کامیاب ہوئے اور ادھر سندھ کے ہندو سرمایہ داروں اور بمبئی کے اجارہ داروں نے ان کی ذات پر الزام تراشیوں کا سلسلہ شروع کر کے ان کے منصوبے کو سبوتاژ کرنے کے لئے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ طرح طرح کے مسائل اٹھائے گئے۔ روائتی انداز میں سندھ کی مالی کم مائیگی کا رونا رویا گیا۔ انتظامی مشکلات کا ہوّا کھڑا کیا گیا۔ مگر سر شاھنواز بھٹو پوری استقامت سے سب کمیٹی کے سامنے ان تمام اعتراضات کا جواب دیتے رہے۔ انہوں نے ہر عملی اور مالیاتی اعتراض کا ٹھوس جواب فراہم کیا۔ اس جدوجہد میں انہیں قائداعظم کی مکمل تائید اور رہنمائی حاصل تھی۔ تمام مخالفتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آخر کار چوبیس دسمبر 1932ء کو وہ یہ اعلان کروانے میں کامیاب ہو گئے کہ آئندہ جو بھی کل ہند وفاق تجویز ہو گا اس میں سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ کی حیثیت دے دی جائے گی۔ مگر وہ اس پر بھی مطمئن نہ ہوئے اور برطانوی حکومت پر دباؤ جاری رکھا۔

اس سے قبل سندھ کے نمائندوں کو بمبئی میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی۔ سر شاھنواز نے یہ مسئلہ اٹھایا تو بمبئی کے اجارہ داروں کو بھی اپنی فکر پڑ گئی۔ اس زمانے کی عام روایت کے مطابق ان کا خیال تھا کہ سر شاھنواز بھی شاید اپنی ذاتی نمود و نمائش اور حصول اقتدار کے لئے یہ شوشہ کھڑا کر رہے ہیں۔ اس دوران انہیں بمبئی پریذیڈنسی کی انتظامیہ میں لوکل سیلف گورنمنٹ کا وزیر بنا دیا گیا، مگر انہوں نے اپنی اس سرکاری حیثیت کو بھی اپنے مشن کی تکمیل کا ایک ذریعہ بنا لیا اور ہر طرف سے اتنی تائید حاصل کر لی کہ 1936ء کی گول میز کانفرنس میں انگریز نے سندھ کو عملی طور پر علیحدہ صوبہ بنانے کا مسئلہ باقاعدہ ایجنڈے میں شامل کر لیا اور کانفرنس کے اختتام پر سر شاھنواز بھٹو ایک فاتح کی حیثیت میں وطن واپس آئے۔ سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کی تجویز عملاً تسلیم کر لی گئی تھی۔

www.bhutto.org

یہ مسلمانانِ برّصغیر پر سر شاھنواز بھٹو اور ان کے قابلِ احترام رفقاء کا عظیم احسان تھا کہ سندھ کی علیحدگی قیامِ پاکستان سے بہت قبل ہو گئی۔ اگر خدانخواستہ قیامِ پاکستان تک سندھ بھی بمبئی کے ساتھ ہی شامل رہتا تو تقسیم کے وقت جس طرح پنجاب اور بنگال میں مختلف حیلے بہانوں سے ناروا حد بندیاں کر کے مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی روا رکھی گئی سندھ میں صورتِ حال اس سے بدتر ہوتی۔ کیونکہ بمبئی کے باقی علاقے میں ہندوؤں کی بھاری اکثریت کے مقابلے میں مسلمانوں کو سارے صوبے میں اقلیت سمجھا جاتا اور اس صوبے کی تقسیم کا سوال بھی متنازع ہو جاتا اور اگر سندھ پاکستان میں شامل بھی کیا جاتا تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کی سرحدوں میں کہاں کہاں کیا کیا بارود بھرا جاتا اور وہ کتنے انسانوں کا خون لیتا اور مستقبل کے لئے کیا کیا مسائل پیدا کرتا؟ سر شاھنواز بھٹو کی جدوجہد نے بعد میں بننے والے پاکستان کو کم از کم سندھ کی حد تک انگریز اور ہندو کی سازشوں سے محفوظ کر لیا تھا۔ تنہا ان کا یہی کارنامہ برّصغیر کی تاریخ میں انہیں امر بنانے کے لئے کافی ہے۔

میروں کے میدانِ جنگ میں ہارے ہوئے سندھ کو کانفرنس کی میز پر واپس لینے والے سر شاھنواز کو اس نئے صوبے کا مشیرِ اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ انہوں نے اس حیثیت میں انگریزوں کے سب سے بڑے دشمن موجودہ پیر پگاڑو کے والدِ گرامی کو جو قید میں تھے' رہائی دے کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ مستقبل کی فیصلہ کن جنگ کے لئے سندھ کے مسلمانوں کی قوت کو مضبوط کرنے کے ایک باقاعدہ منصوبے پر عمل کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سندھ کے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے بھی ہر ممکن اقدام کرتے رہے۔ شاید یہ بات بھٹو خاندان کے مقدر ہی میں لکھی ہے کہ اس کے افرادِ ملک و ملت کے لئے خواہ جتنی بھی بے لوث قربانیاں دیں' مگر آخر کار انہیں غیروں کے ساتھ ساتھ خود اپنوں کے تیرِ ستم کا نشانہ بھی بننا پڑتا ہے۔ غیر تو ظاہر ہے ان سے خوش نہ تھے' وہ بمبئی کے سرمایہ دار بھیڑیوں کے جبڑے سے سندھ کے غریب مسلمانوں کا لقمہ تر نکال لائے تھے' وہ انہیں کیسے معاف کرتے؟ ان لوگوں نے تو اسی وقت سر شاھنواز کو اپنا دشمن نمبر ایک قرار دے دیا تھا جب وزارت کا منصب حاصل کرنے کے بعد بھی وہ بجائے ان کا آلۂ کار بننے کے سندھ کے مسلمانوں کے وکیل ہی بنے رہے بلکہ وزارتی حیثیت کو بھی زیادہ مؤثر انداز میں اپنے مسلمان بھائیوں کے مشن کی تکمیل کے لئے استعمال کیا۔ سندھ کو صوبے کا درجہ مل جانے کے بعد وہ ساری استحصالی طاقتیں جن کے مفادات پر اس علیحدگی کی وجہ سے زبردست زد پڑی تھی' سر شاھنواز کے خلاف متحد ہو گئیں۔ صرف ایک شخص کے خلاف اتنی با اختیار قوتوں کی طرف سے اس قدر منظم پیمانے پر مہم چلانے کی مثال سر شاھنواز بھٹو کے بعد خود ان کے اپنے بیٹے ذوالفقار علی بھٹو کے سوا اور کہیں نہیں ملتی۔

سندھ اسمبلی کے لئے کل ساٹھ نشستیں رکھی گئی تھیں۔ جداگانہ طریقِ انتخاب کا مطالبہ مانا جا چکا تھا۔ 36 نشستیں مسلمانوں کی تھیں' بیس ہندوؤں کی' تین یورپی باشندوں کی اور ایک پارسیوں کی۔ سر

www.bhutto.org

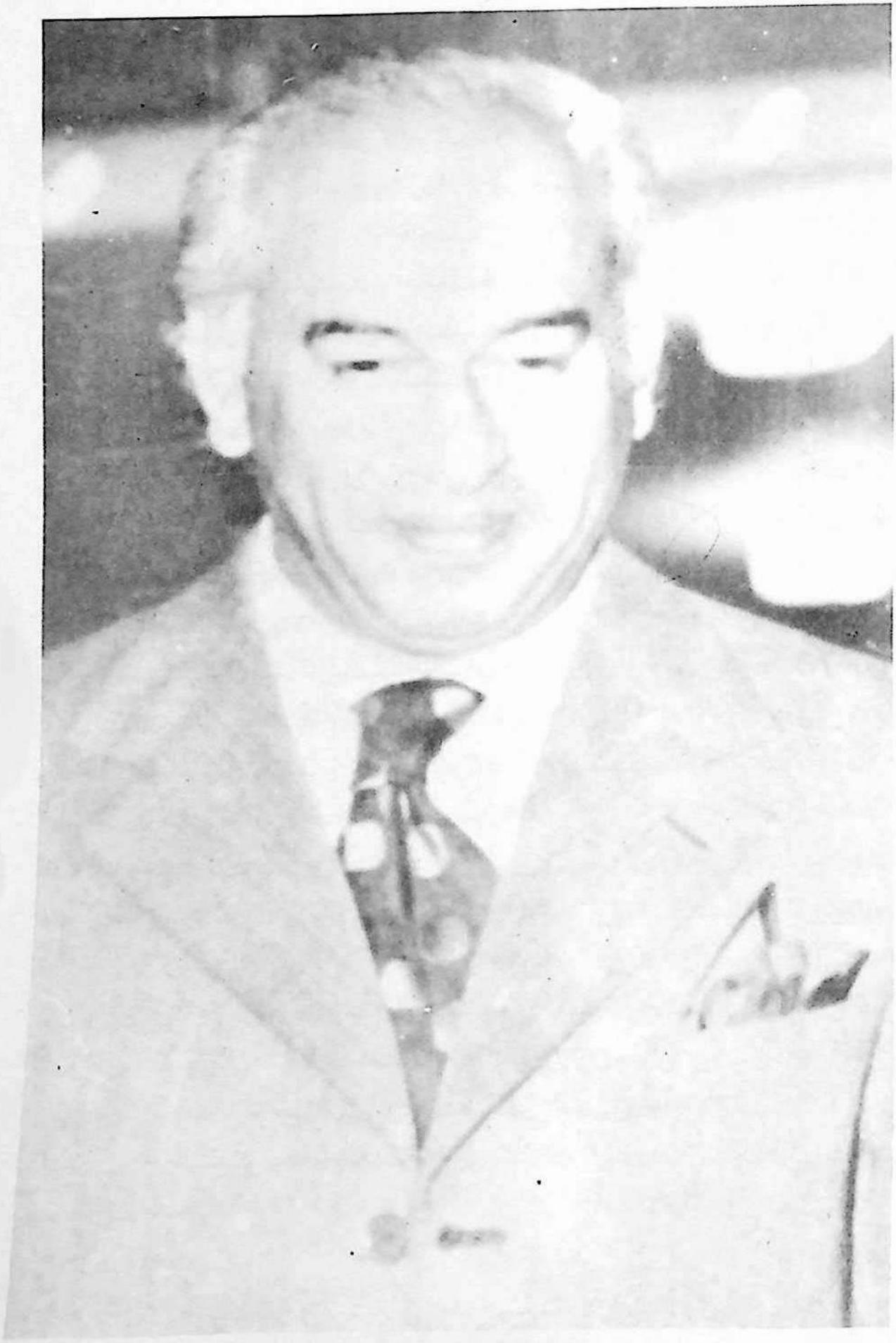

ذوالفقار علی بھٹو

www.bhutto.org

شاھنواز نے مسلمانوں کی طرف سے یونائیٹڈ پارٹی کے نام کے ساتھ انتخابات میں حصّہ لیا' وہ خود اس کے سربراہ تھے۔ دوسری بڑی پارٹی کانگریس تھی اور کچھ آزاد امیدوار۔ سر شاھنواز کی پارٹی نے انتخابات میں شاندار کامیابی حاصل کی۔ اس کے اٹھارہ امیدوار کامیاب ہوئے جبکہ کانگریس کو چودہ نشستیں حاصل ہوئیں۔ بہت سے آزاد امیدوار بھی سر شاھنواز کے حامی تھے۔ لیکن اکثریتی پارٹی کے سربراہ یعنی جناب شاھنواز بھٹو خود اپنی نشست نہ جیت سکے۔ وجہ صاف ظاہر ہے بس اس میں اتنا اضافہ کرنا مناسب ہو گا کہ آج تک دنیا بھر کے کسی عام انتخابات میں جہاں حلقے کے ہر بالغ کو رائے دینے کا حق حاصل ہو' فی ووٹ اتنا معاوضہ نہیں ملا ہو گا جتنا سر شاھنواز بھٹو کے حلقے کے ووٹروں کو دیا گیا۔ یہ تو ان کے بیٹے کے ساتھ بھی ہوا تھا' لیکن باپ کے زمانے میں عام ووٹر سیاسی طور پر اتنے باشعور نہ تھے' جتنے 1970ء کے ووٹر۔ میرا خیال ہے وہ چھوٹا سا لڑکا جو بارہ سال کی عمر میں عام لوگوں کی تکلیف دیکھ کر ٹرانسپورٹ کو قومی ملکیت میں لینے کا فیصلہ کر سکتا ہے' اس لڑکے نے سرمائے اور سازش کے مقابلے میں اپنے مخلص اور بے لوث باپ کو انتخاب ہارتے دیکھ کر بھی یقیناً کوئی فیصلہ کیا ہو گا۔

وہ فیصلہ خواہ کچھ بھی ہو بہر حال سرمائے اور سازش کے یقیناً خلاف ہو گا۔ کاش سر شاھنواز اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ ان کے عظیم فرزند نے سرمائے اور سازش کو چاروں شانے چت گرا کر 70ء میں ظلم کی ان قوتوں سے کیسا شاندار انتقام لیا؟ گو اس وقت مطالبہ پاکستان کی قرارداد منظور نہیں ہوئی تھی لیکن مسلمانان ہند قائداعظم کی قیادت میں ہندو قوتوں کے خلاف منظم ہونے لگے تھے۔ مسلم لیگ کو تقویت کی ضرورت تھی۔ ان حالات میں سندھ کی منتخب اسمبلی کے مسلمان ارکان متفقہ طور پر سر شاھنواز کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں پارلیمانی پارٹی کی قیادت پیش کی۔ یہی نہیں بلکہ تحریری طور پر یقین دہانی کرائی کہ وہ ہر قسم کے حالات میں ان کا ساتھ دیں گے۔ اس اقرارنامے پر دستخط کرنے والوں میں پیرزادہ عبدالستار' پیر الٰہی بخش' اللہ بخش سومرو' جی ایم سید' سید ہاشم گزدر اور سید میراں محمد شاہ بھی شامل تھے۔ انہیں یہ پیش کش بھی کی گئی کہ کوئی ایک ممبران کے لئے اپنی نشست خالی کرنے کو تیار ہے' جہاں سے انتخاب لڑ کے وہ اسمبلی میں آسکتے ہیں۔ بہت سے آزاد مسلمان ممبروں نے بھی اس تجویز کی تائید کی' لیکن سر شاھنواز جدوجہد کے اس نازک دور میں اپنی قیادت کی خاطر مسلمانوں کی توانائی ضائع کرنے کے حق میں نہ تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ معاملات اتنے سادہ نہیں جتنے بظاہر نظر آرہے ہیں۔ ایک طرف مخالفین ان کے خلاف کمربستہ تھے تو دوسری طرف اپنوں کی صفوں میں چھپے خطرناک عناصر بھی ان کی نگاہ میں تھے جو مزید مشکلات کا باعث بنتے۔

سر شاھنواز سیاست میں صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کرنے کے قائل تھے اور ملّی مفاد کو ہمیشہ مقدم جانتے۔ اس وقت پارلیمانی پارٹی کی قیادت قبول کرنا ان کے نزدیک مناسب فیصلہ نہ تھا۔ چنانچہ انہوں

www.bhutto.org

نے خود سر غلام حسین ہدایت اللہ کا نام اس منصب کے لئے تجویز کیا اور پھر پوری سرگرمی کے ساتھ ان کی مدد کی۔ یوں سندھ میں سر غلام حسین ہدایت اللہ کے زیر قیادت جو وزارت قائم ہوئی وہ مسلم لیگی وزارت تھی اور جن ممبران اسمبلی کی اکثریت نے سندھ کی پاکستان میں شمولیت کی قرارداد کو پاس کروایا وہ سر شاھنواز کی قیادت ہی میں منتخب ہوئے تھے۔ آج جو لوگ سر شاھنواز کے انتخاب میں کامیاب نہ ہونے کے واقعے کو سیاق و سباق سے الگ کر کے عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ نہ صرف تاریخ کو مسخ کرتے ہیں بلکہ مسلمانانِ سندھ کی جدوجہد آزادی کے قائد کی کردار شکنی کر کے' سندھ کے عوام کی بھی توہین کرتے ہیں۔

سندھ میں وزارت کی تشکیل کے بعد وہ بمبئی واپس آکر سندھ پبلک سروس کمیشن کے سربراہ ہوگئے اور اس حیثیت میں بھی کئی سال تک وہ مسلمان امیدواروں کو ملازمتیں دلوانے میں نمایاں کام انجام دیتے رہے۔ 1947ء میں ریاست جوناگڑھ کے نواب نے انہیں وزارت میں شمولیت کی دعوت دی جسے انہوں نے قبول کر لیا اور اپنی شخصیت و اہلیت کی بنا پر چند ہی ماہ بعد وزارت عظمیٰ کی طرف سے انہیں ہدایت ملی کہ وہ جوناگڑھ کی پاکستان میں شمولیت کا اعلان کرائیں۔ ان کے ایماء پر نواب صاحب جوناگڑھ نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔ وہ خود تو اعلان کر کے ریاست سے تشریف لے گئے لیکن سر شاھنواز نے ریاست کے عوام کے ساتھ وہیں رہنے کو ترجیح دی۔ نواب صاحب کی عدم موجودگی نے شرپسندوں کے حوصلے بڑھا دیئے اور مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہوگیا۔ سر شاھنواز کے لئے یہ بے حد تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ نواب صاحب کی موجودگی میں ممکن ہے وہ صورت حال کو سنبھال لیتے لیکن ریاست سے ان کے اس طرح جانے کی وجہ سے خود ان کی حیثیت متاثر ہوگئی تھی۔ ہندوؤں کے مظالم بڑھتے جارہے تھے۔ مگر سر شاھنواز کے پاس امن عامہ قائم کرنے کے لئے فوج تھی اور نہ پولیس۔ مسلمانوں کے مصائب بھی ان کے لئے ناقابل برداشت تھے۔

تمام ممکنہ اقدامات میں ناکام ہونے کے بعد انہوں نے ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ مونٹ بیٹن سے ٹیلیفون پر رابطہ قائم کیا مگر وہ بھی اپنی ہی حکومت کی طرف سے دی گئی سربراہان ریاست کی اس آزادی کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا جس کے تحت وہ بھارت یا پاکستان کسی ایک کے ساتھ بھی الحاق کر سکتے تھے۔ مونٹ بیٹن نے جواب دیا:۔

"میں یہ خونریزی بھی رُکوا سکتا ہوں اور ان لوگوں کو جو پاکستان جانا چاہیں بحفاظت چلے جانے کی سہولت بھی فراہم کر سکتا ہوں"۔

مطلب صاف ظاہر تھا اگر یہ بات نہیں مانی گئی تو پھر ایک مسلمان بھی زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ گورنر جنرل کا فون بند ہو چکا تھا' قتل عام کو رُکوانے کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ناچار سر شاھنواز

www.bhutto.org

نے دوبارہ فون کر کے گورنر جنرل سے اپیل کی کہ وہ خونریزی بند کروادیں اور مسلمانوں کے جان ومال' عزت و آبرو اور متاع واملاک کے تحفظ کا ذاتی طور پر ذمہ لیں' ساتھ ہی انہوں نے اعلان کرادیا کہ جو لوگ یہاں رہنا چاہیں رہ سکتے ہیں اور جو پاکستان جانے کے خواہش مند ہیں وہ رختِ سفر باندھ لیں' انہیں پوری حفاظت کے ساتھ پاکستان پہنچادیا جائے گا۔ اس بات چیت کے چند لمحوں کے بعد بھارتی فوج کے مقامی سربراہ نے جواب تک تماشائی بن کر انسانوں کا وحشیانہ قتل عام دیکھ رہا تھا' سر شاھنواز سے رابطہ قائم کیا اور مسلمانوں کے لئے اعلان امان ان کے سپرد کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں فوج ہندو غنڈوں پر قابو پا چکی تھی۔ مسلمانوں کو امان دلوانے کے بعد سر شاھنواز خود دل گرفتہ پاکستان کی طرف پرواز کر آئے۔

پاکستان آنے کے بعد وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے لیکن سیاسی لیڈروں سے ذاتی طور پر ان کا رابطہ برقرار رہا۔ اس سے قبل بھی قائداعظم اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے لیڈران کے ہاں قیام کر کے ان کی میزبانی کا لطف اٹھاتے رہے تھے' بعد میں بھی حسین شہید سہروردی' سکندر مرزا اور ایوب خان شکار کے لئے وہاں آیا کرتے۔ سکندر مرزا کے ساتھ تو ان کے دیرینہ خاندانی مراسم بھی تھے۔

www.bhutto.org

باب دوم

ہر موڑ پر اک "رام چندانی"

I AM A SOCIALIST BY CONVICTION

(سوشلزم میرے عقیدے میں شامل ہے)

1970ء کے عام انتخابات میں چند ماہ باقی تھے۔ مذہبی حلقوں کی طرف سے بھٹو صاحب اور ان کے ساتھیوں پر کفر کے فتووں کی یلغار تھی۔ ان کے نکاح حرام قرار دیئے جا رہے تھے' اسلامی سوشلزم کا لفظ الحاد کے مترادف قرار دیا جا رہا تھا' یہ نعرہ لگانے والوں کو کچلنے کے لئے ڈنڈے باز تنظیمیں قائم ہو رہی تھیں' پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ سرگرم کارکنوں کے گھروں پر نشان لگائے جا رہے تھے اور دھمکیاں دے کر انہیں اور ان کے لواحقین کو ہراساں کیا جا رہا تھا اور ذوالفقار علی بھٹو لاہور میں کارکنوں کے اجتماع میں دلیری کے ساتھ مندرجہ بالا اعلان کر رہے تھے۔ یہ ان کی فطرت تھی۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ زیادہ خطرات میں وہ زیادہ دلیر ہو جاتے۔ زیادہ غیر معمولی حالات ہوں تو ان کے اعصاب معمول سے بھی کچھ زیادہ ہی نارمل ہو جاتے۔ سانگھڑ میں ان پر قاتلانہ حملہ ہوا تو چاروں طرف سے گولیاں برس رہی تھیں اور بھٹو سینہ تان کر خود حملہ آوروں کی طرف بڑھتے ہوئے با آواز بلند کہہ رہے تھے:

"میں بھٹو ہوں' مجھے گولی مارو' غریب عوام کو کیوں مارتے ہو؟"

برستی گولیوں میں یہ جرأت اور دلیری میدان جنگ میں بھی شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی ہے۔ بھٹو خطرات سے کھیلنے میں لذت محسوس کرتے۔ یہ بھی ان کے عظیم باپ کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ انہیں بچپن ہی سے مکمل آزادی دی گئی تھی۔ ان کی ہر خواہش بلا تامل پوری کر دی جاتی۔ یہ بات بچپن ہی سے ان کے

www.bhutto.org

ذھن میں بیٹھ گئی تھی کہ زندگی اور موت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس طرزِ تربیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں شروع ہی سے بلا کی خود اعتمادی آ گئی تھی اور پھر یہ بھی ہوا کہ انہوں نے جب بھی اپنی مہم جو فطرت کے تحت کسی خطرے کو للکارا اس میں کامیاب ہی رہے۔ والد محترم کی طرف سے انہیں ہر دوسرے انسان کا احترام، خوش اخلاقی اور اپنی بات خوش اسلوبی کے ساتھ منوانے کا ملکہ ملا۔ بھٹو کی تہذیب و شائستگی کمال تک پہنچی ہوئی تھی۔ ان کی ذاتی ضیافت کی میز پر خواہ کوئی غریب کارکن بھی کیوں نہ بیٹھا ہو، وہ خود ڈشز اٹھا اٹھا کر مہمانوں کے پاس لے جاتے۔ بہترین سے بہترین کھانا چن چن کر مہمانوں کی طرف بڑھاتے۔ ان کی عقابی نگاہیں ہر مہمان کی پلیٹ پر ہوتیں کیا مجال ہے کہ کسی کی پلیٹ خالی ہونے والی ہو اور بھٹو پہلے ہی سے دوسری ڈش اٹھا کر اس کے سامنے نہ کر دیں۔ اس خدمت میں وہ اتنے منہمک ہوتے کہ خود اکثر چند ایک لقمے ہی کھا پاتے۔ عظمت انسان کے وہ اتنے قائل تھے کہ ملک کے سب سے با اختیار عہدے پر فائز ہونے کے باوجود ہر ملاقاتی کو کرسی سے اٹھ کر ملتے، گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کرتے اور پھر کھڑے ہو کر ہی رخصت کرتے۔ میرے اس بیان کی تائید وہ غریب کارکن بھی کریں گے جو بھٹو صاحب کو ان کے اقتدار میں آنے کے بعد ملے ہیں۔

انسان کی عظمت کا یہ احساس جو انہیں والدین سے ورثے میں ملا تھا دراصل یہی ان کے سیاسی فلسفے کی بنیاد بنا۔ ہر چند وہ ایک جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، لیکن یہ روائتی طرز کا جاگیردار گھرانہ نہیں تھا۔ دوسرے وہ شعور کی تکمیل کے دور میں، اپنی جاگیر پر رہے بھی نہیں۔ یہ زمانہ انہوں نے کراچی، بمبئی، امریکہ اور برطانیہ میں گزارا۔ یہ وہ دور تھا جب سامراجی نظام اپنی پوری سفاکیوں کے ساتھ بے نقاب ہو چکا تھا، دنیا کا ایک حصّہ سوشلزم کے اقتصادی فوائد سے مستفیض ہو رہا تھا، نئی اور حساس نسل اس نئے فلسفے سے متاثر ہو رہی تھی۔ لیکن بھٹو کا معاملہ دوسرا تھا۔ جب وہ اپنی زمینوں پر جاتے اور خستہ حال ہاریوں کی حالت زار دیکھتے تو ان کا وہ دل تڑپ اٹھتا جو انسانی عظمت کے احساسات سے معمور تھا اور ذھن یہ سوال کرنے لگتا کہ آخر ان محنت کش انسانوں کی بدحالی کا ذمہ دار کون ہے؟ اور وہ کیا طریقہ ہو سکتا ہے جس سے یہ اپنی محنت کا پھل خود حاصل کر سکیں۔ بھٹو کی یہ پہلی غیر مبہم سوچ ان کی بنیادی سوشلزم تھی لیکن انہیں اس سوچ کا شعور دینے والی چیز ان کی مذہبی تربیت تھی۔ بعد میں مطالعے اور سوشلسٹ مفکرین کے لیکچروں نے وہ راہ دکھائی جو انہیں اپنی منزل کی طرف جاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ ایک طرح سے ان کے اپنے خیالات کی تصدیق تھی۔ بھٹو کے بچپن اور زمانہ طالب علمی کے ساتھی پیلو مودی لکھتے ہیں:

> "سوشلزم سے اس کی (بھٹو کی) وابستگی کوئی نئی بات نہیں تھی اور نہ بقول اس کے اسے کوئی اچنبھا کہا جا سکتا ہے۔ جب میں اسے کہتا کہ ہو نہ ہو سوشلسٹ بننے میں تم نے ٹھوکر کھائی ہے تو وہ بڑا کھسیانا سا ہو جاتا اور بڑی رکھائی سے جواب دیا کرتا تھا کہ

www.bhutto.org

"سوشلزم کو تو اس نے بہت پہلے سے اپنا رکھا ہے اور اپنائیت کی وجہ علاقہ سندھ کی بے انتہا غربت کے سوا اور کچھ نہیں۔ سوشلزم کا تصوّر انسانی قدروں اور زندگی کے حقائق سے انسان کے ردِّ عمل کے طور پر جنم لیتا ہے۔"

زلفی کا کہنا تھا کہ "سوشلسٹوں کے نظریات کے متعلق سن سنا کر وہ سوشلسٹ نہیں بنا بلکہ اس کے اپنے جو نظریات تھے وہ ان لوگوں کی توضیح سے اور زیادہ پکّے ہو گئے ہیں۔"

تعلیم کے دوران ان کے نظریات مزید نکھرے اور پختہ ہوئے۔ یہ نظریاتی پختگی وہ محض ایک طالب علم کے طور پر نہیں بلکہ مستقبل کے رہنما کی حیثیت میں حاصل کر رہے تھے۔ انہیں بچپن ہی سے پختہ یقین تھا کہ مستقبل میں وہ اپنی قوم کی قیادت کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ آزادی کے دوران وہ قائداعظم اور پنڈت جواہر لال نہرو کے طرزِ سیاست کا بغور مطالعہ کیا کرتے، مختلف نازک مواقع پر وہ اپنی طرف سے اندازے قائم کیا کرتے تھے کہ کانگریس کی اس چال کا قائداعظم کیا جواب دیں گے اور قائداعظم کے فلاں اقدام پر کانگریس کی طرف سے انہیں کیا جواب ملے گا؟ وہ پنڈت جواہر لال نہرو سے متاثر ضرور تھے لیکن ان کی چھٹی حس اکثر انہیں پنڈت جی سے اس بنا پر بدگمان کر دیا کرتی تھی کہ کیا وہ اپنے نظریات سے مخلص بھی ہیں؟ اس کے برعکس قائداعظم کے وہ پرستار تھے۔ خصوصاً ان کی اُصول پسندی اور کردار کی پختگی نے نوعمر بھٹو کا دل موہ لیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ ایک موقع پر تو انہوں نے خط لکھ کر قائداعظم کو اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔ گویا ان کی تعلیم و تربیت کا دور دراصل ایک رہنما کی تشکیل کا دور تھا۔ ایسے رہنما کی جسے شعور کی آنکھ کھولتے وقت ہی پختہ یقین تھا کہ اسے مستقبل میں ایک عظیم قوم کی قیادت کا فرض انجام دینا ہے۔ پیلو مودی کے الفاظ میں:

"زلفی ہر سال اپنی پڑھائی میں ترقی کرتا رہا۔ اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ قابل اور لائق ہو گیا تھا۔ مطالعے سے بھی اس کی رغبت بڑھ چکی تھی۔ ذھن میں بھی وسعت آگئی تھی۔ سچ پوچھئے تو اس طرح وہ پاکستان کے سیاسی مستقبل کا سربراہ بننے کی تیاری کر رہا تھا، جس کے متعلق نہ تو اسے کوئی شک تھا اور نہ تامل۔"

ان کا مطالعہ ایک آوارہ منش اور ایک گم کردہ راہ طالب علم کا مطالعہ نہ تھا۔ وہ سوشلزم کے اقتصادی نظام کا مطالعہ اس لئے نہیں کر رہے تھے کہ خود ان نظریات میں ڈھل جائیں، بلکہ وہ اوّل و آخر ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ وہ صرف ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے دیکھ رہے تھے کہ نئی دنیا میں وہ کونسے سائنسی اور معاشی نظریات ہیں، جو اسلام کی انقلابی روح کی عملی تعبیر میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے زمانے کی تبدیلی نے تلوار کی جگہ بندوق کو دے دی تھی۔ اسی طرح معاشی

www.bhutto.org

ہتھیار بھی وقت کے ساتھ ساتھ بدل چکے تھے' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہتھیار بدلنے سے مقاصد بدل جاتے ہیں۔ بھٹو بھی اپنے اسلامی انقلابی جذبے کی تکمیل کے لئے جدید سائنسی علوم کا ادراک حاصل کر رہے تھے۔ وہ پہلے مسلمان تھے اور بعد میں سوشلسٹ۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کی شخصیت کا تجزیہ کرتے وقت ہمیشہ انہیں ایک "مسلمان انقلابی رہنما" قرار دیا کرتا ہوں۔ یہ خیال سراسر غلط ہے کہ وہ مصلحت کے تحت اسلامی سوشلزم کا نعرہ لے کر سیاست میں آئے۔ وہ لوگ ذوالفقار علی بھٹو کو جانتے ہی نہیں جو ان کی اصول پرستی پر شبہ کرتے ہیں۔ اس وقت تو شرق اوسط میں بھی سوشلزم کا نام نہ تھا جب انہوں نے زمانہ طالب علمی کے دوران 1948ء کے آغاز میں کیلے فورنیا یونیورسٹی کی لاس اینجلز شاخ میں "اسلام کی تہذیبی میراث" پر ایک لیکچر دیتے ہوئے اسلامی ممالک کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ وہ اسلامی سوشلزم کا راستہ اختیار کریں۔ درحقیقت وہ اسلام کے حقیقی معاشی نظام ہی کو موجودہ عہد کے مسائل کا واحد حل تصوّر کرتے ہیں۔ سوشلزم کا معاشی نظریہ اسلام کی انقلابی روح کے عین مطابق ہے اور یہی چیز بھٹو کو ابتدا ہی سے سوشلزم کے قریب لے آئی۔ حالانکہ 1948ء میں کوئی ایک بھی مسلمان ملک ایسا نہ تھا جس نے سوشلزم کو اپنایا ہو۔ اس سے ذوالفقار علی بھٹو کی اس سیاسی بصیرت کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے جو انہیں زمانہ طالب علمی میں بھی حاصل تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں نہیں ہوتا بلکہ اسے پیدا کر لیا کرتا ہے۔ اور وہ نوجوان طالب علم اپنی چشم بصیرت سے 48ء میں مسلمان ملکوں کو وہ مشورہ دے رہا تھا جو دس پندرہ سال کے بعد ایک حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔

برکلے سے پولیٹیکل سائنس اور انٹرنیشنل لاء میں ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد بھٹو آکسفورڈ آئے اور یہاں سے قانون میں ایم اے آنرز کیا۔ اور اس کے ساتھ لنکن یونیورسٹی سے بیرسٹری کی سند بھی حاصل کر لی۔ اس یونیورسٹی نے انہیں لیکچرر شپ کی پیش کش کی۔ ابھی وہ اس منصب پر فائز ہوئے ہی تھے کہ انہیں بذریعہ تار اپنے والد محترم کی علالت کی اطلاع ملی اور وہ سب چھوڑ چھاڑ کر واپس وطن آ گئے۔

یہاں آ کر انہوں نے دیکھا کہ والد محترم کی بیماری کے سبب خاندان کا تمام نظام بگڑا ہوا ہے' زمینوں کی حالت دیکھ بھال کی کمی کی وجہ سے ابتر ہو چکی تھی۔ بھٹو نے نہ صرف والد گرامی کی تیمارداری کا فرض ادا کیا بلکہ اس کے ساتھ زمینوں کے بندوبست پر بھی توجہ دی۔ کچھ یہ بندوبست بہتر کیا اور کچھ والد محترم کی صحت میں بہتری کے آثار نمودار ہوئے' مگر بھٹو نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اب خاندان کو بھی ان کی خدمات کی ضرورت ہے۔ لہٰذا واپس برطانیہ جانے کا ارادہ ترک کیا اور پاکستان ہی میں رہ کر عملی زندگی شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ کراچی آ کر انہوں نے رام چندانی کے ساتھ مل کر وکالت شروع کی۔ ان کے اکثر سوانح نگار اس بات کو رام چندانی کی تنگ نظری پر محمول کرتے ہیں کہ اس نے بھٹو کی ذہانت دیکھ کر خوفزدگی کے عالم میں انہیں وکالت سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میرا خیال ان سے مختلف ہے'

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو "اسسٹنٹ ٹائپ" کی ذہنیت کے مالک ہی نہ تھے' وہ تو پیدائشی قائد تھے۔ رام چندانی جیسا پیشہ ور وکیل بھلا اپنے جونیئر کی قائدانہ صلاحیتوں کی تاب کیسے لا سکتا تھا؟ کیا بعد میں ایوب خاں کے ساتھ بھی وہی کچھ نہیں ہوا جو رام چندانی کے ساتھ ہوا تھا؟ اور کیا ایوب خاں نے اپنے رنگ میں وہی کچھ نہیں کیا جو رام چندانی نے کیا تھا؟ رام چندانی اور ایوب خاں دونوں ہی اپنے مقام پر درست تھے' وہ بھٹو کی روشن طبع کی تاب لا ہی نہیں سکتے تھے۔ اور انہیں پر کیا موقوف ہے واقعہ یہ ہے کہ کوئی بھی کلاسیکی روایت کا آدمی اس انقلابی شخص کی تیزی و طرّاری کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

یہ رام چندانی صاحب بھٹو کو ایک ترقی پسند فارمر بنانے کے چکر میں تھے۔ بھٹو ان کے مشورے سن کر مسکرائے اور اپنا علیحدہ دفتر قائم کر لیا۔ اتفاق کی بات کہ ان کا پہلا ہی مقدمہ سندھ ہائی کورٹ میں پیش ہوا۔ مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے انگریز چیف جسٹس نے خلافِ معمول بھٹو صاحب کی ذہانت و فطانت کی داد کورٹ روم میں ان الفاظ کے ساتھ دی:

> "میں بڑے اعتماد اور یقین کے ساتھ اپنے اس کمرۂ عدالت میں یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ مسٹر بھٹو بہت جلد اس ملک کے بڑے نامور اور کامیاب وکیل بن جائیں گے۔"

بھٹو نے اپنے مختصر سے وکیلانہ کیریئر میں قتل کی جتنی بھی اپیلیں دائر کیں وہ سب کی سب منظور ہوئیں۔ اب وہ وکالت میں تیزی سے کامیابی کی طرف گامزن تھے لیکن بھٹو کی منزل یہ تو نہ تھی' یہ قانونی کامیابیاں تو انہوں نے "بس ذرا یونہی" بطور مشغلہ حاصل کر لی تھیں' ورنہ عام طور پر ان کے آفس میں تالا پڑا رہتا۔ ان کی زیادہ توجہ زمینوں کی دیکھ بھال پر مرکوز تھی یا ملکی و عالمی سیاسی امور پر مطالعے و تجزیئے پر۔ اسی دوران سندھ مسلم لا کالج کی طرف سے انہیں اپنی سہولت کے مطابق کانسٹی ٹیوشنل لا پڑھانے کی درخواست کی گئی۔ بھٹو نے اس کام کے لئے کچھ وقت دے دیا۔ یہ پاکستان کی نئی نسل کے ساتھ ان کا پہلا عملی رابطہ تھا' جو زندگی کے آخری سانس تک برقرار رہا۔

یہی وہ دن تھے جب مغربی پاکستان میں ون یونٹ نافذ کیا جا رہا تھا۔ مشرقی پاکستان کی سیاسی برتری کو کنٹرول کرنے کے لئے مغربی پاکستان کے حکمران طبقوں کی وہ خطرناک سازش جو آخر کار ملک کی تقسیم پر منتج ہوئی' ون یونٹ دراصل وہ بیج تھا جو بعد میں بار آور ہو کر بنگلہ دیش کے قیام کی صورت میں سامنے آیا۔ بھٹو اس وقت تک عملی سیاست میں آنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے' لیکن ان کی نگاہِ بصیرت افروز اس سازش کے انجام کو دیکھ رہی تھی۔ اس موقع پر وہ خاموش نہ رہ سکے' اور "لمحۂ موزوں" کا انتخاب کر کے عملی اقدام کرنے کے قائل بھٹو پاکستان کے ساتھ اپنے بے پناہ جذبہ محبت سے مجبور ہو کر ون یونٹ کے خلاف میدان عمل میں اتر آئے۔ نہ صرف انہوں نے سندھ یونٹ فرنٹ کے نام سے اپنی سربراہی میں ایک

www.bhutto.org

تنظیم قائم کی اور ون یونٹ کے خلاف تقریریں کیں بلکہ ایک زبردست پمفلٹ بھی لکھا۔ ان دنوں ایوب کھوڑو سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے' مغربی پاکستان کے حکمران طبقوں کے مفادات کے خلاف بلند ہونے والی یہ آواز انہیں کیسے پسند آ سکتی تھی؟ فیصلہ کر لیا گیا کہ بھٹو کو پابند سلاسل کر دیا جائے۔ لیکن سندھ میں بھٹو خاندان کا سیاسی اثر ورسوخ آڑے آیا اور اس اقدام کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مشکلات کا اندازہ کر کے کھوڑو کو اپنے یہ احکامات واپس لینے پڑے۔

ادھر بھٹو خود یہ اندازہ کر چکے تھے کہ ان کی مہم مغربی پاکستان کے حکمران طبقوں کے ارادوں کو متزلزل نہ کر پائے گی بلکہ الٹا اس بات کا اندیشہ ہے کہ اگر اس مہم کو جاری رکھا گیا تو یہ حکمران طبقے مزید ایسے احمقانہ اقدامات کر گزریں گے جو ملک کے دونوں حصّوں میں زیادہ بدگمانیاں پیدا کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے دوبارہ اپنی توجہ زمینوں کے بندوبست اور مطالعے کی طرف مبذول کر دی۔ انہی دنوں میں انہوں نے اپنے آبائی مکان کی جگہ موجودہ "المرتضیٰ" کی تعمیر بھی مکمل کی۔

ہر چند بھٹو ابھی عملی سیاست میں آنے سے گریز کر رہے تھے' لیکن اسی دور کے حکمرانوں کو ان کی بے پناہ سیاسی صلاحیتوں کا اندازہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ تجویز پیش کی گئی کہ 1955ء میں اقوام متحدہ میں جانے والے وفد کا انہیں بھی رکن نامزد کیا جائے۔ اس زمانے کے وزیر اعظم چودھری محمد علی نے انہیں انٹرویو کے لئے بلوایا۔ عالمی و ملکی امور پر بھٹو کے ترقی پسندانہ خیالات سن کر چودھری محمد علی کی بھی وہی حالت ہو گئی جو رام چندانی کی ہوئی تھی۔ وہ ان کی ذہانت کا تو کچھ نہ بگاڑ سکے البتہ اپنے اختیارات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وفد میں ان کی شمولیت کی تجویز کو مسترد کر دیا۔

کتنی عجیب بات ہے کہ جس نوجوان کو چودھری محمد علی وفد میں شامل کرنے سے گریزاں تھے' سہروردی اس کو اپنی عوامی لیگ میں شامل کرنے کے لئے بے چین تھے۔ وہ خود چل کر سر شاھنواز بھٹو کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے کہ وہ اپنے صاحبزادے کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ ان کی پارٹی میں شامل ہو جائے۔ لیکن سر شاھنواز کا جواب سیدھا اور صاف تھا:

"میں اپنے بیٹے پر اپنے خیالات نہیں ٹھونس سکتا' آپ خود اس سے بات کریں۔ وہ اپنے لئے بہتر فیصلہ کر سکتا ہے۔"

سہروردی کو یہ بات پسند تو نہ آئی لیکن وہ کر بھی کیا سکتے تھے؟ ان کے دور میں ایک بار پھر اقوام متحدہ میں جانے والے وفد میں شمولیت کے لئے بھٹو کا نام سامنے آیا لیکن وہ چودھری محمد علی کی طرح بیوروکریٹ نہیں' بہر حال سیاستدان تھے۔ انہوں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور یوں ستمبر 1957ء میں ذوالفقار علی بھٹو پاکستانی وفد میں شامل ہو کر اقوام متحدہ تشریف لے گئے اور وہاں "امن عالم اور جارحیت" کے موضوع پر اپنی پہلی عالمی تقریر کی۔

www.bhutto.org

باب سوم

ایوب خاں کی کابینہ میں

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جب بھٹو پیدا ہوئے تو سندھ کا معمولی خطّہ چند ہی سال بعد موئن جودڑو کی دریافت کے بعد' دنیا کی عظیم تہذیبوں کا سرچشمہ بن کر اُبھرا۔ اور بھٹو عالمی سٹیج پر نمودار ہوئے تو قدرت نے ان سے ان کا ذاتی "موئن جودڑو" چھین لیا۔ ابھی ان کی اس پہلی عالمی تقریر کی صدائے بازگشت اقوام متحدہ کے ایوانوں میں گونج رہی تھی اور اقوام عالم اس انقلابی نوجوان کے خیالات پر اپنی توصیفی رائے کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ کی تلاش میں تھیں کہ بھٹو کو اپنے والد گرامی قدر کی وفات کا المناک تار وہیں موصول ہو گیا۔

مارچ 58ء میں بھٹو صاحب کو بحری سرحدوں کے سلسلے میں جنیوا میں منعقد ہونے والی اقوام متحدہ کی ایک کانفرنس میں اپنے ملک کی نمائندگی کرنے کا دوبارہ موقع ملا۔ انہوں نے اس نمائندگی کا حق ادا کر دیا۔ اس کانفرنس میں انہوں نے پانچ تقریریں کیں۔ 17' 18 اور 25 مارچ اور 10 اور 15 اپریل کو کی جانے والی ان تقریروں میں بھٹو نے جو کچھ کہا' اس کی جھلک آپ آج کے دور میں از سر نو متعین ہونے والی نئی بحری سرحدوں کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں۔ خود پاکستان کی بحری سرحدوں کی توسیع کا فیصلہ اس زمانے کے نوجوان بھٹو کے نظریات کا ایک عملی روپ ہے۔ ان تقاریر نے ان کے علم و فضل کا چرچا پوری دنیا کے اربابِ حل و عقد میں کر دیا تھا۔ کانفرنس میں شریک امریکہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ نے بھٹو کو اس موقع پر غیر معمولی داد دی۔

اکتوبر 1958ء کو ایوب خان کی وزارت میں شامل ہونے والا ذوالفقار علی بھٹو کسی سفارش کے نتیجے میں کابینہ کا رکن نہیں بنا تھا بلکہ اس حکومت کی مجبوری بن گیا تھا۔ اور اس مجبوری کی دو وجوہ تھیں'

www.bhutto.org

مارشل لا کی اس انتظامیہ کو عوام میں اپنی ساکھ بنانے کے لئے ایک طرف ایسے لوگوں کے تعاون کی تلاش تھی جو سیاسی طور پر بے داغ ہوں اور دوسری طرف ان کی کوشش یہ تھی کہ کابینہ میں ایسے افراد شامل کئے جائیں جو داخلی طور پر با اثر ہوں۔ بھٹو نہ صرف ان دونوں تقاضوں کو پورا کرتے تھے بلکہ ان میں ایک اضافی خوبی یہ تھی کہ عالمی سطح کی چند کانفرنسوں اور اجلاسوں میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کے بعد بیرون ملک بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے تھے۔ اس کے علاوہ کابینہ میں سندھ کی نمائندگی بھی لازمی تھی۔ اس وقت پورے سندھ میں کوئی دوسرا سیاستدان ایسا نہ تھا جو اعلیٰ تعلیم و تربیت' خاندانی پس منظر' بے داغ سیاسی کردار اور عالمی امور پر بھرپور دسترس ایسی تمام جملہ خوبیوں کی یکجائی میں بھٹو کا متبادل ثابت ہو سکتا۔ ماضی کا پردہ اٹھا کر ایوب خاں کی پہلی دس رکنی کابینہ میں شامل ہونے والے دوسرے "جرنیل نی کرنیل نی" قسم کے تمام چہروں کو دیکھا جائے تو ان میں کوئی ایک بھی ذوالفقار علی بھٹو جیسے بھرپور پس منظر کا مالک نہ تھا۔ اس طرح سری نگر کو جانے والی بس میں بیٹھا وہ بارہ سالہ لڑکا صرف اٹھارہ سال کے بعد پاکستان کا وزیر تجارت بن چکا تھا۔

پورے برّصغیر میں اس کم عمری میں کسی مرکزی وزارت کی سربراہی کا یہ اعزاز حاصل کرنے والا پہلا نوجوان ذوالفقار علی بھٹو تھا۔ کسی اور سیاستدان کے لئے یہی اعزاز کافی تھا لیکن ذوالفقار علی بھٹو کے معاملے میں بقول غالب ؎

بقدرِ ذوق نہیں ظرف تنگنائے غزل

کے مصداق' یہ وزارت بھٹو کے حقیقی عزائم و نظریات کی تکمیل کے لئے سنگِ میل تو ضرور تھی' نشانِ منزل نہ تھی۔ آئینی طور پر وہ صرف وزیر تجارت ہی تھے' لیکن عملاً وہ اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے بل پر ایوب خاں کے وزیر اعظم بن چکے تھے۔ اپنے پورٹ فولیو کے لحاظ سے انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ عوامی ضروریات کی چیزوں کے نرخ نہ صرف گرائے بلکہ ایسا نظام بنا دیا کہ وہ مستحکم رہیں' لیکن یہ ان کا محض ایک ثانوی سا کام تھا۔ اصل کام انہوں نے یہ کیا کہ زرعی اصلاحات کا ایک تفصیلی خاکہ مرتّب کر کے ایوب خاں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ ملک میں ان اصلاحات کا نفاذ کرے۔ واضح رہے کہ خود مسلم لیگ ماضی میں زرعی اصلاحات کے نام پر انتخاب جیت کر جاگیرداروں کے دباؤ کی وجہ سے اس وعدے سے منحرف ہونے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بھٹو کو اپنا یہ منصوبہ تسلیم کرانے کے لئے کون کون سی مشکلات سے گزرنا پڑا ہو گا۔ ان کے اصل مسودے میں تجویز کردہ حدِ ملکیّت بدل دی گئی۔ نئی حدِ ملکیّت کے بعد بھی کوشش کی گئی کہ بھٹو کا یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ پائے۔ لیکن "خارجی حالات کے ماتحت" بنیادی اصولوں پر کاربند رہ کر اپنی پالیسیاں مرتب کرنے والا بھٹو' تن تنہا ان سازشوں کے سامنے ڈٹ گیا اور ایوب خاں سے زرعی اصلاحات نافذ کروا کے ہی دم لیا۔ یہ اور بات ہے کہ مفاد پرستوں

www.bhutto.org

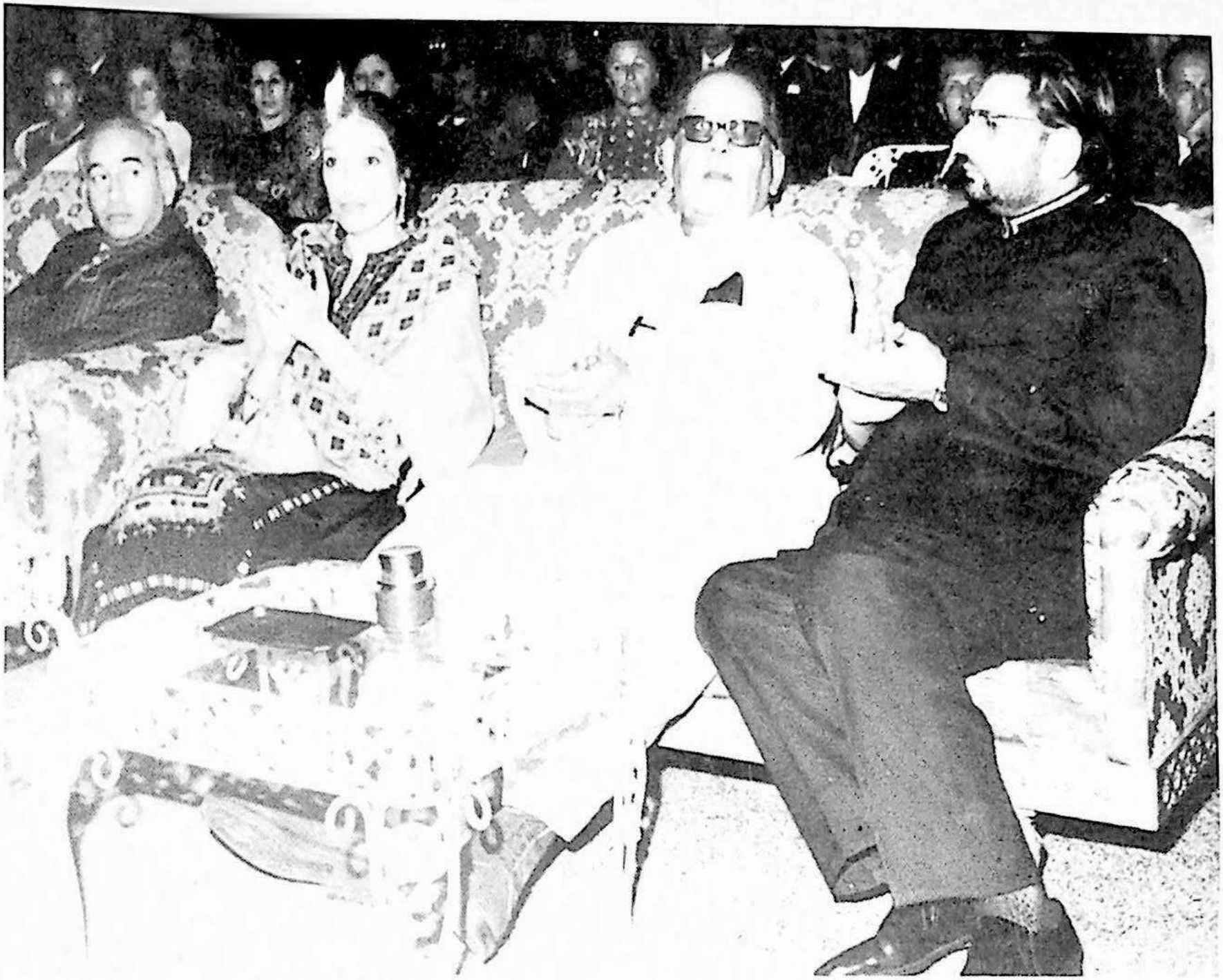

کوثر نیازی ' خان آف قلات ' بیگم بھٹو اور بھٹو ایک دعوت میں

www.bhutto.org

نے پھر بھی گنجائش رکھ کر اپنے طبقے کو بچالیا' لیکن بھٹو خاندان نے دیانت داری کے ساتھ اپنی اڑتیس ہزار ایکڑ سے زائد زمین حکومت کے حوالے کر دی۔ ایوب کابینہ کا واحد وزیر ذوالفقار علی بھٹو تھا' جو ان زرعی اصلاحات سے براہ راست متاثر ہوتا تھا۔ اور ہوا۔

لیکن بھٹو تو وہ تھا جو پنڈت جواہر لال نہرو کے ترقی پسندانہ خیالات پڑھ کر شبہ کیا کرتا تھا کہ "کہیں پنڈت جی کے طبقاتی مفادات ان کے نظریات پر غالب نہ آجائیں"۔ وہ خود بھلا ایسی آزمائش سے سرخرو ہو کر کیوں نہ نکلتا؟ ان اصلاحات کے ذریعے سب سے زیادہ زد خود بھٹو کے طبقاتی مفاد پر پڑتی تھی۔ ان کے اپنے خاندان کے لوگوں نے ان سے درخواستیں کیں کہ "کیوں ہمیں تباہ کرنے پر تلے ہو؟" انہیں بڑے بوڑھوں نے سمجھایا کہ اس ملک کی سیاست میں رہنے کے لئے زمینوں کا پاس رکھنا ضروری ہے' تم خود اپنے ہاتھ پاؤں کیوں کاٹ رہو ہو؟ لیکن نہرو کے طبقاتی کردار پر شبہ کرنے والا بھٹو' خود ان ترغیبات میں کیسے آسکتا تھا؟

بھٹو کا مطمع نظر صرف داخلی اصلاحات ہی نہ تھا' وہ اپنے ملک کو' جو اس وقت سامراج کے شکنجے میں بری طرح جکڑا ہوا تھا' آزاد کرانے کے منصوبہ گر بھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے زرعی اصلاحات کے اپنے اصل خاکے کو ادھورے رنگ میں نافذ ہوتے دیکھ کر بھی خاموشی اختیار کر لی۔ کیونکہ ان کی نظر اپنے اردگرد کی دنیا پر بھی تھی' جو تیزی کے ساتھ بدل رہی تھی اور پاکستان ان تبدیلیوں سے بھرپور انداز میں متاثر ہو رہا تھا۔

www.bhutto.org

باب چہارم

پاک چین تعلقات کا بانی

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے آثار دیکھتے ہی امریکہ نے مرتے ہوئے برطانوی سامراج کی گرفت سے آزاد ہونے والے برصغیر پر اپنی نظریں گاڑ دی تھیں۔ ہرچند وہ اس سرزمین پر اجنبی تھا۔ لیکن اپنے نو آبادیاتی مستقبل کے بارے میں اسے کوئی شبہ نہ تھا۔ اس دور کی امریکی قیادت پوری غیر کمیونسٹ دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کے طویل المیعاد منصوبے مرتب کر رہی تھی' برصغیر جیسا قدرتی وسائل سے مالا مال اور عظیم ترین آبادی والا خطہ اس کی نظر سے اوجھل کیسے رہ سکتا تھا؟۔ برطانوی سامراج کی کوشش تھی کہ ہندوستان کو تقسیم کئے بغیر آزاد کیا جائے' امریکی بھی اس معاملے میں انگریز کے ہمنوا تھے۔

ذرائع مواصلات کی ترقی اور پس ماندہ اقوام کے حکمران طبقوں کو اپنے مطالب کے نظریاتی سانچے میں ڈھالنے کی نئی روائت نے براہ راست کالونیاں بنا کر حکومت کرنے کے سامراجی طریقے کو بدل دیا تھا' اب بقول ذوالفقار علی بھٹو "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے کلیئے کی جگہ "متحد رکھو اور حکومت کرو" کے نئے طریقے کی ضرورت تھی' یہی وجہ تھی کہ انگریز ہندوستان کو متحد رکھنا چاہتا تھا اور امریکہ بھی جو ابھرتے ہوئے سوویت یونین کی شکل میں اپنے واحد حریف کے پھیلاؤ کو روکنے کی حکمت عملی مرتب کر رہا تھا' ہندوستان اور چین ایشیا میں کمیونزم کی یلغار کو روکنے کے لئے متحدہ ہندوستان ہی کو موزوں تصور کرتا تھا' بھٹو اپنی کتاب "میتھ آف انڈی پینڈینس" میں اس دور کی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "بدلتے ہوئے حالات اور اس کے ہم نظیر جدید استعماریت کے تقاضوں کو زیادہ بڑی منڈیوں میں زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے اور کمیونزم کی دخل اندازیوں

www.bhutto.org

سے اپنا دفاع کرنے کے لئے برّصغیر کی وحدت کی ضرورت تھی' یہ خدشہ محسوس کیا جاتا تھا کہ برصغیر کو تقسیم کرنا ..... "تقسیم کر کے گنوانے" ..... کے مترادف ہو گا اور اس طرح خام مال کی وسیع منڈیوں تک رسائی میں رکاوٹ پیدا ہو گی اور روس کی برصغیر کو قابو میں رکھنے کی دیرینہ خواہش کے خلاف اس خطے کا دفاع کمزور ہو جائے گا۔ اس تشخیص کی بناء پر برطانویوں نے آخر دم تک تقسیم ہند کے خلاف کوشش کی۔"

گو وہ مسلمانوں کی عظیم تحریک آزادی کے سامنے بے بس ہو کر نیم دلی کے ساتھ برّصغیر کی تقسیم پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن دھاندلی سے کام لے کر نوزائیدہ پاکستان کی سرحدوں کا تعین اس انداز میں کیا کہ اس کی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت رکھ کر چلے گئے' کشمیر کا تنازعہ درحقیقت اس غیر منصفانہ تقسیم کا نتیجہ ہے۔ برطانویوں کے چلے جانے کے بعد ان کی ماہرانہ سرپرستی میں امریکہ نے برّصغیر کے دونوں نئے ملکوں میں پھونک پھونک کر اپنے قدم گاڑنے شروع کئے۔ وہ ابتدا میں اپنے "ماہروں اور مدد" کے ساتھ یہاں متعارف ہوا اور اس قسم کے منصوبے مرتب کر کے دیئے کہ ان کی تکمیل کے لئے امریکہ ہی سے مالی اور ٹیکنیکی مدد حاصل کرنی پڑے۔ پاکستان قائداعظمؒ کے بعد حقیقی قیادت سے محروم ہو چکا تھا' لہٰذا یہاں امریکیوں کو اپنے نفوذ میں جلد اضافہ کرنے کا موقع مل گیا۔ اس کے برعکس بھارت نے پنڈت جواہر لال نہرو کی سربراہی میں امریکی امداد سے تو فائدہ اٹھایا، لیکن اپنے دروازے روس اور دوسرے کمیونسٹ ملکوں پر بھی بند نہ کئے امریکہ نے پنڈت جی کے اس رویئے سے مایوس ہوئے بغیر ایک طرف تو بھارت کے اقتصادی شعبے میں آہستہ آہستہ اثر و رسوخ حاصل کرنا شروع کر دیا اور دوسری طرف پاکستان کے ساتھ اپنے تعلقات میں اضافہ کر لیا' لیکن اس وقت امریکہ پاکستان کی "سرپرستی" اس لئے نہیں کر رہا تھا کہ اسے ہماری خود مختاری و بقا منظور تھی' بلکہ مقصد محض یہ تھا کہ جب وقت آنے پر بھارت "راہ راست" پر آ جائے تو پاکستان کو اس کی "تولیت" میں دے کر دونوں کو مشترکہ طور پر کمیونزم کے خلاف صف آراء کر دیا جائے۔

1958ء میں ایوب خان برسر اقتدار آئے تو اس ضمن میں امریکی کوششیں پہلے سے زیادہ تیز ہو گئیں۔ امریکی اثر و نفوذ ان دنوں کابینہ کے بعض ممبروں سے لے کر بیوروکریسی تک میں بڑی گہرائی کے ساتھ پھیل چکا تھا۔ خود حکومت کے اندر محمد شعیب کی سربراہی میں اس کی ایک مؤثر لابی موجود تھی' تاریخ کے اس نازک لمحے میں بھٹو نے کس طرح ان بھرپور اثرات کا مقابلہ کیا اور کس طرح ایوب خان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ بطور وزیر تیل' گیس اور قدرتی وسائل کے روس جا کر تعاون کا معاہدہ کریں' اپنی جگہ حیرت انگیز بھی ہے اور بھٹو کی بے پناہ سیاسی صلاحیتوں کا ایک ناقابل تردید ثبوت بھی' یہ ان کی سیاسی بصیرت

www.bhutto.org

کی ایک عظیم فتح تھی' وزارت خارجہ کا چارج لئے بغیر جہاں وہ بیرونی محاذ پر پاکستان کی تنہائی دور کر رہے تھے، وہاں داخلی طور پر بھی انہیں جہاں موقع ملا اس سے فائدہ اٹھا کر وہ ملک کو مستحکم اور خود کفیل بنانے کے اقدامات کرتے رہے' مثلاً سائنس اور ٹیکنالوجی کا محکمہ ان کے پاس نہیں تھا' لیکن پاکستان میں پہلا اٹامک ری ایکٹر قائم کرنے میں صرف اور صرف ان کی ذاتی جدوجہد کا دخل تھا' بطور وزیر آبپاشی انہوں نے مختصر سے عرصے میں اکتیس ہزار پانچ سو ٹیوب ویل نصب کرائے اور سات ہزار پانچ سو میل لمبی نہریں تعمیر کرائیں اور یہ کارنامہ اس سربراہ حکومت کے زمانے میں انجام دیا جو زراعت کی قیمت پر' غیر بنیادی صنعتیں قائم کرنے کا زبردست داعی تھا۔

کابینہ میں شمولیت کے کچھ ہی عرصے بعد وہ ایوب خان کو عالمی سیاست کے حقائق اور ان کے نتیجہ میں پاکستان کی خارجہ پالیسی میں توازن پیدا کرنے کی اشد ضرورت سے آگاہ کرتے رہے اور اہم مواقع پر پاکستان کے مؤقف کی وضاحت کا فریضہ بھی ادا کرنے لگے مثلاً مئی 1961ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو نے کشمیر میں پاکستان پر جارحیت کا الزام عائد کیا تو' یہ جناب بھٹو ہی تھے جنھوں نے پاکستان کی طرف سے انہیں بھرپور جواب دیا۔ مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے مؤقف کی حمایت کرنے کے لئے مصر' چین' برطانیہ اور آئرلینڈ کے کامیاب دورے کئے' یہ وہی تھے جنھوں نے پہلی بار پاکستان کی یک رخی خارجہ پالیسی پر تنقید کی اور اس تلخ حقیقت کا اعتراف کیا کہ ہماری اپنی غلطی کی وجہ سے روس نے کشمیر کے معاملے میں بھارت کا ساتھ دیا ہے' حالانکہ اس وقت وہ وزیر اطلاعات' تعمیر نو' بجلی و آبپاشی کے وزیر تھے' اسی طرح جب کنسورشیم نے پاکستان کو مالی امداد دینے میں حیل و حجت سے کام لیا تو جناب بھٹو ہی تھے جو پاکستان کے مؤقف کی وضاحت کے لئے رکن ممالک کے دورے پر گئے۔ اس سے میرے اس بیان کو تقویت ملتی ہے کہ پاکستان کی بدلتی ہوئی خارجہ پالیسی کے اصل روح رواں بھٹو ہی تھے اور وہی متعلقہ ممالک کو بہتر انداز میں قائل کرنے کی پوزیشن میں تھے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں یہ تبدیلی کسی طاقت کے خلاف نہیں' بلکہ خالصتاً پاکستان کے اپنے قومی مفادات کے تابع ہے۔ چونکہ وہی اس کے خالق تھے۔ لہٰذا کنسورشیم کے ممالک کا دورہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ ایوب حکومت بھی اس حقیقت کی قائل تھی کہ بھٹو خود ہی بہتر انداز میں پاکستان کے مؤقف کی وضاحت کر سکتے ہیں اور اپنے اس دورے میں بھی حسب معمول وہ کامیاب ہو کر واپس وطن آئے۔ 1962ء کی ابتدا میں انہیں صنعت و حرفت اور قدرتی وسائل کی وزارتیں سونپ دی گئیں۔ اس زمانے میں بھی خارجہ امور پر پاکستان کے نفس ناطقہ بھٹو ہی تھے' ایک طرف وہ بیرونی ممالک میں پاکستان کی نمائندگی کرتے تھے تو دوسری طرف عالمی پریس اور قومی محاذ پر بھی نو تشکیل خارجہ پالیسی کی وضاحت کیا کرتے تھے' اس ضمن میں 62ء کے جون' جولائی' نومبر اور دسمبر میں قومی اسمبلی کے اجلاسوں کے دوران کی گئی ان کی تقریریں قابل ذکر ہیں' جو ان کی اہم تقریروں کے

www.bhutto.org

مجموعے میں شامل ہیں۔

ادھر بھٹو پاکستان کی خارجہ پالیسی کو نئے خطوط پر مرتب کر رہے تھے اور ادھر امریکہ اپنے طویل المیعاد منصوبے کے تحت بھارت اور پاکستان کو ایک لڑی میں پرو کر چین کے خلاف صف آراء کرنے کے لئے تیزی کے ساتھ سرگرم عمل ہو گیا تھا۔ یہی وہ دور تھا جب امریکہ کے عالمی سفیر ہیری مین ان دونوں ملکوں کے باہمی تنازعات اپنے اسلوب کے ساتھ طے کرانے برّصغیر میں آئے تھے' منصوبہ یہ تھا کہ ایوب خان کی پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ ملاقات کا اہتمام کرا کے بالائی سطح پر ہی معاملہ طے کرا دیا جائے۔ اس موقع پر بھی بھٹو کی فراست سامنے آئی اور انہوں نے ایوب خان کو سربراہی ملاقات سے قبل وزارتی سطح پر مذاکرات کے لئے آمادہ کر لیا' ان مذاکرات کا بھی ایک طویل پس منظر ہے' جس کی کچھ تفصیل بھٹو صاحب نے اپنی کتاب Myth of Independence. " میتھ آف انڈی پینڈینس " میں دی ہے۔

اس پوری تفصیل کی روشنی میں دیکھا جائے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ بھٹو نے سربراہی کانفرنس سے قبل وزارتی سطح کے مذاکرات کی اپنی تجویز منوا کر قومی خود مختاری کی طرف بڑھتے ہوئے کتنے بڑے خطرے کو ٹال دیا تھا۔ ان مذاکرات میں چونکہ پاکستان وفد کی قیادت انہی کو کرنا تھی۔ لہٰذا بعد میں ان کے لئے اور بھی آسان رہا کہ پاکستان کے مفاد کے لئے ان مذاکرات کا رُخ طے شدہ بین الاقوامی سازش کے برعکس سمت میں موڑ دیں۔

دوسری طرف چین سے " سرحدی تنازعہ " پیدا ہونے کے بعد پنڈت نہرو دانستہ طور پر امریکی اور مغربی امداد کے حصول اور غذائی ضروریات کی تکمیل کے لئے جو صورت حال پیدا کر رہے تھے' پاکستان میں بھٹو اسے اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ وہ " تنازعے " کو اس کے منطقی انجام کی جانب بڑھتا ہوا دیکھ رہے تھے' اور ایوب خان کو آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ اس آنے والے لمحے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیں' لیکن دوسری طرف بیرونی طاقتوں نے ایوب خان سے اپنے طور پر یقین دہانیاں حاصل کر لیں تھیں' یہی وجہ تھی کہ جب لدّاخ کی سرحدوں پر چین بھارت جھڑپیں ہو رہی تھیں اور پاکستان اپنی تاریخ کا سب سے اہم اور فیصلہ کن اقدام کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ ایوب خان اس وقت سوات میں گالف کھیلنے میں مصروف تھے' بھٹو بے چین ہو کر خود سوات گئے اور صدر کو پوری تفصیل کے ساتھ صورت حال سمجھا کر تجویز پیش کی کہ وہ اس فیصلہ کن لمحے کو ہاتھ سے مت نکلنے دے اور کشمیر میں فوجی اقدام کر کے' اس جھگڑے کو ہمیشہ کے لئے اپنے حق میں حل کر لے۔ مگر افسوس کہ وہ صدر ایوب کو اس کے لئے قائل نہ کر سکے' فیلڈ مارشل تو امریکہ کے زیر اثر بھارت کو " مشترکہ دفاع " تک کی پیشکش کر چکے تھے وہ اس تاریخی لمحے سے کیسے فائدہ اُٹھاتے اگر کہیں اس وقت بھٹو صاحب اپنی تجویز منوانے میں کامیاب ہو جاتے تو آج برّصغیر کی تاریخ مختلف ہوتی!۔

www.bhutto.org

باب پنجم

راستے جدا ہوتے ہیں

ابھی تک بھٹو خارجہ امور میں ایوب خاں کو مشورے دیا کرتے تھے اور نازک مواقع پر خود امور خارجہ کی نمائندگی اور ترجمانی کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ لیکن فیصلہ کن مراحل میں ایوب خاں اپنی مرضی بھی کر جایا کرتے تھے۔ بعد میں جب ایوب خاں کی توقعات پوری ہونے کی بجائے واقعات نے ان پر واضح کر دیا کہ بھٹو کے قائم کردہ اندازے درست ثابت ہوئے ہیں اور پنڈت نہرو نے امریکہ اور مغرب سے بھرپور فوجی اور اقتصادی امداد حاصل کر کے 'کشمیر کے معاملے میں صاف آنکھیں دکھادی ہیں تو جنوری 1963ء میں ایوب خاں نے وزارت خارجہ کی ذمہ داریاں ذوالفقار علی بھٹو کو سونپ دیں' وزارت خارجہ کا قلمدان سنبھالتے ہی انہوں نے چین کی طرف اٹھے ہوئے ان قدموں کو' جن کی تحریک وہ پہلے ہی کر چکے تھے' تیزی کے ساتھ آگے بڑھایا اور صرف دو ماہ بعد اس عظیم ہمسایہ مملکت کے ساتھ' نہایت ہی خوشگوار انداز میں سرحدی معاہدہ کر لیا۔ روس کے ساتھ معاہدے کے بعد یہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کا پہلے سے بھی زیادہ اہم اور فیصلہ کن موڑ تھا' اس کی اہمیت کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان امریکہ کے ساتھ فوجی معاہدوں میں منسلک تھا اور اقتصادی طور پر اس کا دست نگر' اس وقت بھارت اچانک چین کے خلاف محاذ آراء ہو چکا تھا' امریکہ چین کو دشمن نمبر ایک تصور کرتا تھا' اس کی دیرینہ خواہش یہ تھی کہ پاکستان اور بھارت مشترکہ طور پر چین کے خلاف صف آراء ہوں اس خواہش کی تکمیل میں ہمیشہ بھارت رکاوٹ بنا رہا تھا اور امریکہ کی تمام تر کوششیں بھارت کو اپنے ڈھب پر لانے کے لئے وقف تھیں' پاکستان کو تو وہ مرغ دست آموز تصوّر کر رہا تھا۔ لیکن جب امریکہ کے لئے وہ سنہری لمحہ آگیا کہ بھارت نے چین کے ساتھ "صف آرائی" کی پالیسی اختیار کر لی تو مرغ دست آموز' شہباز و شاہین بن کر چین کی کھلی فضاؤں

www.bhutto.org

میں اڑنے لگا حالانکہ اس وقت کی امریکی پالیسی یہ تھی کہ پاکستان بھارت کے ساتھ اپنے تنازعات ختم کرے اور چین کے ساتھ اس کے تنازعات میں اضافہ ہو۔ لیکن بھٹو نے ان سامراجی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا اور نہ صرف برِصغیر' بلکہ پوری دنیا کی سیاست کو ایک نیا رخ دے دیا' اس منزل تک پہنچنے کے لئے داخلی اور خارجی طور پر بھٹو کو کن کن دشوار گزار مرحلوں سے گزرنا پڑا' یہ ایک الگ داستان ہے۔ خود کابینہ میں شریک ان کے ساتھیوں نے روس اور امریکہ کی طرف سے خطرناک ردِعمل حتیٰ کہ خوفناک انتقام کے حوالے دے کر انہیں اس اقدام سے باز رہنے کی تلقین کی تھی' لیکن بھٹو نے نہ صرف ایوب خاں کو اس مہم کی اثر پذیری سے بچایا بلکہ تمام نتائج و عواقب کی ذمہ داری اپنی ذات سے مخصوص کر کے' ہر قسم کے حالات کا خود شکار ہونے کی یقین دہانی بھی کرائی۔ اس معاہدے کے بعد یہ بھٹو ہی تھے جنھوں نے نہ صرف دوسری طاقتوں کو مدلّل انداز میں یہ یقین دہانی کرائی کہ چین اور پاکستان کے پُرامن تعلقات کسی دوسرے کے خلاف نہیں بلکہ قومی اسمبلی میں قوم کو بھی اس کے فوائد سے روشناس کرایا' اس کے ساتھ ہی انہوں نے دنیا پر یہ بھی واضح کر دیا کہ تنازعہ کشمیر طے کرنے کے معاملے میں صرف بھارت ہٹ دھرمی سے کام لے رہا ہے۔

1964ء کے وسط تک پاکستان' چین اور انڈونیشیا کے ساتھ بہترین دوستانہ تعلقات استوار کر چکا تھا۔ بھٹو نے افغانستان کے ساتھ بہتر تعلقات کے لئے پیش قدمی کی اور کافی حد تک اس میں کامیابی بھی حاصل ہوئی' سری لنکا کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی بنیاد ڈالی اور کشمیر میں استصواب رائے کے لئے اس کی طرف سے پاکستان کے مؤقف کی حمایت لینے میں کامیابی حاصل کی۔ اسی طرح برما کے ساتھ اچھے اور دوستانہ تعلقات کی ابتدا کی' جو مشرقی پاکستان کی موجودگی میں' ہمارے لئے حد درجہ اہم ملک تھا۔ گویا ماضی میں امریکی دُم چھلّا بننے کی وجہ سے عالمی سیاست میں ہم جس تنہائی کا شکار ہو چکے تھے' بھٹو کی سرگرم خارجہ پالیسی کی وجہ سے وہ ختم ہونے لگی اور دنیا کی قومیں ہمارے قریب آنے لگیں۔ انڈونیشیا جو ایک دوست اور مسلم ملک ہونے کے باوجود اب تک تنازعۂ کشمیر میں غیر جانبداری کا مؤقف اختیار کئے ہوئے تھا۔ بھٹو کی کوششوں سے کھُل کر پاکستان کا سرگرم حامی بن گیا۔ یہ جنوب مشرقی ایشیا میں ایک اہم موڑ تھا۔ صدر سوئیکارنو کے ساتھ بھٹو گہرے تعلقات قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

فرانس جو صدر ڈیگال کی سربراہی میں' اپنے ماضی کے سامراجی کردار کے داغ دھونے کی کوشش کر رہا تھا اور نئی پالیسیاں مرتب کر کے اپنی غلطیوں کی تلافی کر رہا تھا' مستقبل میں تیسری دنیا کے اُبھرتے ہوئے ممالک کے لئے کافی اہمیت اختیار کرنے والا تھا۔ بھٹو نے فرانس کے عالمی سیاست میں نئے کردار کا پہلے ہی سے اندازہ کر لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر فرانس کے ساتھ اچھے تعلقات استوار کرنے کے لئے پیش قدمی کی۔ جنوری 1964ء میں فرانس کے دورے پر گئے۔ جواب میں اس وقت

www.bhutto.org

کے وزیر اعظم اور بعد میں فرانس کے صدر پامیدو کی پاکستان میں میزبانی کی' فرانس کے ساتھ یہ دوستانہ تعلقات ہمارے لئے کس قدر کار آمد ثابت ہوئے اور اب تک ہو رہے ہیں' اس کے اظہار کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ خاص طور پر جوہری توانائی کے حصول میں فرانس کا نیا تعاون ہمارے لئے بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اسی سال انہوں نے سلامتی کونسل میں کشمیر کے مسئلے پر ٹھوس دلائل سے بھرپور تقریریں کر کے دنیا کے ضمیر کو جھنجھوڑا اور بھارت کے جارحانہ کردار کو پوری طرح بے نقاب کیا' یہ وہ زمانہ تھا جب بھارت نے امریکی امداد لے کر' فوجی طور پر طاقتور ہونے کے بعد ایسے اقدامات شروع کر دیئے تھے' جن کا ماضی میں وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بھٹو کو معلوم تھا کہ بھارت یہ حوصلہ کس وجہ سے کر رہا ہے؟ انہوں نے اشارے کنایوں میں دنیا کو اس کا احساس بھی دلایا' لیکن ظاہر ہے اقوام متحدہ کے اصل وڈیرے اپنی مصلحتوں کے تحت بھارت کے ہمنوا بن چکے تھے اور چین اس وقت تک اس مجلس ہی سے باہر تھا۔

خارجہ پالیسی کے معاملے میں بھٹو کا فلسفہ یہ تھا کہ بڑی طاقتوں کی باہمی کشمکش میں فریق بنے بغیر اپنے قومی مفادات کا تحفظ کرتے ہوئے ان کے ساتھ اس قسم کے تعلقات استوار کرنا چاہئیں کہ ان کی بلاوجہ مخاصمت بھی مول نہ لی جائے اور ان کے حاشیہ بردار بننے سے بھی گریز کیا جائے۔ ان کے نزدیک اس مقصد کے حصول کا ایک عملی طریقہ یہ بھی تھا کہ ترقی پذیر ممالک بالعموم اور ایک دوسرے کے ساتھ نظریاتی و جغرافیائی قربت رکھنے والے ترقی پذیر ممالک بالخصوص جہاں تک ہو سکے ایک دوسرے کے ساتھ اقتصادی' تجارتی اور ٹیکنیکی تعاون کریں' یہ تعاون عالمی سطح پر ان کی سیاسی رفاقت کی بنیاد بھی بنے گا اور وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوئے' بڑی طاقتوں کی بے جا مفاد طلبیوں کی راہ میں زیادہ موثر طور پر مزاحمت بھی کر سکیں گے۔ اسی اصول کے تحت انہوں نے ایران اور ترکی کے ساتھ مذاکرات کئے اور دونوں ملکوں کے سربراہوں کی حمایت حاصل کی' ہر چند ان دونوں برادر ملکوں کے رہنماؤں کی خواہش بھی اسی میں شامل تھی' لیکن اس تعاون کا خاکہ تیار کرنے اور اس میں رنگ بھرنے کے لئے بھٹو کی جدوجہد کم نہ تھی۔ 1964ء میں جب معاہدہ استنبول پر دستخط ہو رہے تھے تو صدر ایوب کے ساتھ یہ بھٹو ہی تھے جنھوں نے دن رات ایک کر کے تعاون کی ان نئی راہوں کو ہموار کیا یہی معاہدہ بعد میں آر سی ڈی کے نام سے مشہور ہوا اور ان تین برادر ملکوں کے تاریخی تعلقات کو نئے باہمی مفادات کی ٹھوس لڑی میں پرو کر زیادہ بھرپور اور مؤثر انداز میں روبہ عمل لایا' وہ انڈونیشیا کو بھی اس معاہدہ میں شریک کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن بہت سے ناموافق عوامل کی بنا پر انہیں اس میں کامیابی نہ ہو سکی اس کے باوجود انڈونیشیا کی معیت میں وہ عالمی محاذ پر ایک اور بڑا کارنامہ انجام دینے کی تیاریوں میں مشغول رہے۔

www.bhutto.org

"نو آبادیاتی نظام کا ڈھانچہ تہہ و بالا ہونے والا ہے۔ اب ایشیا اور افریقہ نئی توانائیوں کے ساتھ بیدار ہو رہے ہیں۔ ایشیائی قیادت کے سامنے بنیادی مسئلہ ان کی خود مختاری کو چیلنج کا مسئلہ ہے۔ مغرب میں ایشیائی قیادت کو جس روز مساوات اور برابری کی بنیاد پر تسلیم کر لیا گیا۔ اسی دن عالمی امن کے تقاضے پورے ہو جائیں گے۔"

(ذوالفقار علی بھٹو)

کشمیر کے مسئلے پر اقوام متحدہ کی بے بسی اور مظلوم قوموں کے مقابلے میں اس کی بے عملی کو دیکھتے ہوئے، بھٹو 62ء ہی میں ان خطوط پر سوچنے لگے تھے کہ بڑی قوموں کے غلبے کی وجہ سے یہ ادارہ اپنا اصل کردار ادا کرنے سے قاصر ہے۔ انہی دنوں وہ یہ بھی سوچنے لگے تھے کہ چھوٹی قومیں جو اپنے مسائل حل کرانے کے لئے اس ادارے میں جاتی ہیں، وہ اپنا مسئلہ تو حل نہیں کر پاتیں۔ اس کے برعکس بڑی طاقتیں ان تنازعات کو اپنے ہاتھ میں لے کر، فریقین کو اپنے مفادات کے تابع کرنے کی کوشش کرتی ہیں، اور اقوام متحدہ میں زیر بحث مسئلے کو حل کرنے کی بجائے اس سے کھیلنا شروع کر دیتی ہیں، اور یوں یہ ادارہ حق و انصاف کا علمبردار بننے کے بجائے بڑی طاقتوں کا وہ پنجرہ بن گیا ہے، جہاں امن اور مفاہمت کی بھوک لے کر جانے والے ملک چوہوں کی طرح پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ اس صورت حال کے تدارک اور ترقی پذیر اقوام کے باہمی تنازعات میں بڑی طاقتوں کی "مفادہ" پرستانہ دخل اندازی کو روکنے کے لئے بھٹو نے یہ منصوبہ تیار کیا کہ کیوں نہ ترقی پذیر اقوام اپنا ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کر لیں جہاں وہ خود باہمی طور پر، اپنے تنازعات، بڑی طاقتوں کی رخنہ اندازی کے بغیر حل کر سکیں۔ کیونکہ یہاں تمام ممالک ایسے ہوں گے، جن کے سامراجی مفادات موجود نہیں ہوں گے۔ لہٰذا وہ اپنے ان مفادات کے تحت تنازعات کو مزید الجھا کر اپنے سامراجی مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرنے کے بجائے متعلقہ ممالک کو برادرانہ انداز میں برابری کی سطح پر مفاہمت پر آمادہ کر لیا کریں گے اور اس طرح ترقی پذیر ممالک بے جا سامراجی دخل اندازیوں سے محفوظ رہ سکیں گے۔ 62ء کے اختتام تک بھٹو نے اس متبادل ادارے کا بنیادی خاکہ مرتب کر لیا تھا، اور 63ء میں انہوں نے تیسری دنیا کے دوسرے سرکردہ قوم پرست رہنماؤں سے اس کی عملی تشکیل کے لئے تبادلہ خیالات شروع کر دیا تھا، ان رہنماؤں میں چو این لائی سوئیکارنو، جمال عبدالناصر کے نام قابل ذکر ہیں آہستہ آہستہ ان تاریخ ساز رہنماؤں کے ساتھ مل کر بھٹو نے اس خاکے میں رنگ آمیزی کی اور اپریل 64ء میں جکارتہ میں ہونے والی افریشیائی وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں واضح طور پر ایک ایسے پلیٹ فارم کی تشکیل کے عملی پہلوؤں پر غور کیا گیا، اس کانفرنس کے روحِ رواں خود ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ اس کانفرنس میں بھٹو کی تقریروں کا موضوع یہی تھا۔

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو چین کے عظیم رہنما ماؤزے تنگ سے پیکنگ میں ملاقات کر رہے ہیں

www.bhutto.org

صدر سوئیکارنو کی گذشتہ تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے فرمایا'

"کل ہم نے صدر سوئیکارنو کی بڑی جذبہ انگیز اور حوصلہ افزا تقریر سنی ہے' انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہم ایشیا اور افریقہ کے لوگوں پر واجب ہے کہ ہم اپنے آپ کو سدھار لیں' اپنے اندر نئی زندگی اور نئی روح پیدا کریں اپنے کھوئے ہوئے وقار اور چھنی ہوئی ملکیتیں واپس لے آئیں اور اپنی تقدیر کو نئے سانچے میں ڈھال لیں' دنیا پر نئے زاویوں سے نظر ڈالیں' اور اپنے لئے نئی دنیا آباد کرنے کی غرض سے نئی منصوبہ بندیاں کریں۔ انسانی اخوت کی ایسی رسوم ڈال دیں۔ جہاں انصاف کا اس طرح بول بالا ہو کہ ہر دن اور ہر رات اس کی وسعتیں بڑھتی چلی جائیں' صدر سوئیکارنو نے انسانی سعی کی جو منزل متعین کی ہے وہ بڑی مقدس اور بلند منزل ہے اور یہی وہ منزل ہے جس کی سمت تمام بڑے مذاہب اور تمام بڑی تحریکیں رواں دواں ہوئی تھیں اور جسے انہوں نے انسان کا منتہائے مقصود قرار دیا تھا۔"

مسٹر بھٹو نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا'

"افریقہ اور ایشیا باقی دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کے قطعی آرزومند نہیں ہیں' مگر وہ ساری دنیا کی قوموں اور ساری دنیا کے لوگوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ مساوات اور برابری کی عادت ڈال لیں سارے آدمیوں کو' کالوں اور گوروں کو بھی' ایک جیسا سمجھیں ان سے مساوی اور دوستانہ سلوک کریں' کسی کو حقیر نہ جانیں' مگر افریقہ اور ایشیا اپنے مطالبات تسلیم کرنے پر مغرب کو اسی وقت مجبور کر سکتے ہیں' جب یہ اپنی باہمی دشمنیوں اور نفرتوں کو بھول جائیں اور اُخوت اور بھائی چارے کو اپنا شعار بنالیں' یہی وہ مقاصد ہیں جن کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہم دوسری افریقی ایشیائی کانفرنس منعقد کر رہے ہیں' ہم یہ چاہتے ہیں کہ سارے بنی آدم ایک جیسے ہو جائیں' اور ان میں کوئی اونچ نیچ نہ رہے۔"

بھٹو نے اپنی اس شاندار تقریر کا اختتام ان روشن الفاظ کے ساتھ کیا'

"ایشیائی اور افریقہ کے کارپرداز دنیا کو اچھی طرح باور کرا دیں کہ وہ افریقی و ایشیائی عوام کی رہنمائی میں ایک بہتر دنیا تخلیق کرنے پر پوری طرح قادر ہیں۔"

اس کانفرنس کے بعد یہ تجویز قدم بہ قدم آگے بڑھنے لگی اور 1965ء میں بھٹو اس کی عملی تشکیل کے لئے نہایت تیزی کے ساتھ سرگرم عمل ہو گئے۔ اپریل میں انڈونیشیا جا کر انہوں نے کئی دنوں تک صدر سوئیکارنو کے ساتھ تفصیلی مذاکرات کئے' ان حد درجہ خفیہ مذاکرات میں' بہت سے امور کو آخری

www.bhutto.org

شکل دے لی گئی۔ جولائی میں الجیریا گئے جہاں افریقہ وایشیا کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس ہورہی تھی' یہاں انہوں نے پوری وضاحت اور اپنے نظریات کی روشنی میں یہ تجاویز وزرائے خارجہ کے سامنے پیش کیں جو انہوں نے صدر سوئیکارنو کے ساتھ مل کر مرتب کی تھیں۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد وہ صدر ناصر سے ملنے کے لئے قاہرہ گئے' جہاں ان تجاویز کو مکمل آخری شکل دی جانے والی تھی' اس دوران بھٹو کے ان طوفانی دوروں سے سامراجی مراکز میں تشویش و تجسس کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ وہ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ مشرق کے ان حساس دارالحکومتوں میں یقیناً کوئی ایسی کھچڑی پکائی جارہی ہے جس میں سامراجیوں کے لئے زہر ملایا گیا ہو۔ ان کے جاسوسی ادارے حرکت میں آچکے تھے' اور انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ معاملہ تکمیل کے مراحل کے قریب آگیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اقوام متحدہ میں روس اور امریکہ کو ہی اصل چودھراہٹ حاصل تھی' اور اس نئی تنظیم کے قیام کی صورت میں سب سے زیادہ انہی کے مفادات کو متاثر ہونا تھا وہ محسوس کر رہے تھے کہ کہیں ایسے ادارے کے قیام کی صورت میں ترقی پذیر ممالک اپنے اتحاد و یگانگت کی قوت سے ان کے چنگل سے نجات ہی حاصل نہ کرلیں۔

بہرحال قاہرہ میں چین' انڈونیشیا' مصر اور پاکستان کے مابین اعلیٰ سطح کی کانفرنس منعقد ہوئی' پاکستان کی طرف سے بھٹو اور باقی تینوں ممالک کی طرف سے ان کے سربراہ اس تاریخی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں تقریباً یہ طے ہو گیا تھا کہ یہ چاروں ممالک مل کر ایک تنظیم قائم کریں گے جو آگے چل کر ترقی پذیر ممالک کے وسیع تر تعاون و اشتراک کا ذریعہ بنے گی۔ ان چاروں میں پاکستان ایسا ملک تھا' جس پر سب سے زیادہ امریکی دباؤ ڈالا جاسکتا تھا۔ لیکن ماضی کے تلخ تجربات کی روشنی میں ایوب خاں کو تھوڑا بہت احساس ہو چکا تھا اور میں یہاں انہیں اس بات کا کریڈٹ دوں گا کہ مغربی دباؤ کے باوجود انہوں نے اپنے جواں سال اور باہمت وزیر خارجہ کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کرنے کی کوشش نہیں کی تھی'

یہ اور بات ہے کہ بعد میں وہ مصر کا رویہ دیکھ کر اور داخلی اور خارجی دباؤ کے شدت کی وجہ سے اپنے موقف پر قائم نہ رہ سکے۔ بہرحال وہ پاکستان نہیں' مصر تھا' جو سب سے پہلے روس اور امریکہ کے مشترکہ دباؤ میں آیا۔ اس پر صدر ناصر کو الزام نہیں دیا جاسکتا۔ وہ قومی لحاظ سے نہایت نازک صورت حال سے دوچار تھے' اور ان کے انہی فوری قومی مفادات ہی نے انہیں اس مجوزہ اتحاد سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر مجبور کیا' ہرچند مصر کی علیحدگی نے اس تحریک کو کچھ ضعف پہنچایا۔ لیکن چین' پاکستان اور انڈونیشیا اب بھی استقامت کے ساتھ ایک اتحاد ثلاثہ قائم رکھنے پر متفق تھے۔ ادھر بڑی طاقتیں اس اتحاد کے خیال کو عملی شکل میں آنے سے روکنے ہی کی کوششوں تک مصروف نہ تھیں بلکہ انہوں نے منصوبہ بنالیا تھا کہ اس کے محرکوں کو ایسا سبق سکھایا جائے کہ دوبارہ کوئی سامراجی چنگل سے نکلنے کی ایسی پُرمعنی اور مؤثر کوشش نہ کرسکے۔ ایوب خاں تو اب نرم پڑ چکے تھے۔ لیکن انہوں نے ابتدائی دور میں خاموشی اختیار کر

www.bhutto.org

کے جو "جرم" کیا تھا، سامراجی اسے بھولنے کو تیار نہ تھے اور انہیں بھی سبق دینے کا ارادہ کر لیا گیا تھا۔ ستمبر 65ء میں پاکستان پر بھارت کے جارحانہ حملے کو اس پس منظر کی روشنی میں بھی دیکھا جا سکتا ہے اور یہ پس منظر اسی صورت میں مزید واضح ہو جاتا ہے جب انڈونیشیا میں صدر سوئیکار نو کے انجام اور شرق اوسط میں مصر کی اندوہناک شکست کی کڑیوں کو ملا کر دیکھا جائے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، بھارت کی چین کے خلاف "محاذ آرائی" کے بعد اب امریکہ یہ تصور کر رہا تھا کہ چین کا گھیراؤ مکمل کرنے کا یہ سنہری موقع ہے۔ اس سے پہلے تو وہ "پاک بھارت تعاون کے لئے "تنازعہ کشمیر" کے حل کی بات بھی کیا کرتا تھا۔ لیکن جب بھارت نے بھاری فوجی اور اقتصادی امداد حاصل کرنے کے بعد صاف ہی انکار کر دیا اور اُلٹا بھارت سے یہ آوازیں بھی سنائی دینے لگیں کہ "بھارت کو کشمیر کا بقیہ حصہ بھی آزاد کرا لینا چاہئے۔" تو امریکہ نے معنی خیز خاموشی اختیار کر لی اور اس نے تربیلا اور دوسرے اہم منصوبوں کی امداد میں تعطل پیدا کرا کے پاکستان پر بھرپور دباؤ ڈال کر بھی دیکھ لیا تھا۔ اس کا الٹا اثر یہ ہوا کہ پاکستان نے نہ صرف چین کے ساتھ گہرے دوستانہ تعلقات قائم کر لئے بلکہ دوسرے سامراج دشمن ایشیائی ممالک کے ساتھ مل کر دور رس نتائج کا ایک اتحاد معرض وجود میں لانے کے لئے سرگرم ہو گیا، جس میں چین کو اپنے سائز کے لحاظ سے لازماً خاص مقام حاصل ہوتا۔ ان تجربات کی روشنی میں یہ قیاس غیر مناسب نہیں کہ امریکہ خود بھی اس بات کا خواہشمند تھا کہ پاکستان کو راہ راست پر لانے کے لئے ایک زوردار جھٹکے کی ضرورت ہے۔

مقبوضہ کشمیر میں بھارت کے نئے اقدامات کے خلاف بے چینی تو پہلے ہی پھیلی ہوئی تھی اس پر درگاہ حضرت بل سے موئے مبارک کی گمشدگی نے، جلتی پر تیل کا کام کیا اور پورا مقبوضہ کشمیر سراپا احتجاج بن گیا، بھارت امریکی شہ حاصل کرنے کے بعد، اب آزاد کشمیر پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا اور اس نے جنگ بندی لائن پار کر کے بعض کلیدی اہمیت کی چوکیوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا جس کے جواب میں مجبوراً پاکستان کو جوابی اقدام کرنا پڑا۔ اس موقع پر بھی ذوالفقار علی بھٹو ہی تھے جنھوں نے بھارت کے اصل ارادوں کو بھانپ لیا تھا۔ رن کچھ میں زور آزمائی اور پاکستانی قیادت کی قوتِ فیصلہ کی کمزوری کے سبب وہاں سے پورے ایک بھارتی ڈویژن کے ذلّت آمیز شکست سے بچ جانے کے بعد شاستری نے جس اپنی پسند کے محاذ کی طرف اشارہ کیا تھا، بھٹو اس کو خوب سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ 3 ستمبر کو انہوں نے ریڈیو پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا،

> "اگر ہندوستان یہ ثابت کرنے کا خواہش مند ہے کہ تلوار سچائی سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے تو وہ بے شک اپنی موجودہ جارحیت کو جاری رکھے، مگر وہ یہ بات بالکل نہ بھولے کہ وہ اپنی اس جارحیت سے اپنی ایک ہزار سالہ قومی تاریخ کو قطعاً نہیں بدل

www.bhutto.org

سکے گا اور اس صدی کی اجتماعی قدریں 'اس کے اس جارحانہ عمل سے پامال نہ کی جا سکیں گی۔ "

اس تقریر میں انہوں نے قوم کو خبردار کیا۔

" عزیز ساتھیو اور ہم وطنو! جاگنے کی گھڑی آن پہنچی ہے' وقت ہمیں پوری قوّت سے آواز دے رہا ہے کہ ہم ان ذمہ داریوں سے عہدہ براء ہوں' جو ہم نے کشمیر کے مجاہدین کی طرف سے اپنے اوپر لے رکھی ہیں' مجاہدین کشمیر نے ہندوستان کے نو آبادیاتی شکنجے سے اپنی گردن چھڑانے کے لئے سرگرم جدوجہد شروع کر دی ہے' یہ وقت ایسا ہے کہ ہمیں اپنے جسم وجان کی ساری قوتیں اور تمام صلاحیتیں مجتمع کرنا ہوں گی اور اپنی حق پرستانہ اقدار اور جذبۂ ایمانی کو بروئے کار لانا ہو گا۔

کشمیر کے لوگوں کی مجاہدانہ جدوجہد' نو آبادیاتی تسلّط کے خلاف ایک مقدس جنگ کی حیثیت رکھتی ہے' ہم نے اس موقع پر ایک دشمن کو للکارا اور اس سے جنگ مول لی تو یہ محض پاکستان اور کشمیر کی جنگ نہ ہو گی' یہ ظلم وجبر' بربریّت وسفاکی اور جارحیت کے خلاف ہمارا جہاد ہو گا اور ہم اس جہاد کے ذریعے رہتی دنیا تک یہ حقیقت صفحۂ عالم پر نقش کر دیں کہ فتح بالآخر انصاف کے مقدر میں ہوتی ہے اور سچائی پر کبھی آنچ نہیں آتی۔ "

بھٹو جیسا کہ ان کی تقریر سے ظاہر ہے' صورت حال کے بارے میں پوری طرح واقف تھے۔ انہیں یہ بھی اندازہ بہت پہلے سے ہو چکا تھا کہ بھارتی جارحیت کی صورت میں پاکستان کا اتحادی امریکہ اس کی مدد کو نہیں آئے گا' کیونکہ وہ گذشتہ برسوں کے دوران پوری طرح بھانپ چکے تھے کہ امریکہ کا مقصد پاکستان کی خود مختاری اور آزادی کی بقا نہیں بلکہ وہ تو اسے بھارت کی سرپرستی میں دے کر چین کے خلاف کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے پیش بندی کے طور پر چین اور انڈونیشیا سے 'بغیر کسی معاہدے کے' ایسے نازک موقع پر مدد کی یقین دہانیاں حاصل کر رکھی تھیں۔ 6 ستمبر کو بھارت نے پاکستان کی بین الاقوامی سرحدوں پر حملہ کر دیا' یہ ہماری بہادر افواج اور پاکستان کے عظیم محنت کش عوام کا بے مثال عزم وعمل تھا کہ بھارت اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکا' اور بجائے اس کے وہ کسی اہم مقام پر قبضہ کرتا' ہم نے اس کا وسیع علاقہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس جنگ میں بھٹو کی وہ پیش بندیاں ہی کام آ گئیں جو وہ چین اور انڈونیشیا سے دوستانہ تعلقات بڑھانے کی صورت میں کر چکے تھے' ان دونوں ملکوں نے اس جنگ کے دوران ہماری بھرپور امداد کی' یوں محسوس ہوتا تھا جیسے حملہ صرف ہم پر نہیں بلکہ ان دونوں ملکوں پر بھی کیا گیا ہے' یہ بھی بھٹو ہی کی چند سالہ خدمات کا نتیجہ تھا کہ عالمی رائے عامہ بھارتی جارحیت کے خلاف کھل کر

www.bhutto.org

پاکستان کا ساتھ دے رہی تھی' امریکہ کی سرد مہری کے باوجود اپنے نئے دوستوں اور دوسرے برادر مسلمان ملکوں کی مدد کی وجہ سے پاکستان اس قابل تھا کہ بہتر نتیجہ حاصل کرنے کے لئے بھارت کا مزید مقابلہ کر سکتا' لیکن اندرونی محاذ پر شعیب کی سربراہی میں سامراجی لابی نے ایوب خان کا گھیراؤ کر لیا۔ چنانچہ پہلا فیصلہ یہ کیا گیا کہ سلامتی کونسل کے اجلاس میں بھٹو کے بجائے ایس' ایم' ظفر کو نمائندگی کے لئے بھیجا جائے۔ یہ پاکستان کے مفاد کے ساتھ صریحاً بے وفائی تھی اس میں ایس' ایم' ظفر کا قصور نہیں' لیکن ایسے نازک موقع پر عالمی پلیٹ فارم پر نمائندگی کے لئے وہ ابھی ناپختہ تھے' اگر جنگ بندی کی قرارداد بھی منظور کرنا تھی تو اس کا بہتر ڈرافٹ بنوانے کے لئے بھی کسی منجھے ہوئے سیاستدان اور عالمی امور کے ماہر کی ضرورت تھی بھارت ہر قیمت پر جنگ بندی کا خواہاں تھا' کیونکہ اسے دکھائی دے رہا تھا کہ اگر جنگ نے طول کھینچا تو محاذ اتنا وسیع ہو جائے گا کہ اس کے بس سے باہر ہو جائے' لیکن یہ لوگ بھارت کی پوزیشن اور بڑی طاقتوں کے مقاصد کو اس کے پورے تناظر میں دیکھنے سے قاصر تھے' وہ جانتے تھے کہ بھٹو اس مرحلے پر کشمیر میں فیصلہ کن ضرب لگانے کے خواہش مند ہیں' اگر اس وقت یہ لوگ حوصلہ قائم رکھتے اور ایوب خان متذبذب نہ ہوتے تو شاید آج برّصغیر ہی کی نہیں بلکہ ایشیا کی تاریخ کسی اور سمت میں آگے بڑھ رہی ہوتی۔ ادھر بھارت ہی نہیں روس اور امریکہ بھی دونوں کسی نئی خوفناک صورت حال پیدا ہونے کے خوف سے جلد از جلد جنگ بندی کے خواہاں تھے' یہی وجہ تھی کہ سلامتی کونسل میں پاکستان کی نمائندگی کے لئے وفد کے سربراہ کا انتخاب کرتے وقت شدید رازداری سے کام لیا گیا اور جب قرارداد مرتّب کر لی گئی اور توہین آمیز انداز میں اسے پاکستانی عوام پر مسلّط کرنے کا منصوبہ بن گیا تو پاکستانی عوام کے متوقع ردِّ عمل کے خوف سے فوری طور پر بھٹو سے کہا گیا کہ وہ اقوام متحدہ جائیں' اندر ہی اندر فیصلے ہو چکے تھے اور بھٹو سے کہا جا رہا تھا کہ ہم نے ذلّت و رسوائی کے ساتھ جس بازی کو ہارا ہے تم اپنی جادوگری کے ساتھ اسے باوقار بنا دو۔

جنگ بندی کی قرارداد مرتب کی جا چکی تھی' اصل بڑی طاقتوں کو خوب اچھی طرح معلوم تھا کہ پاکستانی حکومت ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر چکی ہے' اور غالباً بھٹو کو بھی اس کا اندازہ ہو چکا تھا۔ لیکن ملک صرف حکمرانوں پر مشتمل نہیں ہوتے' قومیں صرف برسراقتدار گروہوں کا نام بھی نہیں' اصل ملک اور اصل قوم وہاں کے عوام ہوتے ہیں' بھٹو نے ان نامساعد حالات کے باوجود اپنے وطن کے عوام کی نمائندگی کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ وہ ہارے ہوئے حکمرانوں کے نمائندے بن کر گئے لیکن برسرِپیکار فوجوں اور عوام کے نمائندے بن کر انہوں نے عالمی محاذ پر چومکھی لڑائی چھیڑ دی۔ ہر دشمن اور ہر سامراجی طاقت پر عقاب بن کر جھپٹے۔ سلامتی کونسل میں یادگار تاریخی تقریر کرنے والے ذوالفقار علی بھٹو ایوب خان کے نمائندے نہیں' پاکستانی عوام کے نمائندے تھے۔ دنیا بھر کے مظلوم عوام کے نمائندے تھے۔ یہ تقریر اور اس کا اختتام دونوں بھٹو کے اس ناقابل فراموش کردار کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی اصل تقریر ایوب

www.bhutto.org

خاں کے نمائندے کی نہیں' پاکستانی عوام کے نمائندے کی تقریر تھی' اس تقریر کے دوران بھٹو کی آنکھوں سے چھلکنے والے آنسو' استحصالی نظام کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ان بہادر اور دلیر عوام کی بے بسی کی نمائندگی کر رہے تھے' جو آزادی اور خود مختاری کی خواہش کے باوجود اپنے حکمران طبقوں اور ان کے آقاؤں کی کرفت کے سامنے بے بس تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تقریر کا ایک ایک لفظ آج بھی گیارہ سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود پاکستان کے ایک ایک فرد کے دل پر نقش ہے۔ تقریر کے دوران بھٹو اپنے عوام کے نمائندے تھے۔ لہٰذا اس کا ایک ایک لفظ جذبے اور خلوص کا مرقع تھا اور جنگ بندی کی قرارداد منظور کرنے والے بھٹو' ایوب خاں کے نمائندہ تھے اور آپ کو یاد ہو گا کہ عوام کی نمائندگی سے جب وہ حکومتی سطح پر ایوب خاں کی نمائندگی کی طرف آئے تو انہوں نے اسلام آباد سے موصول ہونے والے تار کا حوالہ دے کر ایوب خاں کی طرف سے جنگ بندی کی قرارداد منظور کرنے کا اعلان کرتے ہوئے' اپنی ذات کو اس فیصلے سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ علیحدہ کر لیا تھا۔ اس پس منظر کی روشنی میں بھٹو کی وہ تاریخی تقریر اور جنگ بندی قبول کرنے کے درمیان اس نمایاں فرق کو اگر آپ دوبارہ دیکھیں تو اس تقریر کی معنویت پوری طرح نمایاں ہو جائے گی۔ بھٹو کی سیاست کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا از حد ضروری ہے کہ وہ ایک پیدائشی قائد تھے۔ کسی عوامی یا عالمی پلیٹ فارم پر ان کی کوئی حرکت' کوئی ادا' کوئی جیسچر مفہوم سے خالی نہیں ہوتا تھا وہ جہاز کی سیڑھیاں چڑھتے اترتے وقت بھی جس انداز میں قدم اٹھاتے تھے' ان میں بھی مفہوم ہوتا تھا۔ انہیں ہر وقت اس بات کا احساس رہتا تھا کہ وہ ایک ذات نہیں' اپنی قوم کی علامت ہیں اور انہوں نے اپنے وجود اور عادات کو پوری طرح اس علامت میں ڈھال لیا تھا۔ لہٰذا کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ بھٹو صاحب کوئی بات اچانک یا جذباتی موڈ میں کر جاتے تھے۔ وہ بڑے زیرک سیاستدان تھے' جہاں وہ اظہار کے لئے لفظوں کو مناسب نہ سمجھتے وہاں ان کے ماتھے کی شکنوں سے لے کر ہاتھ اٹھانے اور ہلانے کے انداز تک ہر حرکت ایک ذریعہ اظہار بن جاتی۔ اس کا اندازہ آپ اس واقعے سے بخوبی کر سکتے ہیں کہ انتخابات کے بعد ایک ملاقات میں یحییٰ خاں نے ماچس کو ہاتھ میں اٹھا کر میز پر رکھتے ہوئے کہا تھا کہ "کیا کسی کا اقتدار سے ہٹنا اتنا ہی آسان ہے؟" یحییٰ خاں کے ماچس رکھنے کا انداز' اپنی بات پر زور دینے کا غماز تھا۔ بھٹو نے آہستگی کے ساتھ ماچس کو خود اٹھا کر یحییٰ خاں کی طرف واپس رکھتے ہوئے جواب دیا تھا "اس سے زیادہ آسان ہے" ' یہاں مفہوم لفظوں میں نہیں' صرف ماچس کو واپس رکھنے کے انداز میں ہے۔ جو لیڈر پرائیویٹ مذاکرات میں اس قدر محتاط ہو' اس کی عوامی یا عالمی سطح پر سامنے آنے والی کوئی حرکت خالی از معنی نہیں ہو سکتی اور سلامتی کونسل کی وہ مذکورہ بالا تقریر تو ایک تاریخ ساز لمحے میں کی جا رہی تھی۔ میرے اندازوں کے مطابق بھٹو نے باقاعدہ شعوری طور پر اصل تقریر اور جنگ بندی قبول کرنے کے فیصلے کے اعلان کو واضح طور پر پاکستان کے عوام کے جذبات اور حکمرانوں کے ان عوامی جذبات

www.bhutto.org

کے برعکس فیصلے کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا اور اس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ وہ تقریر آج بھی پاکستانی عوام کی حسین ترین یادوں کا حصّہ ہے اور اس فیصلے کا اعلان بدترین یادوں کا۔ جنگ بندی کی قرارداد منظور کرنے کا "سرکاری اعلان" کرنے کے بعد میں بھٹو نیویارک میں جب تک مقیم رہے پاکستانی عوام کے حقیقی جذبات کی نمائندگی کا حق ادا کرتے رہے۔

تین اکتوبر کو وہ اسلام آباد واپس تشریف لائے۔ ایوب خاں سے پے در پے ملاقاتیں کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے رہے کہ جنگ بندی کی قرارداد منظور کرنے کے باوجود' اگر اب بھی وہ مضبوط مؤقف اختیار کر لیں تو بھارت کے ساتھ آبرومندانہ اور باوقار سمجھوتے کی گنجائش موجود ہے۔ انہوں نے بھٹو سے کہا "اگر تم اپنے بیان کردہ نتائج حاصل کر سکتے ہو تو کوشش کر دیکھو۔"

بھٹو کا اصل مرتب کردہ نقشہ' حکومت کی کم ہمتی کی وجہ سے بگڑ چکا تھا' فیصلہ کن لمحہ گزر چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مایوسیوں کے اس ملبے سے تعمیر کے بچے کھچے ٹکڑے جمع کرنے کی ایک دُھندلی سی امید باقی تھی۔ اس وقت پاکستان کی پوری قوم کی تمنائیں سمٹ کر ایک بھٹو کے وجود میں مجتمع ہو چکی تھیں' یہ شعلہ رواں' اپنے مرکز سے ذرا سا امید افزا اشارہ پا کر' ان ٹکڑوں کو سمیٹنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ بھٹو کے حاصل کردہ دوستوں میں اگر کچھ نے کھل کر پاکستان کا ساتھ دیا تھا تو کچھ نے اپنے عالمی مفادات کے باوجود حقیقت پسندانہ روّیہ اختیار کیا تھا۔ یہ معقول روّیہ اختیار کرنے والوں میں فرانس سرفہرست تھا' چنانچہ 8 اکتوبر کو سیدھے فرانس پہنچے' وہاں کے وزیر خارجہ سے ملاقات کی' پریس سے رابطہ قائم کیا اور دوران جنگ فرانس کے کردار کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے' اس کے موقف کی انصاف پسندی کو مزید تقویت دینے کی کوشش کی۔ واپس جا کر' روس کے وزیر خارجہ گرومیکو سے مذاکرات کئے اور دوسرے دن سیکرٹری جنرل اوتھان سے ملاقات کر کے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ 15 اکتوبر کو یہ مسئلہ جنرل اسمبلی کے اجلاس میں پیش کیا جائے' جنرل اسمبلی میں تو دو بڑوں کی ملی بھگت کے سامنے کسی اور کی چل نہیں سکتی تھی۔ لیکن جنرل اسمبلی میں جہاں ترقی پذیر اقوام کی اکثریت ہے' مسئلہ پیش کرنے سے بھٹو کا مقصد یہ تھا کہ ان طاقتوں اور خود بھارت پر عالمی رائے عامہ کا دباؤ ڈالا جائے۔ اس اجلاس میں بھارت کو اپنی پوزیشن کی وضاحت کرنا پڑی' لیکن بعد میں جناب بھٹو کی تقریر نے ماحول کو یکسر بدل دیا' انہوں نے مدلّل انداز میں بھارتی نمائندے کی ایک ایک بات کو رد کیا' ان کی یہ تقریر ماحول کے اعتبار سے پہلی دونوں تقریروں سے مختلف تھی جو انہوں نے 22 اور 28 ستمبر کو کی تھیں' اس وقت جنگ کے اثرات نمایاں طور پر سامنے تھے اور بھارت کی شکست کے واقعات تازہ تھے۔ لیکن ڈھائی ہفتوں کے اس وقفے میں روس کی بھرپور سرپرستی کی وجہ سے بھارت یہ تاثر زائل کر کے اپنی پوزیشن بحال کر رہا تھا' اس تقریر نے بھارت کی ان کوششوں کو ناکام کیا اور عالمی پریس کے نمائندوں کو جو سینکڑوں کی تعداد میں وہاں جمع تھے' اپنے مؤقف سے ماضی کے

www.bhutto.org

ماسکو (سوویت یونین) کے ہوائی اڈے پر جنرل کارڈ آف آنرز کا معائنہ کر رہے ہیں۔

www.bhutto.org

مقابلے میں زیادہ قریب کر لیا۔ جنگ بندی کے بعد بھارت نے پھر دھمکی آمیز رویہ اختیار کر لیا تھا' جو جنگ بندی اور صلح جوئی کے جذبے کے بالکل خلاف تھا۔ یہ اطلاعات موصول ہونے پر جناب بھٹو نے سلامتی کونسل کے صدر سے ہنگامی اجلاس طلب کرنے کی درخواست کی۔

سلامتی کونسل کے اجلاس میں 25 اکتوبر 1965ء کی یہ تقریر بھی حد درجہ اہمیت کی حامل ہے۔ اسی تقریر کے دوران بھارتی نمائندے سردار سورن سنگھ کو راہِ فرار اختیار کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نظر نہیں آیا تھا۔ اس تقریر میں انہوں نے بڑی طاقتوں کے دباؤ میں آکر شتر روی اختیار کرنے والی اقوام متحدہ سے علیحدگی کی دھمکی دے کر' اقوام عالم کو صورت حال کی نزاکت کا احساس دلایا تھا' وہ زیادہ زور اس بات پر دے رہے تھے کہ جموں و کشمیر کے اصل تنازعے کے حل کے لئے بھارت سے کسی قسم کی یقین دہانی حاصل کی جائے' اور یہ فضاوہ پیدا کر چکے تھے۔ بیشتر ممالک کے نمائندوں نے اپنی تقاریر میں اس امر پر زور دیا' بھٹو نے تاریخ وار اور مستند حوالوں کے ساتھ بھارت کی بد عہدیوں کی طویل داستان سنا کر اسے ننگا کر کے رکھ دیا تھا' ان بھرپور دلائل اور بھٹو کے پُر خلوص اندازِ بیان کے سامنے بھارت سوائے بار بار احتجاج کے اور کچھ بھی نہ کر سکا اقوام متحدہ میں ان کی اس مجاہدانہ جدوجہد کو پاکستان کے عوام گہرے جذبات اور توجہ کے ساتھ دیکھ رہے تھے' انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ یہ جدوجہد تنہا بھٹو کر رہے ہیں اور اسلام آباد کی طرف سے انہیں مکمل تائید نہیں دی جا رہی' 30 اکتوبر کو دیال سنگھ کالج لاہور میں مختلف سیاسی رہنماؤں نے ایک جلسہ کر کے جناب بھٹو کے نعرے دہرائے اور متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی کہ ملک بھر کے عوام اس منصفانہ جدوجہد میں ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ ہیں' اور پھر پورا ہال ذوالفقار علی بھٹو زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا' ریڈیو پر ان کی تقاریر سنوائی جاتیں تو سڑکوں پر ہجوم جمع ہو جاتے' ہر چند کہ یہ تقریریں انگریزی میں تھیں' جو عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں' لیکن عوام جناب بھٹو کے لہجے کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ کر کے مناسب مواقع پر نعرے بلند کرتے تھے' قائداعظمؒ کے بعد یہ مقبولیت کسی اور رہنما کو حاصل نہ ہوئی تھی کہ اس کی انگریزی تقریر بھی عوام اس توجہ اور ذوق و شوق کے ساتھ سنتے اس طویل جدوجہد کے نتیجے میں سلامتی کونسل کو وہ قرارداد منظور کرنا پڑی جس میں دونوں ممالک کے بنیادی جھگڑے کا ذکر تھا' اور یوں انہوں نے پاکستان کو چاروں شانے چت گرنے سے بچا لیا۔ ورنہ بھارت تو روس اور امریکہ کی بھرپور مدد مل جانے کی وجہ سے وہ اس پوزیشن میں آچکا تھا کہ اصل تنازعے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ خود بھٹو اس قرارداد سے مطمئن نہ تھے۔ لیکن جن حالات میں وہ یہ قرارداد منظور کرانے میں کامیاب ہوئے' ان کی روشنی میں اس فردِ واحد کا کارنامہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

جنگ ستمبر کے دوران امریکہ نے جو کردار ادا کیا تھا' پاکستانی عوام کے جذبات اس پر کافی مشتعل تھے۔ لہٰذا وہ ایسی پوزیشن میں نہیں تھا کہ ثالث کا کردار ادا کر سکے۔ روس کو سپر پاور کا انداز اپنا چکا تھا۔

www.bhutto.org

لیکن عالمی سطح پر ابھی اس کی امن اور اصول پسندی کا بھرم قائم تھا۔ یہی وجہ تھی جب اس نے اپنی سرزمین پر دونوں ممالک کے سربراہوں کو مذاکرات کی دعوت دی تو پاکستان نے اسے قبول کر لیا۔ بھٹو کو اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ ماضی میں روس کے ساتھ ہمارے تعلقات میں جو سرد مہری رہی ہے اور اقوام متحدہ میں روس نے ہمیشہ بھارتی مؤقف کا ساتھ دے کر جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے 'اس کی روشنی میں روس سے کوئی خاص امید وابستہ نہیں کی جا سکتی۔ لیکن دوسری طرف وہ توقع کر رہے تھے کہ روس ایک ایسے اہم معاملے میں پہلی بار ثالث کا کردار ادا کر رہا ہے' ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی عالمی پوزیشن کے خیال سے اور امن و اصول پسندی کے نعروں کی لاج رکھنے کے لئے نسبتاً انصاف پسندانہ مؤقف اختیار کرے۔ اس توقع میں وہ اس لئے حق بجانب تھے کہ نیویارک میں روسی وزیر خارجہ سے ملاقات کے دوران انہوں نے پاکستان کا مؤقف پیش کیا تو مسٹر گرومیکو نے معقول طریقے سے اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا تھا۔ ہر چند انہوں نے کوئی واضح بات نہ کی۔ لیکن کوئی ایسا اشارہ بھی نہ دیا جس سے روس کی مکمل جانبداری کا احساس ہوتا۔ اسی طرح پیرس میں ملاقات کے دوران بھی روسی وزیر خارجہ نے روس کے اصل عزائم کو کامیابی کے ساتھ چھپایا۔

نہ صرف ان ملاقاتوں سے اخذ کردہ تاثر جناب بھٹو کی امیدوں کا باعث تھا۔ بلکہ وہ روس کی دوستی حاصل کرنے کے لئے ٹھوس بنیادیں تلاش کرنے میں بھی مصروف تھے۔ ان کی مخلصانہ کوشش تھی کہ ماضی میں اس عظیم ہمسایہ طاقت کے ساتھ جو سرد مہری رہی ہے 'اسے پگھلانے کی راہ تلاش کی جا سکے۔ 21 نومبر کو جب وہ ماسکو گئے تو انہیں یہی امید تھی کہ وہ روس کے ساتھ مفاہمت کے ایک نئے جذبے سے 'جو خارجی حالات کی روشنی میں ناگزیر ہو چکا تھا کام لے کر اس کی انصاف پسندانہ ہمدردیاں حاصل کر لیں گے۔ لیکن وہاں معاملہ مختلف تھا۔ پاکستان کے امریکی کیمپ میں چلے جانے کی وجہ سے روس کے تعصبات کافی گہرے چلے گئے تھے 'سیٹو اور سینٹو کے معاہدے اسے سوشلسٹ ملکوں کے مخالف کیمپ کا باقاعدہ رکن بنا چکے تھے اس لئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ سب کچھ پہلے ہی سے طے کر لیا گیا تھا۔ ماسکو میں بھٹو نے کوسیجن اور دوسرے رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں۔ ان ملاقاتوں کے دوران وہ دونوں سربراہوں کے باہمی مذاکرات کی بنیادیں تلاش کرتے رہے اور روسی رہنماؤں نے بھی یہی تاثر دیا کہ جیسے بھارت فی الحال مذاکرات پر آمادہ نہیں۔ لیکن حقائق کسی اور امر کی نشاندہی کر رہے تھے اور ادھر ماسکو میں یہ خبر ریلیز کر دی گئی کہ گذشتہ روز بھارتی سفیر نے کوسیجن سے ملاقات کی اور شاستری کی طرف سے ایک بند لفافہ انہیں دیا۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ مذاکرات کا منصوبہ بھارت کو پوری طرح اعتماد میں لے کر تیار کیا جا چکا تھا۔ لیکن پاکستان کے وزیر خارجہ کار جان اور ان کی قوم پرستی کو دیکھتے ہوئے انہیں اصل حقائق سے بے خبر اور معاملات سے دور رکھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

www.bhutto.org

بھٹو اپنے انداز میں روس سے غیر جانبدارانہ کردار کی توقع رکھے ہوئے تھے۔ کمیونسٹ بلاک سے مفاہمت اور بہتر تعلقات کی خاطر انہوں نے ماسکو سے رومانیہ اور یوگوسلاویکیہ کی طرف رخ کیا۔ تاکہ روس کے حلیف ممالک کو بھی پاکستان کے مؤقف سے اچھی طرح آگاہ کیا جاسکے اور تاشقند کانفرنس سے قبل ان کی حمایت کے ذریعے روس کے رہنماؤں کو ان کی نظریاتی اصول پسندی پر قائم رہنے کے لئے آمادہ کیا جاسکے ان کی یہ کوششیں صحیح سمت پر صحیح قدم تھیں۔ لازمی نہیں تھا کہ پاکستان کے ماضی کے رویّے کے پیش نظر روس جو کچھ پہلے طے کر چکا تھا' اس پر کاربند رہتا۔ قوموں کے فیصلے اپنے قومی مفادات کے تحت متاثر بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ اگر روس پاکستان کی ان کوششوں کا جائزہ لے کر جو مفاہمت کی خاطر بھٹو کر رہے تھے' یہ یقین کر سکتا کہ پاکستان ان کوششوں میں مخلص ہے اور بھٹو کی سوچ پاکستانی قیادت کی مجموعی سوچ ہے' اور اس کے ساتھ تعلقات کو نئے انداز میں شروع کر کے وہ اپنی عالمی پالیسیوں میں زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے' تو عین ممکن تھا کہ روس کا رویّہ اگر ہمدردانہ نہیں تو انصاف پسندانہ ضرور ہو جاتا۔

لیکن ادھر اسلام آباد میں دوسری ہی سازشیں کی جارہی تھیں۔ پاکستان میں سامراجی مفادات کا آلہ کار گروہ' بھٹو کی ان کوششوں کو' اپنے قومی مفادات کے پس منظر میں دیکھنے کے بجائے اپنے آقاؤں کے عالمی مفادات کی روشنی میں دیکھ رہا تھا۔ بھٹو روس اور اس کے حلیف ممالک میں' ماضی کی تلخیاں دور کر کے اور پاکستان کی امن پسندی اور غیر جانبداری کی پالیسی کی وضاحت کر کے' اپنے ملک کے لئے' بہتر جذبات پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اسلام آباد میں ایوب خاں کے دورۂ امریکہ و برطانیہ کی تفصیلات طے ہو رہی تھیں۔ حالانکہ جس وقت بھٹو ماسکو روانہ ہوئے تھے' اس وقت اس دورے کا کوئی حتمی پروگرام زیر بحث نہیں آیا تھا۔ یہ گویا بھٹو کی کوششوں کو سبوتاژ کرنے کی چال تھی۔

برطانیہ اور امریکہ کے اس دورے سے دو نتائج بر آمد ہوئے۔ ایک طرف تو کمیونسٹ بلاک کے اس خیال کو تقویت ملی کہ پاکستان اب بھی مغربی ممالک کا دم چھلا ہے اور کمیونسٹ ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرنے میں اس کی کوششیں محض موقع پرستانہ ہیں اور دوسرے اس دورے کے دوران' جناب بھٹو کی پوزیشن بھی متاثر ہوئی۔

بھٹو نے سوویت روس کے ساتھ براہ راست دوطرفہ تعلقات کی بنیاد پر جو حیثیت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی' ایوب خاں نے "براستہ نیویارک" جاکر' اس پر پانی پھیر دیا تھا۔ انہوں نے پاکستان کو دو بڑی طاقتوں کی باہمی سودے بازی کے لئے کھلونا بنا کر ان کے ہاتھ میں دے دیا تھا اور اس سودے بازی میں قیمت پاکستان کو چکانا تھی اور فائدے ان دونوں بڑی طاقتوں کو اٹھانا تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ اقدامات بھٹو کو پس منظر میں دھکیلے بغیر نہیں کئے جاسکتے تھے۔ لہٰذا 15 اور 17 دسمبر کے دوران ہونے والے ان مذاکرات میں بھٹو کو شریک نہیں کیا گیا۔

www.bhutto.org

بھٹو روس میں ہونے والے معاہدۂ تاشقند کے خلاف تھے' وہ چاہتے تھے کہ کشمیر کے مسئلہ پر قربانیوں کی جو لہر چلی ہے اس کے نتیجے میں کشمیر کو آزاد کرالیا جائے ان کی اس خواہش میں جمہور کے جذبوں کا عکس تھا مگر ظاہر ہے اصل فیصلہ تو صدر ایوب خان کو کرنا تھا بھٹو صاحب اختلاف کے باوجود اس معاہدے کے رستے میں رکاوٹ پیدا نہ کر سکے۔

چین معاہدۂ تاشقند کے عمل سے الگ تھلگ رہا تھا' بھٹو نے اس عظیم دوست کی خفگی دور کرنے کے لئے چینی رہنماؤں لیو شاؤ چی اور چن ژی کو دورۂ پاکستان کی دعوت دی۔ پاکستان میں ان رہنماؤں کا فقید المثال خیر مقدم کیا گیا۔ خصوصاً لاہور میں عوام کا والہانہ جوش و جذبہ قابل دید تھا۔ جواب میں چینی رہنماؤں نے' ستر کروڑ عظیم عوام کی پُرعزم حمایت کا اعادہ کر کے عوام کے جوش و جذبے کو مزید گہرا کر دیا تھا۔ بھٹو اپنا کام کر چکے تھے۔ اس دورے کے ذریعے ایک مرتبہ پھر سامراجیوں کو عملی طور پر دکھایا گیا تھا کہ پاکستان میں چین کے لئے کس قدر دوستانہ اور پُر محبت جذبات پائے جاتے ہیں۔

اسی اثناء میں ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا سیشن ہوا' بھٹو نے قومی اسمبلی میں اپوزیشن کے حملوں کے بالمقابل ایک مرتبہ پھر صدر ایوب خان کو اپنی پارلیمانی مہارت کی کمک بہم پہنچائی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں نہ صرف پُرزور انداز میں چین اور انڈونیشیا کا شکریہ ادا کیا بلکہ مسئلہ کشمیر کو ایکبار پھر پورے زور و شور کے ساتھ اٹھایا۔ درحقیقت وہ الفاظ کے ذریعے معاہدہ تاشقند کا دفاع کر رہے تھے مگر معنی و مفہوم میں اس کی دھجیاں اُڑا رہے تھے۔

اپریل 66ء میں وہ سیٹو اور آر سی ڈی کے اجلاس میں شرکت کے لئے پرواز کر گئے۔ ان دونوں اجلاسوں میں انہوں نے مؤثر انداز میں اپنے وطن کی نمائندگی کی' خصوصاً سیٹو کے اجلاس میں بھٹو نے دوران جنگ اس کے کمزور کردار پر ڈپلومیسی کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے پاکستان کے جذبات کا بھی اظہار کیا اور بعد کو جاری ہونے والے اعلامیے میں مسئلہ کشمیر کا شامل ہونا محض ان کی ذاتی فتح تھی۔ اس اعلامیے میں بھارت اور پاکستان کے مابین تصادم پر ناپسندیدگی کے اظہار کا جو پیراگراف تھا۔ بھٹو نے اس کی تعبیریوں کی۔

"کیوں کہ اعلامیے میں بھارت کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ کونسل بھارت کو جارح تصور کرتی ہے۔"

آر سی ڈی کے اجلاس میں شرکت کے بعد وہ انڈونیشیا کا دورہ مکمل کر کے واپس وطن تشریف لائے تو اس وقت ایوب خاں فیصلہ کر چکے تھے کہ اب بھٹو کی حکومت سے علیحدگی کا موقع آ گیا ہے۔ ان کے استعفے تو پہلے ہی سے موجود تھے۔ لیکن صدر ایوب علیحدگی پر تیار ہونے کے باوجود یہ حوصلہ نہ کر پائے کہ بھٹو کی علیحدگی کا اعلان کیا جائے۔ وہ عوام کے متوقع ردّ عمل سے خائف تھے۔ چنانچہ پہلے ان کی طویل طبی

www.bhutto.org

چھٹی کا اعلان شائع کیا گیا اور اس کے بعد عوام کے جذبات کو مشتعل ہونے سے روکنے کے لئے اگلے روز ایوب خان کی طرف سے نہ صرف اپنے وزیر خارجہ کی شاندار خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ بلکہ یہ یقین دہانی بھی کرائی گئی کہ موجودہ خارجہ پالیسی میں تبدیلی نہیں کی جائے گی۔

17 جون کی رات کو ایوب خاں کے ساتھ اڑھائی گھنٹے تک ان کی جو تلخ و ترش گفتگو ہوئی اس کا ماحصل یہی تھا کہ ایوب خاں کی دھمکیوں اور ترغیب انگیزیوں کے جواب میں بھٹو نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ سیاست میں نہیں آئیں گے۔ انہیں فرانس میں سفیر بنانے کی پیشکش کی گئی۔ انڈسٹری لگانے کے لئے کہا گیا اور جب یہ تمام حربے ناکام ہو گئے تو ایوب خاں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اچھا تو پھر ملک سے باہر چلے جاؤ' میں کل ہی تمام انتظامات مکمل کر دیتا ہوں۔" ذوالفقار علی بھٹو کا جواب یہ تھا۔

"میں ان وزیروں میں سے نہیں جو آپ کی نظر بدلتے دیکھ کر چپ چاپ بستر باندھ کے چل دیتے ہیں۔ میں اپنے دوست احباب سے ملاقات کروں گا اور پھر اطمینان سے سفر پر روانہ ہوں گا۔"

اور یہ سفر انہوں نے بذریعہ ریل شروع کیا' حکومت کی طرف سے اعلان ہو رہا تھا کہ بھٹو علاج کے لئے ملک سے باہر جا رہے ہیں اور "بیمار" بھٹو ہوائی جہاز کا آرام دہ سفر اختیار کرنے کے بجائے بذریعہ ریل سفر کر رہے تھے ان پر "عتابِ شاہی" نازل ہو چکا تھا۔ موقع پرستوں کی بھیڑ چھٹ چکی تھی' راولپنڈی کے خاموش ریلوے اسٹیشن پر مستقبل کے قائد عوام کو الوداع کہنے کے لئے صرف دو افراد آئے تھے جن میں سے ایک غلام مصطفےٰ کھر تھے اور دوسرے غلام مصطفےٰ جتوئی' لیکن خاموشی سے شروع کیا گیا یہ سفر اپنے انجام سے پہلے ہی طوفان کی ایک پہلی لہر اور عوام کے ایک نئے سفر کی علامت بن گیا۔ ہر چند کہ اس سفر کا کوئی اعلان نہیں کیا گیا تھا کوئی منادی نہ کی گئی تھی لیکن لاہور کے جیالے عوام مستقبل کی جدوجہد کا اعلان کرنے کے لئے تیار کھڑے تھے' دو لاکھ سے زیادہ پُرجوش اور عزم و عمل کے جذبات سے سرشار افراد نے لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر اپنے نوجوان قائد کا عظیم الشان استقبال کیا۔ عوام کے جوش اور جذبے کو دیکھتے ہوئے بھٹو کا یہ عقیدہ اور بھی پختہ ہو گیا کہ پاکستان کے عوام سامراج دشمن ہیں انہیں بلند ہوتے ہوئے نعروں میں انقلاب کی گونج سنائی دے رہی تھی وہ یقین کر چکے تھے کہ عوام ایک طویل جدوجہد کے لئے تیار ہیں اور اس جدوجہد کی قیادت کے لئے وہ صرف ان کی طرف دیکھ رہے ہیں' یہ سوچ کر ان کی آنکھوں میں خوشی اور احساس ذمہ داری کی شدت سے آنسو چھلک آئے اور انہوں نے اپنے دل میں اس عہد کو تازہ کیا کہ وہ ضرور عوام کی قیادت کریں گے۔

بعد میں ملتان' کوٹری سکھر' کراچی اور لاڑکانہ میں بھی عوام نے ان کے ایسے ہی پُرتپاک استقبال کئے' ظاہر ہے ان شاندار استقبالیوں نے حکمرانوں کے ہوش اڑا دیئے اور انہوں نے کوشش شروع کر دی

www.bhutto.org

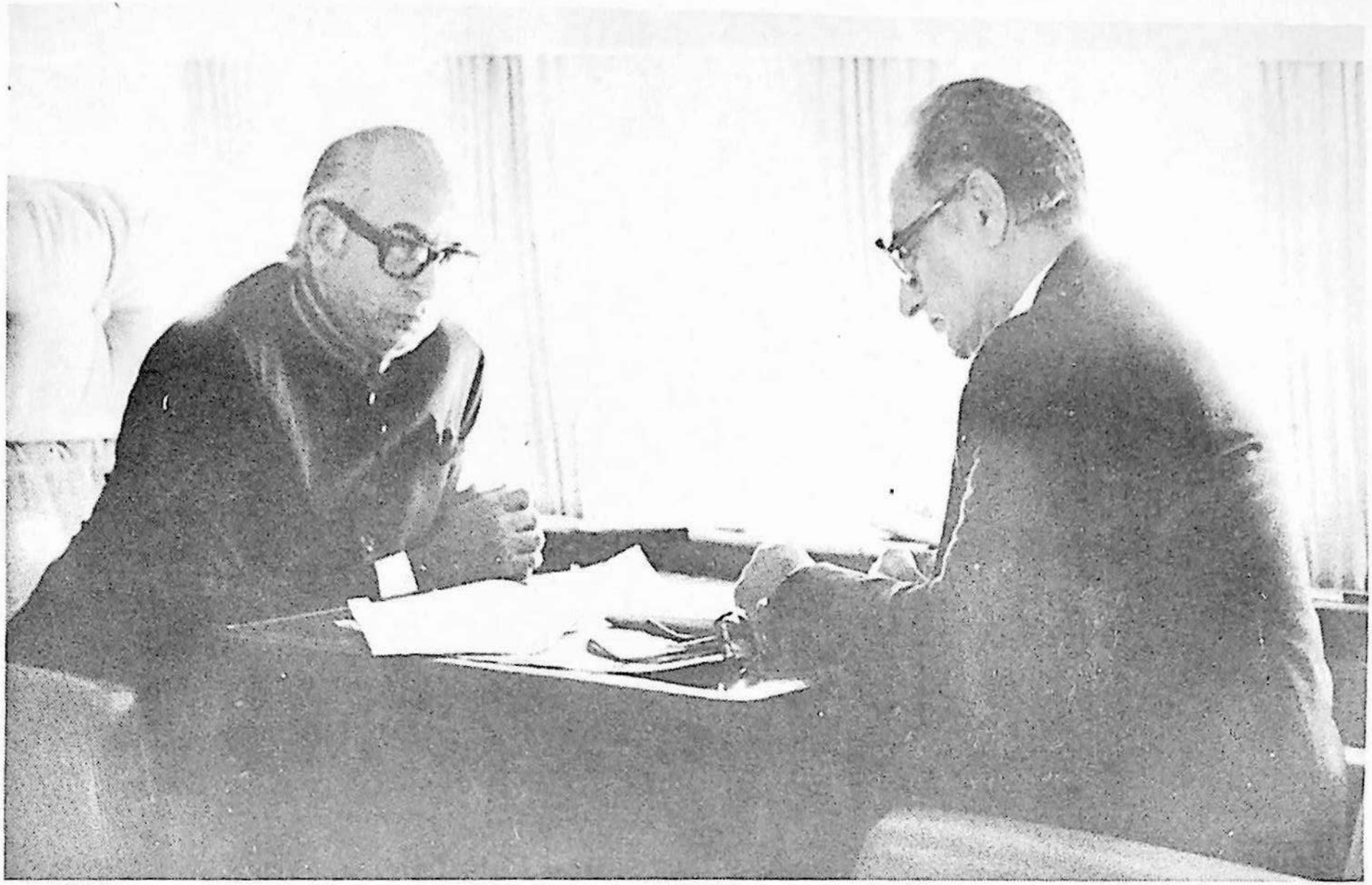

شہنشاہ ایران اور بھٹو گفتگو کر رہے ہیں

www.bhutto.org

کہ بھٹو کے متوقع ساتھیوں کی ترغیب و تحریص اور دھمکیوں کے ذریعے ان سے دور کر دیا جائے۔

عوامی طاقت کے اس ابتدائی اظہار اور اپنی مقبولیت کا یہ مظاہرہ دکھا کر بھٹو نے بیرونی سفر کی تیاریاں شروع کر دیں اسی دوران انہیں مصر کے مرحوم صدر جمال عبدالناصر کا تار موصول ہوا جس میں انہوں نے لکھا تھا۔

"آپ نے ایشیا اور افریقہ کے عوام کی جو قابل قدر خدمات انجام دی ہیں میں ان کی تہہ دل سے قدر کرتا ہوں میں آپ کے خیالات و نظریات کا مداح ہوں آپ میری دعوت قبول فرمائیں اور مصر میں آکر قیام کریں' ہم آپ کی میزبانی کرنے میں فخر محسوس کریں گے۔"

جناب بھٹو آرام یا گوشہ نشینی کے خواہاں ہوتے تو یہ دعوت ان کے لئے ایک اچھا بہانہ تھی مگر انہیں تو کام کرنا تھا ساتھ ہی وہ دوستوں کو کسی آزمائش میں بھی نہیں ڈالنا چاہتے تھے انہوں نے اس تار کے جواب میں صدر ناصر کو لکھا۔

"میری حکومت میرے خلاف ہے' میری اس طرح میزبانی کرنے سے ممکن ہے وہ کوئی غلط تاثر نہ لے۔

اس پر صدر ناصر نے جواب دیا۔

"مجھے پرواہ نہیں میں ایک قوم پرست کے لئے ہر چیلنج کا مقابلہ کر سکتا ہوں"

چنانچہ بھٹو نے اپنے بیرونی دورہ کا آغاز کر دیا اس دورے کے دوران انہوں نے ہر جگہ عالمی و قومی امور پر اظہار خیال کیا اور ان سرگرمیوں کے ذریعے اہل وطن کو اپنی "بیماری" کی اطلاع دیتے رہے واپسی تک وہ طے کر چکے تھے کہ اب عملاً سیاست میں حصّہ لینے کا وقت آگیا ہے اب خواہ کسی بھی قسم کے خطرات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے وہ عوام کے جذبات کی ترجمانی کریں گے اور یا تو اس جدوجہد کو کامیابی سے ہم کنار کریں گے ورنہ اپنی جان قربان کر دیں گے اور اس دور میں ایوب خان کے بالمقابل سیاست میں حصّہ لینے کا مطلب بھی یہی کچھ ہوا کرتا تھا۔

www.bhutto.org

باب ششم

بھٹو اور برٹرینڈرسل

یوں تو جناب ذوالفقار علی بھٹو کی عظیم انقلابی جدوجہد نے دنیا بھر کے ترقی پسند عوام اور قیادتوں کو بھرپور انداز میں متاثر کیا ہے۔ لیکن اس صدی کے عظیم مفکر' انسانیت دوست فلسفہ داں اور مصنف آنجہانی لارڈ برٹرینڈرسل تو ان کے کارناموں اور دانشمندی کے گرویدہ تھے۔ انہوں نے پاکستان کی بدلتی ہوئی خارجہ پالیسی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ نوجوان بھٹو کو اپنے انقلابی نظریات پر عمل کرنے کے لئے کیسے کیسے دباؤ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ داخلی اور خارجی طور پر ان کے خلاف کیا کیا سازشیں کی گئیں؟ بھٹو ان کے ذاتی دوستوں میں شامل تھے' ان کی زندگی میں وہ جب بھی برطانیہ گئے' انہوں نے لارڈ رسل سے مل کر دنیا میں انسانیت کو درپیش مسائل پر کئی کئی گھنٹوں تک تبادلہ خیال کیا' دنیا کا یہ عظیم مفکر نوجوان انقلابی قائد بھٹو کی صلاحیتوں' انسانیت کے لئے ان کے مقدس جذبات اور مدبرانہ طرز فکر سے بہت متاثر تھا۔ موجودہ عہد کے سیاست دانوں میں ذوالفقار علی بھٹو وہ واحد رہنما تھے جو اس بات پر فخر کر سکتے ہیں کہ رسل جیسے عظیم مفکر نے ان کی ذات پر ہمیشہ غیر متزلزل اعتماد کا اظہار کیا۔ وہ بھٹو کو ایسا سیاست دان قرار دیتے تھے جس کی دیانت' صداقت اور ترغیب و تحریص سے بے نیازی تمام شکوک و شبہات سے بالاتر تھی۔ وہ جانتے تھے کہ بھٹو کی ذات میں وہ تمام خوبیاں پنہاں ہیں جو تیسری دنیا کے ترقی پسند عوام کی قیادت کا اعزاز حاصل کرنے کے لئے ناگزیر ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن جب یہ نعرہ لگایا کرتے تھے کہ .....

فخرِ ایشیا ذوالفقار علی بھٹو ..... زندہ باد

تو یہ نعرہ محض ان کے جذبات عقیدت و محبت ہی کا آئینہ دار نہیں تھا بلکہ اس کو لارڈ رسل جیسے عظیم مفکر و

www.bhutto.org

فلسفی کی دانشمندانہ تائید بھی حاصل تھی۔ سنہ 1966ء کے اوائل میں جب سامراجی سازشوں کے نتیجے میں بھٹو کو وزارت خارجہ سے علیحدہ ہونا پڑا تو لارڈ برٹرینڈرسل کو شدید صدمہ پہنچا۔ لیکن انہیں پاکستانی عوام کے انقلابی شعور اور بھٹو کی قائدانہ صلاحیتوں اور خلوص پر پورا بھروسہ تھا اور وہ بڑے یقین کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ بھٹو لازمی طور پر دوبارہ اقتدار میں آئیں گے اور دنیا نے دیکھ لیا کہ اس بوڑھے فلسفی کی یہ پیش گوئی چند ہی برسوں بعد پوری ہو گئی۔ وزارت خارجہ سے بھٹو کی علیحدگی کے بعد لارڈرسل نے دنیا کے متعدد رہنماؤں اور شخصیات کو جو خطوط لکھے وہ اس امر کے شاہد ہیں کہ رسل اس علیحدگی کے پس منظر میں کارفرما سامراجی سازشوں سے پوری طرح باخبر تھے۔ لارڈرسل کی جناب بھٹو کے ساتھ محبت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ مغربی پریس میں ان پر کوئی تنقید کی جاتی تھی تو رسل اپنے قلم سے اس کا منہ توڑ جواب دیتے۔ یہاں لارڈ برٹرینڈرسل کے ایسے چند خطوط کا مطالعہ بے محل نہ ہو گا۔ جو انہوں نے دنیا کے مختلف رہنماؤں اور ایڈیٹروں کو بھٹو کے بارے میں لکھے:

برما کے جنرل نی ون کے نام

13 راگست سنہ 1966ء

ڈیئر جنرل نی ون

یہ مکتوب تحریر کرنے سے میرا مقصد تحسین کے ان جذبات کا اظہار ہے جو میں آپ کی آزادانہ پالیسیوں کے لئے رکھتا ہوں۔ آپ کو اپنی آزادانہ روش برقرار رکھنے اور ایشیائی استحکام کی خاطر جو لازمی دباؤ برداشت کرنا پڑ رہا ہو گا۔ مجھے اس کی شدت کا بخوبی اندازہ ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ صحیح راستے پر جا رہے ہیں۔ جس کا منطقی نتیجہ برما کی ترقی کی صورت میں برآمد ہو گا۔

ذوالفقار علی بھٹو سے معلوم ہوا کہ آپ لندن میں تھے۔ وہ بھی آپ کو ایشیا کا ایک عظیم لیڈر قرار دیتے ہیں اور ان کی رائے سے میرے ذاتی تاثرات کو تقویت ملی۔ اگر آپ سے ملاقات ممکن ہو اور ہمیں اہم موضوعات پر تبادلہ خیال کا موقعہ میسر آئے تو مجھے مسرت ہو گی۔ مجھے نکرومہ، صدر سوئیکارنو اور ذوالفقار علی بھٹو جیسے سچے قوم پرست اور ترقی پسند رہنماؤں پر امریکی دباؤ سے شدید تشویش ہے۔

برما کے معاملات میں آپ کی رہنمائی افریشیائی ممالک کے لئے مرکز امید ہے۔

تمام تر بہترین تمناؤں کے ساتھ

مخلص

برٹرینڈرسل

www.bhutto.org

83 Victoria Drive
London SW18

13 August, 1966.

Dear General Ne Win,

I write to express my support and admiration for your policy of independence, for I am aware of the pressures which it has been necessary to resist in order to take Burma on a course of independence and the development of the Afro-Asian world. I am confident that Burma is on a correct course and that this will aid decisively the development of Burma.

Zulfiqar Bhutto mentioned that you were in London and expressed to me his own admiration for your as a great Asian leader. This has reinforced my own view. I should be glad if it were possible for us to meet at some time to discuss many important matters. I am alarmed by the pressure exercised by the United States against genuine nationalists and progressive leaders such as Kwame Nkrumah, President Soekarno and Zulfiqar Bhutto. Your own guidance of Burma's affairs remains a source of hope for the peoples of Africa and Asia.

With all good wishes.

Yours sincerely,

Sd/-
Bertrand Russell

www.bhutto.org

سپکٹیٹر کے ایڈیٹر کے نام

15/ اگست 1966ء

محترمی ایڈیٹر سپکٹیٹر

سر!

حالیہ تبدیلیوں کا وقوف رکھنے والے اچھی طرح محسوس کر رہے ہیں کہ مغرب کی مفاد پرستانہ سیاست عوام کی امنگوں سے ہم آہنگ قائدین کو اپنا اولین نشانہ انتقام بنانا چاہتی ہے۔ جو افریشیائی استحکام اور خود مختارانہ ترقی کی پالیسیوں کے خالق ہیں۔ اس سلسلے میں نت نئے حربے استعمال ہو رہے ہیں۔ مثلاً گھانا میں صدر نکرومہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے کئی ڈرامے کھیلے گئے۔ انڈونیشیا میں بائیں بازو کے فرضی انقلاب کے اندیشے کا ہوا کھڑا کر کے دائیں بازو کی فوجی بغاوت کا جواز فراہم کیا گیا جب کہ فی الواقعہ اقتدار حاصل کرنے کے سلسلے میں کسی ایک گلی یا کوچے میں بائیں بازو کے لوگوں کا کوئی اجتماع نہ ہوا تھا۔ اس طرح پاکستان میں ایک ایسی شخصیت کو جو خود مختار خارجہ پالیسی کے معمار کے طور پر پہچانی جاتی ہے۔ وزارت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ صدر ایوب اور ان کے وزیر خارجہ کے باہمی گہرے تعلقات کو افواہوں اور اشتعال آمیز بدگمانیوں کے ذریعے خراب کر دیا گیا۔ یہاں ان اسباب کا تجزیہ بے محل نہ ہو گا جن کی بناء پر مسٹر بھٹو کو ہدف عناد بننا پڑا۔ بھٹو صاحب وہ پہلے لیڈر تھے جنھوں نے نہر سویز کے مشرق میں بنائی جانے والی (سامراجی) پالیسیوں کو بے نقاب کر کے رکھ دیا اور ہر موقع پر ان کے خلاف نفرت و حقارت سے بھرپور تقریریں کیں۔ وہ جناح اور ایوب کی قائم کردہ روایات کے سلسلے کی ہی کڑی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پس پردہ امریکی سازشوں نے انہیں اقتدار سے علیحدہ کر دیا۔ امریکیوں کا یہ فعل اس ڈرامے کا آغاز ہے جو دوسرے ملکوں میں کھیل چکے ہیں۔ پاکستان نے اپنی نئی خود مختار خارجہ پالیسی سے جو مقام حاصل کر لیا ہے۔ اگرچہ اس حرکت سے اس کی نفی نہیں ہوئی۔ مگر پھر بھی ذوالفقار علی بھٹو کا یوں ہٹا دیا جانا اس ملک کے مستقبل کے لئے ایک عظیم خطرہ ہے۔

www.bhutto.org

15 August, 1966.

To the Editor of the Spectator

Sir:

Those alert to recent developments cannot fail to note that leaders most identified with the aspirations of their people and, indeed, most articulate of the necessity for Afro-Asian solidarity and independent development have been the first victims of attack from Western interests. There are various ways in which this has been done. In Ghana, a series of plots culminated in the overthrow of President Nkrumah's Government. In Indonesia, a trumped-up plot from the Left, which was so transparently unreal that not even one demonstration in the streets took place in support of the Left's supposed bid for power, provided the pretext for a Right-wing armed coup. In Pakistan, the figure most closely identified with the creation of an independent foreign policy for Pakistan has been removed from office.

The intimate relation between President Ayub and his former Foreign Secretary, Zulfiqar Ali Bhutto, has been disrupted through insistent rumour and provocation. It is worth examining why Mr. Bhutto earned this enmity. He was the first to expose the policies of East of Suez and to speak out passionately against them at every opportunity. In the Pakistani context, he is in the direct tradition of Jinnah and Ayub and has been pushed out by U.S. machinations behind the scenes. In so doing, the United States has begun the process witnessed in many other countries. Although the cancellation of the gains Pakistan has made since her independent course was charted has not been completed, the removal of Bhutto is a grave blow to the future of that country.

It may not seem apparent to many why so much importance should be attached to this now, but unless people in the West are alert to the criminal folly of their

www.bhutto.org

بظاہر یہ عجیب سا محسوس ہوتا ہے کہ اس معمولی سی بات کو اتنی اہمیت کیوں دی جائے۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ مغرب کے عوام کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کی حکومتیں ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں کیا کھیل کھیل رہی ہیں۔ جب تک یہاں کے عوام اپنی حکومتوں کو ایسی حرکات سے باز رہنے پر مجبور نہ کریں گے' اس وقت تک ایشیا اور افریقہ کے عوام میں یورپ کے عوام کے خلاف جو نفرت پائی جاتی ہے وہ کبھی ختم نہ ہو گی۔

آپ کا مخلص
(برٹرینڈ رسل)

www.bhutto.org

governments the hatred of the peoples of Africa and Asia for the peoples of Europe, who allow their governments to practise such cruel oppression, will be unending.

Yours faithfully,

Sd/-
Bertrand Russell

www.bhutto.org

صدر ناصر کے نام

13/ اگست 1966ء

ڈیئر پریذیڈنٹ ناصر!

میں نے امریکہ کی ان کوششوں کو بڑی تشویش کے ساتھ دیکھا ہے جو وہ ایسے رہنماؤں کو تباہ کرنے کے لئے کرتا رہتا ہے' جو بیرونی لٹیروں اور مغربی ملکوں کے دباؤ کی مزاحمت کرتے ہوئے اپنے عوام کے مفادات کو آگے بڑھانے کی سعی کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ آپ بخوبی واقف ہیں کہ گھانا اور انڈونیشیا میں یہ سازشیں ہو چکی ہیں اور اگر آپ پوری طرح باخبر نہ ہوتے تو یہی کچھ متحدّہ عرب جمہوریہ میں ہو سکتا تھا۔

حال ہی میں امریکہ اور برطانیہ نے ذوالفقار علی بھٹو کو وزارت خارجہ سے علیحدہ کرانے کے لئے زبردست دباؤ سے کام لیا۔ مسٹر بھٹو بلاشبہ پاکستان کی آزادانہ خارجہ پالیسی کے معمار ہیں۔ مسٹر بھٹو نے تن تنہا افریقی و ایشیائی استحکام کے لئے جدوجہد کی اور متحدہ عرب جمہوریہ کے ساتھ تعلقات میں اضافے کے لئے کئی خطرات مول لئے' باوجود اس کے کہ ایران کے ساتھ ناخوشگواری ہوئی اور انہیں اس راہ سے ہٹانے کے لئے ان پر بے پناہ دباؤ بھی ڈالا جاتا رہا۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان میں واقعات ایسا رخ اختیار کریں گے کہ بھٹو دوبارہ اقتدار میں آجائیں۔ مجھے یقین ہے کہ امریکی سامراج کے ان حربوں کو جاننے والے تمام رہنما' جو یہ سامراجی تیسری دنیا افریقی و ایشیائی ملک کے حقیقی مفادات کا تحفظ کرنے والے لیڈروں کو تباہ کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں' ایک دوسرے کی مدد پر بھروسہ کریں گے اور بحرانوں کے زمانے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ ایسی باہمی ہمدردی اور استحکام افریقہ' ایشیا اور لاطینی امریکہ کے عوام کے بہترین مفادات کے لئے ناگزیر ہے۔

آپ مجھے اپنے ملک کا دوست تصوّر کر سکتے ہیں اور میری طرف سے آپ اور آپ کے عوام کے لئے گرمجوشی سے مبارک باد۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

آپ کا مخلص

(برٹرینڈ رسل)

www.bhutto.org

13 August, 1966.

President Gamal Abdel Nasser,
Cairo,
United Arab Republic.

Dear President Nasser,

I have watched with some alarm the attempts on the part of the United States to destroy all those leaders who seek to promote the true interests of their people in resistance to the pressures of foreign exploiters and Western capital. This process has occured, as I am sure you are well aware, in Ghana, Indonesia and, but for your vigilance, it would have occurred in the United Arab Republic.

Recently, terrible pressure applied by the United States and Britain has led to the removal from the Foreign Secretaryship of Zulfiqar Bhutto who, without doubt, was the architect of a truly independent policy for Pakistan. Mr. Bhutto pursued single.mindedly Afro-Asian solidarity and took many risks to improve relation with the United Arab Republic, despite strains with Iran and concerted pressure upon him to desist from this course. I believe that events in Pakistan will return him to power, but I hope all those who are aware of the ways in which American imperialism seeks to destroy those who act in the true interests of the Afro-Asian countries and the Third World will rally to each other's support in times of crisis, for such common feeling and solidarity is essential to the best interests of the peoples of Africa, Asia and Latin America.

You may consider me a friend of your country and I send my warmest greetings to you and your people.

With good wishes,

Yours sincerely,

Bertrand Russell

www.bhutto.org

صدر بومدین کے نام

13/ اگست 1966ء

ڈیئر پریذیڈنٹ بومدین

افریقہ' ایشیا اور لاطینی امریکہ کے ملکوں میں قومی آزادی اور سماجی ترقی کے مقصد کے لئے میں نے جو کام کیا ہے' آپ اس سے آگاہ ہوں گے۔ ترقی پذیر ممالک کی اُمنگوں کے خلاف مغربی ملکوں اور امریکہ کی سازشیں' منصوبے اور کوششیں تشویش ناک ہیں۔ ہم گھانا اور انڈونیشیا جیسے ملکوں میں ان کوششوں کو کامیابی سے ہمکنار دیکھ چکے ہیں۔

حال ہی میں پاکستان میں بھی اسی قسم کی ایک واقعاتی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ میری مراد جناب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت سے علیحدگی ہے۔ جو آزادانہ خارجہ پالیسی اور افریشیائی استحکام کے معمار تھے۔ انہوں نے پاکستان کو نو آبادیاتی ممالک کی صفوں سے نکال کر' ایشیا اور افریقہ کے ان ممالک کی صف میں نمایاں طور پر لا کھڑا کیا جو آزادانہ پالیسی کے بارے میں پوری طرح واضح ہے اور غیر متزلزل ہیں۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ پاکستان کو الجیریا کے قریب لانے کے لئے مسٹر بھٹو نے بہت اہم اقدامات کئے۔ وہ جانتے تھے کہ پاکستان اور الجیریا کے مقاصد اور مقدر مشترک ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کوششوں کو تقویت دینا آپ کے لئے ممکن ہو گا۔ پاکستان کی آزادی و خود مختاری کے لئے ان کا اصولی مؤقف اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ دوبارہ اقتدار میں آئیں گے۔

میں آپ کی حکومت کے ساتھ گہرے تعلقات کا خواہش مند ہوں' جیسا کہ میں اپنے گذشتہ خطوط اور ذاتی نمائندے مسٹر اخدار ابراہیمی کے ساتھ کچھ عرصہ قبل قاہرہ میں ہونے والی گفتگو کے دوران واضح کر چکا ہوں۔

آپ اور آپ کے عوام کے لئے بہترین تمناؤں کے ساتھ

آپ کا مخلص

(برٹرینڈ رسل)

www.bhutto.org

13 August, 1966.

President Houari Boumedienne,
Algiers,
Algeria.

Dear President Boum$dienne,

You will know of my earnest support for the cause of national independence and social advance in the countries of Africa, Asia and Latin America. The attempts on the part of Western capital and of the United States to plot and manoeuvre against the aspirations of the developing countries are a source of great concern. We have watched the attempts of the Americans meet with success in countries such as Ghana and Indonesia.

Most recently, a similar development seems to have occured in Pakistan. I am concerned about the removal of Zulfiqar Bhutto, who was the architect of a foreign policy of independence and Afro-Asian solidarity, removing Pakistan from the ranks of neo-colonial states and bringing her to the forefront of those countries in Africa and Asia most clear and vigorous in their independent policy. I know personally that Mr. Bhutto had taken important steps to bring Pakistan close to Algeria, with whom he felt common cause and a common destiny I hope that you will find it possible to support his efforts, for it is likely that his principled stand in support of Pakistani independence will result in his return.

I remain desirous of close relations with your Government, as I outlined in earlier letters to you and as my personal representative, Mr. Ralph Schoenman, made clear in his talks with Akhdar Ibrahimi not long ago in Cairo.

With all good wishes to you and your people.

Yours sincerely,

Sd/-

Bertrand Russell

www.bhutto.org

صدر سوئیکارنو کے نام

13 ر اگست 1966ء

ڈیئر پریذیڈنٹ سوئیکارنو !

میں یہ خط اس دباؤ پر اظہار ناپسندیدی کے لئے لکھ رہا ہوں جو سچے قومی رہنماؤں کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے میں گھانا میں رونما ہونے والے واقعات کے سلسلے کو بڑی تشویش سے دیکھتا رہا ہوں۔ علاوہ ازیں آپ کی اپنی قیادت کے خلاف بنائے جانے والے منصوبوں کو بھی' اسی قسم کے جذبات کا اظہار جناب ذوالفقار علی بھٹو نے بھی کیا' جن کے ساتھ حال ہی میں میرا رابطہ رہا ہے۔ انہوں نے آپ کے متعلق اپنی بے پناہ پسندیدگی کے بارے میں بتایا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے' میں انڈونیشیا کی خود مختاری کے لئے آپ کی مضبوط اور آزادانہ پالیسی کا خیر مقدم کرتا ہوں اور آپ کے اس جرأت مندانہ فیصلے کا بھی' جس کے تحت آپ نے اقوام متحدہ سے علیحدگی اختیار کی۔ میں چین کے ساتھ آپ کی دوستی اور سامراجی دشمن انقلابات کے لئے آپ کی تائید و حمائت کا بھی مداح ہوں۔

قومی وقار و ترقی کی خاطر آپ اور افریقی و ایشیائی عوام کے لئے یہ خصوصیات ناگزیر ہیں' جیسے مسٹر بھٹو نئی تبدیلی کے رہنما ہیں۔ اس راہ میں کسی بھی تکالیف کا مقابلہ کرنا پڑے لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ جن پالیسیوں کے لئے آپ اور آپ ایسے دیگر رہنماؤں نے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی ہیں وہ خود عوام کی بھرپور تائید کی وجہ سے برقرار رہیں گی۔

تمام تر نیک تمناؤں کے ساتھ

(ذاتی نمائندہ برٹرینڈرسل)

www.bhutto.org

13 August, 1966.

President Aehmed Soekarno,
Djakarta,
Indonesia.

Dear President Soekarno,

I write to express apprehension about the pressures which are being brought to bear against truly national leaders. I have watched with alarm the course of events in Ghana and also the plots against your own leadership. In the same regard Mr. Zulfiqar Bhutto, with whom I have recently been in contact, expressed to me his own deeply felt admiration for you. For my part, I truly welcome your vigorous and independent policy of independence of Indonesia and the courageous decisions which involved your withdrawal from the United Nations, your friendship with China and your support for the anti-colonial revolution.

These are the qualities essential to the dignity and progress of the Afro-Asian people's and you, like Bhutto, are a leader of that development. Whatever set backs there may be, I feel certain that with the following of the people themselves the policies to which you and others have devoted your lives will prevail.

With all good wishes,

Yours sincerely,

Ralph Schoenman

www.bhutto.org

روسی وزیر خارجہ گرومیکو کے نام

13 راگست 1966ء

ڈیئر مسٹر گرومیکو

میں بڑی تشویش کے ساتھ اس دباؤ کا جائزہ لے رہا ہوں جو امریکہ کی طرف سے ایسے قوم پرست رہنماؤں پر ڈالا جاتا رہا ہے جو اپنی قومی آزادی اور ملک کے حقیقی مفادات کے لئے کام کرتے ہیں اس دباؤ کو صدر نکرومہ اور پیٹرس لومبا ایسے رہنماؤں پر جس طرح استعمال کیا گیا' اس کو ہم پوری طرح بے نقاب دیکھ سکتے ہیں۔

بالکل اسی انداز میں پاکستان کے وزیر خارجہ جناب ذوالفقار علی بھٹو کو وزارت خارجہ سے الگ کیا گیا ہے' میں جانتا ہوں کہ جناب بھٹو پاکستان کی آزادانہ خارجہ پالیسی اور سنہ 1960ء کے پاک سوویت آئل ایگریمنٹ کے خالق ہیں' پاکستان اور سوویت یونین میں دوستانہ تعلقات کے لئے جناب بھٹو کی پیش عملی ایک نہایت ہی اہم قدم تھا' جس کے باعث پاکستان امریکی پالیسیوں کی غلامی سے نکل گیا۔ مجھے سوویت یونین کے ساتھ پاکستان کے دوستانہ تعلقات کے ساتھ ساتھ چین کے ساتھ پاکستان کے دوستانہ تعلقات میں کسی قسم کی غیر موزونیت یا قباحت نظر نہیں آتی۔

تمام تر نیک تمناؤں کے ساتھ

آپ کا مخلص

(برٹرینڈ رسل)

www.bhutto.org

13 August, 1966.

Mr. Andrei A. Gromyko,
Ministry of Foreign Affairs,
Moscow,
U.S.S.R.

Dear Mr. Gromyko,

I have watched with great alarm the pressures that the United States has exerted on national leaders working for the true interests of their countries and in support of their national independence. We have seen only too clearly how this pressure has operated against such leaders as President Nkrumah and Patrice Lumumba.

In this same pattern lies the removal of Zulfiqar Bhutto as Foreign Minister of Pakistan. I know Mr. Bhutto is the architect of an independent Pakistani policy and the author of the Pakistani Soviet oil agreemen. of 1960. The initiative in promoting friendly relations between Pakistan and the Soviet Union was an important step in ending the consider no incompatibility in a friendly relation between Pakistan and the Soviet Union and Pakistan and China.

With good wishes,

Yours sincerely,

Bertrand Russell

www.bhutto.org

اُردشیر ازاہدی کے نام

17 ، اگست 1966ء

ڈیئر مسٹر زاہدی !

میں توجہ کے ساتھ ان مثبت اقدامات کا جائزہ لیتا رہا ہوں جو آپ کی حکومت نے مشرقی یورپ کے ساتھ تعلقات بڑھانے اور خود مختاری کی بنیادوں پر ترقی کرنے کے سلسلے میں کئے ہیں۔ امریکی امداد سے نجات حاصل کئے بغیر اقتصادی ترقی ناممکن ہے۔ اس قسم کے انحصار سے بچنا ہی دانشمندی ہے۔

مسٹر بھٹو جن سے میں کافی عرصہ سے تبادلۂ خیالات کر رہا ہوں اور جن کی آراء کی میں بے حد قدر کرتا ہوں انہوں نے آپ کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ آپ کو ایک ایسا انسان تصوّر کرتے ہیں جو روشن خیال اور اپنے ملک کے لئے حقیقی ترقی پسندانہ سوچ رکھتا ہے۔ میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ ویلز تشریف لا کر ملاقات کا موقع فراہم کریں۔ ایران کی خارجہ پالیسی میں جو نئی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ' ان کا باعث آپ ہی جیسے توانائی سے پُر نوجوان ہیں۔ جو ناقابل خرید ہیں اور اپنے ملکی مفادات کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ آپ کی ذات پر جناب بھٹو کا اعتماد میرے لئے بہت مفہوم رکھتا ہے۔ آپ کی صاف گوئی کا ریکارڈ اور ایران کی آزادانہ خارجہ پالیسی میں حالیہ تبدیلیاں ' جن میں زرعی اصلاحات اور اقتصادیات میں نئے اقدامات شامل ہیں ' زیادہ استحکام اور ترقی کی ضمانت دیتے ہیں۔ جو قابل ستائش امر ہے۔

چین اور سوویت کے ساتھ تعلقات بڑھانے کے سلسلے میں آپ کی حکومت کی توقعات اور وہ توانائی جو آپ کے ملکی امور میں آ گئی ہے آپ ایران کی سفارت کے ذریعے ' برطانیہ میں اس کی صحیح نمائندگی کر سکیں گے۔ آپ کے ساتھ مختلف اہم امور پر تبادلہ خیال کے لئے میں موقع کا منتظر ہوں۔

تمام تر نیک تمناؤں کے ساتھ

آپ کا مخلص

(برٹرینڈ رسل)

www.bhutto.org

17 August, 1966.

His Excellency Mr. Adeshir Zahedi,
Embassy of Iran,
50 Kensington Court,
London, W.8.

Dear Mr. Zahedi,

I have watched with attention the positive steps undertaken by your Government towards improving relations with Eastern Europe and the development of a course based on self-reliance. It is not feasible to develop the economy except through independence of American aid and the moving away from such dependence is a wise policy.

Mr. Bhutto, with whom I have been in communication over a considerable period and whose opinions are valued by me, spoke very highly of you. He regards you as a man who is enlightened and who has a genuine progressive vision for his country. I should be pleased of an opportunity to see you in Wales. New development in foreign policy in Iran are undoubtedly owing to the efforts of dynamic young men such as yourself, who are cognizant of the needs of their country and are incorruptible. Mr. Bhutto's confidence in you means much to me. I am impressed by your record of frankness and firm support for the principled position of an independent policy for Iran. Recent developments in the foreign policy of your country, combined with land reform and a new buoyancy in economic conditions suggests greater stability and progress, which are welcome.

I am impressed with your plans for the improvement of relations with China and with the Soviet Union, With the hopes of your Government for land reform and the new dynamic you have brought to the affairs of your country through your representation of Iran in Britain. I look forward to the opportunity of discussing many matters of importance with you.

With all good wishes,

Yours Sincerely,

Sd/-
Bertrand Russell

www.bhutto.org

چینی ناظم الامور مقیم لندن کے نام

13 ر اگست 1966ء

شینگ شیانگ

میں نے ویت نام کی ہولناک ظالمانہ جنگ میں امریکی سامراج کے بڑھتے ہوئے وحشیانہ پن کا بڑے غور سے جائزہ لیا ہے۔ آپ جانتے ہوں گے میں جنگی جرائم کا ٹریبونل تشکیل دینے کے لئے بڑی سرگرمی سے کام کرتا رہا ہوں۔ میری شدید خواہش ہے کہ اس سلسلے میں مجھے عوامی چین کا تعاون حاصل ہو۔ بہت سے ایسے امور ہیں جن پر گفتگو کا موقع مل سکے تو مجھے مسرت ہوگی۔ اگر آپ کے لئے ویلز آنا ممکن ہو سکے تو میں بہت ممنون ہوں گا۔ اگر یہ مشکل ہے تو پھر لندن میں میرے سیکرٹری کے ساتھ ملاقات کا وقت نکال لیجئے۔

میں نے دنیا میں رونما ہونے والے بہت سے دوسرے واقعات کا بھی بغور جائزہ لیا ہے۔ امریکہ اور اس کے حواری مختلف ذرائع استعمال کر کے دنیا بھر میں ہر ترقی پسند اور خود مختار قوت کو کچلنے کے لئے جوڑ توڑ کر رہے ہیں۔ اس طریقے سے وہ گھانا' انڈونیشیا اور پاکستان میں اپنے جوہر دکھا چکے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کے لئے یہ ممکن ہو گا کہ سیاسی طور پر جناب ذوالفقار علی بھٹو کی مدد جاری رکھ سکیں۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو ہی تھے جو چین کے ساتھ دوستانہ تعلقات اور ترقی پسند انسانیت کے مقصد کو آگے بڑھانے کی پالیسی روبہ عمل لائے۔ میں یہ جاننے کا معقول جواز رکھتا ہوں کہ انہوں نے چین کے ساتھ دوستی کی پالیسی مرتب کرنے کے لئے سخت جدوجہد کی' اپنے مالی فوائد کے خاطر' امریکی مفادات کی خدمت کرنے والے عناصر اس پالیسی کی بُری طرح مخالفت کر رہے تھے۔ مجھے یقین ہے پاکستان میں حالات ایسا رخ اختیار کر رہے ہیں کہ بھٹو ایک بار پھر برسر اقتدار آئیں گے۔ ایوب کے کردار نے عوام کو مایوس کر دیا ہے اور یہ صاف دکھائی دے رہا ہے کہ اب وہ پوری طرح امریکی اثرات میں آچکا ہے۔ وہ تیز رفتاری اس امر کی شاہد ہے جو اس نے پالیسی تبدیل کرنے میں

www.bhutto.org

13 August, 1966.

His Excellency Mr. Hsiung Hsiang-hui,
Office of the Charge d'Affairs
of the People's Republic of China,
4o Portland Place,
London, W.1.

Dear Mr. Hsiung,

I have watched with great concern the increasing brazenness of U.S. imperialism in its terrible war of atrocity in Vietnam. You will know that I have been preparing actively a War crimes Tribunal and I desire very much the support of People's China in this undertaking. There are many matters I should be glad of an opportunity to discuss. I should be pleased if it were possible for you to come to Wales or, should this prove difficult, if you would be able to see my secretary in London.

I have watched other events in the world with great concern. Through various devices, the United States and those who support her are manoeuvring to destroy every progressive and independent force in the world. They have acted in this way in Indonesia, in Ghana and in Pakistan. I hope that you will find it possible to continue to support Zulfiqar Bhutto politically, as he was responsible for initiating a policy of friendliness to People's China and to the cause of progressive mankind. Bhutto, as I have reason to know, struggled to achieve a policy of friendship with China, a policy which was opposed bitterly by those who wished to serve American interests for financial gain. I am confident that factors in Pakistan will be such as to return Bhutto to power. The role of Ayub has disappointed many people and it would appear that he is now under the complete influence of the United States, as may be witnessed by the rapidity with which he has changed policy. This change approaches betrayal, but I think the return of Bhutto is a prospect not far aff and I think that People's China has an opportunity to advance that end by continuing to stand by him.

www.bhutto.org

دکھائی ہے' یہ تبدیلی دغابازی کی حدود کو چھوڑ رہی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ بھٹو کی اقتدار میں واپسی کوئی دور کی بات نہیں۔ میرے نزدیک عوامی چین کے لئے یہ اچھا موقع ہے کہ وہ بھٹو کا ساتھ دیتے ہوئے اس امکان کو آگے بڑھائے۔

مجھے امید ہے کہ یہ خیالات پیکنگ میں حکام تک پہنچا دیئے جائیں گے۔ ہرچند یہ محض تاثرات ہیں لیکن یہ بڑی ٹھوس بنیادوں پر قائم کئے گئے ہیں۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

آپ کا مخلص

(برٹرینڈرسل)

www.bhutto.org

I hope these views can be passed on to your authorities in Peking. They are impressions, but ones which are strongly held.

With good wishes,

Yours sincerely,

Bertrand Russell

www.bhutto.org

پاکستان کے سیکرٹری امور خارجہ ایس ایم یوسف کے نام

31/ اگست 1966ء

ڈیئر مسٹر یوسف

میں یہ خط آپ کو مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ اپنی ایک حالیہ ملاقات کے بارے میں بتانے کے لئے لکھ رہا ہوں۔ مسٹر بھٹو میرے دیرینہ دوست ہی نہیں بلکہ ان لوگوں میں ہیں جن کی ذات پر میں مکمل اعتماد رکھتا ہوں۔ انہوں نے آپ کے متعلق بڑے اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے جس سے میری حوصلہ افزائی ہوئی کہ آپ کو خط لکھوں آپ تصور کر سکتے ہیں کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کے سلسلے میں میری تائید کی بنیاد اس کا واضح پن اور خود مختارانہ پہلو ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جب تک آپ بطور سیکرٹری وزارت خارجہ موجود ہیں پاکستان کی پالیسی تبدیل نہیں ہوگی۔ اس کے لئے جن خوبیوں کی ضرورت ہے اس کا ثبوت آپ گذشتہ کئی برسوں میں بہم پہنچا چکے ہیں۔ مسٹر بھٹو نے آپ کی جرأت مندی کا ذکر بڑا زور دے کر کیا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ ترغیب و تحریص سے بالاتر دیانت کے ساتھ آپ دونوں نے برسوں ایک دوسرے کے ساتھ کام کیا ہے اور قبل ازیں بھی آپ نے ایک ہی وزارت میں خدمات انجام دی ہیں۔

پاکستان کے حقیقی مفادات کے ساتھ آپ کی گہری وابستگی بالکل واضح ہے۔ مجھے امید ہے ہمیں مستقبل قریب میں ملاقات کا موقع ملے گا جب ہم بہت سے اہم امور پر تبادلہ خیال کر سکیں گے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

آپ کا مخلص

(برٹرینڈرسل)

www.bhutto.org

31 August, 1966.

Mr. S.M. Yusuf,
Foreign Secretary,
Rawalpindi,
Pakistan.

Dear Mr. Yusuf,

I am writing to tell you of my recent meeting with Zulfiqar Bhutto, ho is not only an old Friend but one of those in whom I have great confidence. He spoke very highly of you, which encouraged me. You may imagine that my support of the foreign policy of Pakistan was based upon its clear and independent posture. I know that with you as Foreign Secretary Pakistani policy will not change. The qualifies which are required are those which you have shown over many years. Mr. Bhutto spoke with great emphasis of your courage, incorruptibility and integrity. It heartened me to know that you two had worked together for many years and that, indeed, you had served together in the same Ministry before.

Your devotion to Pakistan's true interests is clear. I hope there may be an opportunity for us to meet in the near future to discuss many matters.

With kind regards.

Yours sincerely,

Bertrand Russell

www.bhutto.org

ایڈیٹر اکانومسٹ کے نام

28/ اگست 1966ء

سر!

اکانومسٹ میں مسٹر بھٹو پر کی گئی تنقید کو ماضی کے سیاق و سباق کی روشنی میں دیکھا جانا چاہئے۔ مغربی ممالک کی نظروں میں جناب بھٹو کا گناہ یہ ہے کہ وہ پاکستان کے لئے آزادانہ پالیسی مرتب کرنے والی اہم شخصیت تھے۔ جس کی وجہ سے یہ ملک ان ملکوں کی صف سے علیحدہ ہو گیا جو امریکی سامراج کے دُم چھلے تھے۔

ان قوم پرست لیڈروں کا جو اپنے عوام کے احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں بہت ہی واضح نظر آرہا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ ایسے اسباب و وسائل فراہم کر لیں جن سے وہ خود پر ڈالے جانے والے دباؤ کا مقابلہ کر سکیں۔ ورنہ اکانومسٹ جیسے رسالے میں ان کے خلاف بیہودہ الزام تراشیاں کرنے لگتے ہیں۔

مسٹر بھٹو اپنے ملک میں جناح کی روایت سے تعلق رکھنے والے ایک قوم پرست لیڈر ہیں۔ ان کی غیر معمولی مقبولیت صرف لندن تک محدود نہیں ہے بلکہ اور بھی کئی ہیں جو ان کے لئے نیک تمنائیں رکھتے ہیں اور ان کی آزادانہ اور خود مختارانہ پالیسی کے مداح ہیں جو ان کے اپنے ملک اور افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے عوام کے معاشرتی تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

آپ کا مخلص

(برٹرینڈ رسل)

www.bhutto.org

28 August, 1966.

To the Editor of the Economist

Sir:

The Economist attack on Mr., Bhutto should be placed in context. Bhutto's aim in Western eyes is that he was an important figure in conceiving an independent policy for Pakistan, placing her in the context of Afro-Asia and outside of the rank of countries which are dominated by the United States.

The fate of national leaders who respond to the needs of their people is increasingly clear, unless they find the means to resist the pressures applied to them, in which case journals much on the Economist attach unpleasant labels to them. Mr. Bhutto is a national leader of his country in the tradition of Jinnah, and the storm of prolonged applauce he receives is not raatrioted to London. There are many who wish him well and who admire him role in working for an indpendent policy for his country consonent with the social aspirations of the people of Africa, Asia and Latin America.

Yours faithfully,

Bertrand Russell

www.bhutto.org

برٹرینڈرسل نے امریکہ کے خلاف ویت نام میں جنگی جرائم کا ٹربیونل قائم کیا تو انہوں نے سب سے زیادہ اہمیت جناب ذوالفقار علی بھٹو کی شرکت کو دی۔ لیکن ان دنوں جناب بھٹو ملکی سیاست میں ایک نئے دور کا آغاز کرنے کی تیاریوں کے آخری مرحلے پر تھے۔ انہیں اس خطے کی اس عظیم انقلابی تحریک کی قیادت کرنا تھی۔ لہٰذا انہیں معذرت کرنا پڑی لیکن برٹرینڈرسل ان کی شرکت کے کس شدت کے ساتھ خواہشمند تھے؟ اس کا اندازہ ان کے مکتوب سے کیا جا سکتا ہے۔

جناب بھٹو کے نام

16 / اگست 1966ء

ڈیئر مسٹر بھٹو

کافی عرصے سے میں شمالی ویت نام کے ہسپتالوں، سکولوں، سینڈریچوں اور اپاہج گھروں پر امریکی فضائیہ کی مسلسل بمباریوں سے متعلق شہادتیں اکٹھی کر رہا ہوں۔ علاوہ ازیں فراہم شدہ شہادتوں کی روشنی میں یہ بالکل واضح ہے کہ امریکی افواج نے پورے جنوبی ویت نام میں حواس معطل کر دینے والی کیمیاوی اشیاء اور زہریلی گیس استعمال کی ہے۔ وہاں پر انتہائی خوفناک بمباری کی گئی جن میں ایسے بموں کا استعمال بھی شامل ہے جن کے اندر بلیڈ کی طرح تیز لوہے کے ٹکڑے بھرے گئے تھے۔ ویت نام کے شمال اور جنوب دونوں طرف نیپام اور فاسفورس کے بم بھی گرائے گئے یہ دونوں کیمیکل اشیاء واجسام سے چپک کر جلتے اور بھڑکتے ہیں اور انہیں پانی یا مٹی کے ذریعہ نہیں بجھایا جا سکتا۔ ان کا شکار ہونے والے جھلس کر رہ جاتے ہیں۔

یہ پورے طور پر واضح ہے کہ امریکہ ویت نامی عوام کے خلاف متعدد قسم کے جنگی جرائم کا مرتکب ہو رہا ہے۔ میری خواہش ہے کہ ایک مکمل نمائندہ، آزاد اور باوقار عالمی ٹربیونل قائم کیا جائے جو امریکی حکومت کے انسانیت کے خلاف جنگی جرائم سے متعلقہ شہادتوں کو سنے۔ اگر آپ یہ ذمہ داری قبول کرتے ہوئے ٹربیونل کے ممبر بننا پسند فرمائیں تو یہ میرے لئے بے حد اہمیت کی بات ہوگی۔ اگر اصولی طور پر آپ اس ٹربیونل کے ممبر بننا قبول کریں تو کیا میں درخواست کر سکتا ہوں کہ آپ اپنی پہلی فرصت میں مجھے اس سے آگاہ کر دیں۔

www.bhutto.org

16 August, 1966.

Mr. Zulfiqar Ali Bhutto,
Dorchester Hotel,
London, W.1.

Dear Mr. Bhutto,

Over a period of time I have been gathering evidence concerning the sustained bombardment of hospitals, schools, sanatoria and leprosoria in North Vietnam by the United States Air Force. In addition to this, it is abundantly clear from evidence at hand that toxic chemicals and poison gas have been used throughout South Vietnam by American forces. There has been saturation bombing involving special bombs containing razor-sharp slivers of steel, one hundred million of which slivers have fallen on one province of North Vietnam during the period of a year. Napalm and phosphorus have accompanied bombardments, both in the North and the South. These two chemicals burn unremittingly and cannot be extinguished with dirt or water. They cause the victims to suppurate.

It is overwhelmingly clear that the United States is engaged in a series of war crimes against the people of Vietnam. I am anxious that there should be a highly representative, independent and respected international tribunal to hear full evidence concerning these crimes against humanity on the part of the United States Government. I should consider it of the greatest importance to this undertaking if you would feel able to participate as a member of the tribunal. I should be pleased to send you full details concerning the proposed tribunal. May I ask if you could let me know at an early opportunity if you would be willing, in principle, to be a member of it?

The tribunal participants at the time of writing are: Gunther Anders, Lelio Basso, Simone de Beauvior, former President Gardenas, Stokely Carmichael, Josue de Castro.

www.bhutto.org

تادم تحریر ٹریبونل کے دوسرے شرکاء یہ ہیں۔
گنڈ تھر اینڈرسن ' لیلیو باسو ' سائمن ڈی بووئیر ' سابق صدر کارڈینس ' اسٹوکلے کار مائیکل ' جوزوڈی کاسترو ' ولاڈی میرڈیڈر۔ بحر ' آزک ڈیڈشر ' ڈانیلوڈالسی ' راں پال سارتر اور پیٹر وائز۔ ٹریبونل کے تمام شرکاء آپ کی شمولیت کو اپنے کام اور امن و انصاف کے مقاصد کے لئے ' سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

تمام ترنیک تمناؤں کے ساتھ
آپ کا مخلص
(برٹرینڈرسل)

www.bhutto.org

Vladimir Dedijer, Isaac Deutscher, Danilo Dolci, Jean-Paul Sartre and Peter Weiss. All on the tribunal feel that your participation would have the greatest importance for our work and the cause of peace and justice.

With all good wishes.

Yours sincerely,

Bertrand Russell

www.bhutto.org

اگرچہ یہ باب بھٹو کے بارے میں برٹرینڈرسل کے خیالات کے لئے خاص کیا گیا ہے مگر نامناسب نہ ہو گا اگر اس ذیل میں انڈونیشیا کے عظیم قائد مسٹر سوئیکارنو کا ایک خط بھی یہاں پیش کر دیا جائے۔

انڈونیشیا کے عظیم قومی رہنما احمد سوئیکارنو مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کے قریبی دوست ہی نہ تھے بلکہ جناب بھٹو نے تیسری دنیا کے مظلوم عوام کے حقوق حاصل کرنے کی جو عظیم جدوجہد شروع کی تھی اس میں ان کے معاون بھی تھے ان رہنماؤں کے خلاف سامراجی سازشوں کا تذکرہ تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔ یہاں میں سوئیکارنو مرحوم کا جو خط نقل کر رہا ہوں وہ انہوں نے سنہ 65ء کے آخری دن جناب بھٹو کے نام لکھا تھا۔

سوئیکارنو کا خط

مائی ڈیئر ذوالفقار !

میں آپ کے اس خط کا تہہ دل سے ممنون ہوں جو آپ نے واشنگٹن سے لکھا اور مجھے سفیر پالار کے ذریعے موصول ہوا۔ یہ خط میری شخصیت اور کردار کے گہرے تجزیئے پر مبنی شعور کے ساتھ لکھا گیا اور اس میں جس طرح ان مقاصد کو سمجھا گیا جو میری زندگی کا مشن ہیں' اس سے میں شدت کے ساتھ متاثر ہوا ہوں۔ آپ کے ان خیالات سے میرے اس ایمان کو تقویت ملی ہے کہ میں نے انڈونیشی قوم کی قیادت اور ابھرتی ہوئی نئی قوتوں پر بھروسہ کرنے کا جو راستہ منتخب کیا ہے وہ درست ہے' میں جانتا ہوں کہ یہ ایک کٹھن جدوجہد ہے۔ لیکن اللہ نے چاہا تو ہم ہی کامیاب ہوں گے۔

آپ نے جکارتہ تشریف لانے سے جو معذرت کی ہے اس کی وجوہ کا مجھے احساس ہے میں جانتا ہوں کہ پاکستانی عوام کی جدوجہد' نئی اُبھرتی ہوئی قوتوں کی جدوجہد ہی کا ایک حصّہ ہے اور اس جدوجہد کو آگے بڑھانے میں آپ نے نمایاں کردار ادا کیا ہے اس مقصد کے تحت آپ کی کہیں اور موجودگی جکارتہ سے زیادہ اہم ہے۔ آپ نے شدید عدیم الفرصتی کے باوجود مجھے یاد کرنے کا جو موقع نکالا اور میری بہتری کے لئے جس دلچسپی کا اظہار کیا وہ میرے لئے بے حد قابل قدر ہے اور مجھے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں مل رہے۔ میرا خدا آپ کو ہر قسم کی خطرات سے محفوظ رکھے اور سامراجی اور استحصالی قوتوں کے خلاف آپ کے اقدامات اور جدوجہد میں آپ کی

www.bhutto.org

Djakarta,

PRESIDEN
REPUBLIK INDONESIA

My dear Zulfiqar,

I thank you for your letter from Washington which was forwarded to me by the Ambassador Palar. It touched me very deeply, since it is written with such an understanding of my person and character and of the goals I have set myself to achieve. It added to my conviction that the path I am following in guiding the Indonesian nation and in rallying the New Emerging Forces is the right one. I realize it is a hard fight but God willing, we will succeed.

I very well appreciate your not coming to Djarta , for I know that the struggle of the people of Pakistan as part of the struggle of the New Emerging Forces in which you have such a great share, demands your presence elsewhere. That you have managed to find the time to write to me, to express your grave concern about my welfare, I value very highly and I find it hard to reciprocate. May Allah shield you against harm and guide you in all your actions in your struggle against the forces of exploitation and domination. In this you can rely on my assistance and of the people of Indonesia, for your struggle is our struggle.

My heart still bleads when I think and speak of the, "30 September affair" and the events surrounding it. Fortunately we have passed the first stage of efforts to destroy the revolution and the results it has so far achieved.

www.bhutto.org

رہنمائی فرمائے اس جدوجہد میں آپ میری اور انڈونیشی عوام کی تائید و حمایت پر مکمل بھروسہ کر سکتے ہیں۔ آپ کی جدوجہد ہماری اپنی جدوجہد ہے۔

"30 ستمبر" کے معاملات و واقعات کے بارے میں اب بھی جب سوچتا ہوں یا ان کا ذکر آتا ہے تو میرا دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔ خوش قسمتی سے ہم انقلاب کو اس پہلے مرحلے سے آگے نکال لائے تھے جس میں اسے تباہ کیا جا سکتا تھا اور آزادی کے متوقع نتائج حاصل کر چکے تھے میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے یہ توفیق اور طاقت عطا فرمائے کہ میں انقلاب کی جدوجہد کو صحیح راستے پر گامزن رکھ سکوں۔

وعلیکم السلام

آپ کا

(احمد سوئیکارنو)

www.bhutto.org

I pray God Almighty that He may give me the further strength to keep the revolution on its original path.

Wa alaikumussalam

Yours

Soekarno

Djakarta.
31.12.1965

www.bhutto.org

www.bhutto.org

باب ہفتم

پیپلز پارٹی کا قیام

اکتوبر کے اوائل میں جب وہ کراچی پہنچے تو مختلف احباب جن میں بعض بڑے سرکاری افسر بھی شامل تھے' ان سے ملاقات کے لئے آئے۔ اس محفل میں انہوں نے اپنی سیاسی پارٹی منظم کرنے کے ارادے کا اظہار کیا تو اکثریت نے انہیں اس ارادے سے باز رہنے کا مشورہ دیا۔ ایوب خاں کی دہشت اور قوت سے ڈرایا۔ لیکن بھٹو ان کی بزدلی اور کم ہمتی پر مسکراتے رہے' وہ اپنے عزم میں اٹل تھے اور چند ہی دنوں میں پارٹی کے قیام سے قبل ایک انقلابی جدوجہد شروع کرنے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ عوام سے براہ راست رابطہ کی جدوجہد' جو قائداعظمؒ کے بعد کسی مسلمان رہنما کو کرنے کا حوصلہ نہ ہوا تھا۔ پاکستان کا المیہ یہی تھا کہ یہاں کی سیاست ڈرائنگ روموں کی سیاست بن کر رہ گئی تھی۔ تمام فیصلے بالا ہی بالا کر لئے جاتے تھے' بھٹو اس سیاست کو بدلنے کا عزم کر چکے تھے اور ان کے عزائم پر بوڑھے سیاستداں جو تبصرے کر رہے تھے' ان میں پسندیدگی کے بجائے طنز نمایاں تھا۔ اسی موقع پر ایک مشہور ڈرائنگ روم پالیٹیشن نے جو تبصرہ کیا تھا وہ اب تک سیاسی اور صحافتی حلقوں کے حافظے میں تازہ ہے' انہوں نے فرمایا تھا۔

"چند لڑکوں کا ہجوم دیکھ کر بھٹو کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بھلا یہ لڑکے بالے اور تانگے ریڑھے والے سیاست پر کیا اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ چند دنوں کی بات ہے۔ بھٹو خود راہ راست پر آجائے گا۔"

لیکن ان خیالات کے برعکس بھٹو راہ راست پر آ چکے تھے۔ وہ چو طرفہ حملے کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے۔ ان کا مشن حد درجہ کٹھن تھا۔ ایک طرف انہیں بیس سال تک کچلے اور نظر انداز کئے گئے عوام کو بیدار کرنا تھا۔ دوسری طرف متوسط طبقے کے خوابیدہ اور بے عمل لوگوں میں زندگی کی روح پھونکنا تھا اور

www.bhutto.org

تیسری طرف اس آمریت کا مقابلہ کرنا تھا' جس نے اپنی دہشت و جبر کے بل پر دوسرے تمام سیاستدانوں کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ بھٹو کی تنہا ذات تھی جس نے اس عظیم کام کا بیڑا اٹھایا۔ متوسّط طبقے کے اہل فکر اور دانشوروں اور طلباء کے لئے انہوں نے اخبارات میں خارجہ پالیسی پر ایک سلسلہ مضامین شروع کیا۔ وکلاء سے رابطہ قائم کیا اور راولپنڈی میں ایفرو ایشیائی استحکام کمیٹی کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے' پاکستان کے باشعور عوام سے مخاطب ہوتے ہوئے کراچی میں پریس کانفرنس کی لیکن عوام سے براہ راست رابطے کی ابتدا اس وقت کے گول باغ کا وہ جلسہ تھا جس کا اہتمام لاہور میں کیا گیا' اس دوران حکمران حلقے فرد واحد کی طرف سے ایسی منظم اور پُر اثر مہم پر سخت گھبرائے اور انہوں نے بدحواسی میں بھٹو کی کردار کشی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں بھارتی ہائی کمشنر سے ان کی ملاقات کا شوشہ ایک ایسی ہی بدحواسی تھی' جس سے عوام کافی محظوظ ہوئے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ یہ مہم چلانے والے خفیہ رابطوں کے ذریعے اب بھی بھٹو کو اہم مناصب کی پیشکش کر رہے تھے۔

اس مہم کا جواب لاہور کے عوام نے 22 جون کو دیا' حالانکہ اس وقت بھٹو کی رفاقت کا دم بھرنے والوں میں بہت سے حکومت کے مخبر تھے اور لمحے لمحے کی اطلاع پہنچایا کرتے تھے۔ انہی لوگوں نے جلسے کا اعلان کرتے وقت عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی' کسی اعلان میں جلسے کا مقام موچی دروازہ بتایا جا رہا تھا تو کسی میں گول باغ۔ لیکن یہ عوام کے والہانہ جذبات تھے کہ جس وقت بھٹو گول باغ پہنچے تو جلسہ گاہ میں بے پناہ ہجوم ہو چکا تھا۔ حالانکہ حکومت کے کارندوں نے گراؤنڈ میں پانی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن لوگ اس پانی میں بھی اطمینان سے کھڑے اپنے رہنما کے خیالات سننے کے لئے ہمہ تن گوش تھے۔ حکومت نے اس جلسہ کو ناکام کرنے کی جملہ تیاریاں مکمل کر رکھی تھیں۔ وہ گربہ کشتن روزِ اول کے مصداق رابطہ عوام کی مہم کو اس پہلے ہی مرحلے پر سبق آموز انداز میں کچلنے کا ارادہ کر چکی تھی۔ جونہی بھٹو مائیک پر آئے حکومت کے کارندوں نے بجلی کی تاریں کاٹ دیں۔ ایک تاریکی چھا گئی اور اس تاریکی میں پہلے سے مقرر کردہ غنڈوں نے عوام کے قائد پر حملہ کر دیا۔ بھٹو مردانہ وار ان غنڈوں کا دست بدست مقابلہ کر رہے تھے۔ عوام غضب ناک ہو کر نعرے لگا رہے تھے' ہم بھٹو کو ضرور سنیں گے اور بھٹو ان غنڈوں کے چنگل سے نکل کر عوام کو مخاطب کرتے ہوئے با آواز بلند کہہ رہے تھے کہ "میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ تقریر ضرور ہو گی" لیکن ان کے رفقاء نے پولیس کے تیور بھانپ لئے تھے۔ انہوں نے بھٹو کو بتایا کہ اگر آپ نے تقریر کی کوشش کی تو یہ لوگ فائرنگ کرنے کا حکم ساتھ لائے ہوئے ہیں۔ اس طرح معصوم عوام کی جانیں خطرے میں ہیں۔ یہ سمجھاتے ہوئے ان کے ساتھی انہیں زبردستی گھیرے میں لے کر اسٹیج سے اتار لائے اور ایک رکشے میں بٹھا کر روانہ کر دیا۔

www.bhutto.org

مولانا کوثر نیازی ، ذوالفقار علی بھٹو، خان آف قلات اور نسیم احمد

www.bhutto.org

عوام حکومت کے اس اقدام پر مشتعل ہو چکے تھے۔ جلسہ گاہ کے حاضرین اسی وقت احتجاجی جلوس کی صورت میں آمریت کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے مال روڈ پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ یہ آمریت کے خلاف پہلا زبردست جلوس تھا' بھٹو نے شاندار حکمت عملی کے تحت جو سیاسی کارروائیاں کی تھیں' ان کے نتائج سامنے آ رہے تھے۔ لوگوں نے محسوس کر لیا تھا کہ "آمریت کا مقابلہ اتحاد اور جرأت مندی کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے۔" خود بھٹو نے سب سے پہلے میدان میں اتر کر لوگوں کے حوصلے بڑھا دیئے تھے۔ پولیس کی کوششوں کے باوجود جلوس منتشر ہونے کی بجائے' مزید منظم ہو کر آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اسمبلی چیمبرز کے سامنے پولیس نے بغیر کوئی وارننگ دیئے فائرنگ شروع کر دی۔ جلوس میں شامل لوگ مختلف ٹولیوں کی صورت میں پورے شہر میں پھیل گئے۔ انہی میں سے ایک ٹولی نے' حکومت کی غنڈہ گردی کے خلاف اظہارِ نفرت کے طور پر ایک اخبار کے دفتر کو آگ لگا دی جو ایوب خاں کی بڑھ چڑھ کر حمایت کرنے میں بدنام تھا۔ جناب بھٹو کو غنڈوں کے حملے کی وجہ سے شدید چوٹیں آئیں تھیں۔ لیکن وہ ان زخموں سے بے نیاز اپنے اگلے قدم کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

ایوب خاں اور اس کے مشیروں کا خیال تھا کہ دہشت گردی کا یہ مظاہرہ عوام کو دبا دے گا۔ لیکن نتیجہ جب اس کے برعکس برآمد ہوا تو یہ ٹولہ سخت تشویش میں پڑ گیا۔ وہ اس طوفان کی آمد کا اندازہ کر کے لرزہ براندام تھے جو بھٹو کی قیادت میں انہیں بپھرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ مشیروں نے رائے دی کہ اس طوفان کے برپا کرنے والے ہی کو ٹھکانے لگا دیا جائے اور دوسرے یہ مشورہ دے رہے تھے کہ بھٹو کی کردار کشی کی جائے۔ دوسرے مشورے پر عمل شروع کر دیا گیا۔ ان پر بھارتی شہریت کا الزام لگایا گیا۔ لیکن عوام اسے بھی خاطر میں نہ لائے۔ حکومت کی بوکھلاہٹ کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف ایک شخص ذوالفقار علی بھٹو کو کچلنے کے لئے بطور خاص ایبڈو زدہ سیاستدان قاضی فضل اللہ کو وزیر داخلہ بنا دیا گیا اور انہیں مکمل اختیارات دیئے گئے کہ وہ لاڑکانہ میں اپنی پسند کی انتظامیہ متعین کر کے' بھٹو کو پوری طرح کچل دیں۔ بھٹو کو سخت ناپسند کرنے والے ایس پی کا وہاں تقرر کر کے اسے ہر طرح کی کھلی چھٹی دی گئی۔ یہاں تک کہہ دیا گیا کہ اگر تم اس شخصیت کو ختم کرا دو تو ہمیں اعتراض نہ ہو گا۔ اس شخص نے لاڑکانہ جاتے ہی بھٹو کے عزیزوں' دوستوں اور حامیوں پر مقدمات کی بھرمار کر دی۔ بلا مبالغہ سینکڑوں جھوٹے مقدمات بنائے گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کا ردِ عمل بڑا دلچسپ تھا۔ وہ اپنے دوستوں سے کہتے۔

> "یہ حکومت واقعی بڑی بے وقوف ہے ان لوگوں کا خیال ہے کہ میں کوئی روائتی سندھی وڈیرا ہوں' جسے پولیس کے ذریعے ہراساں کر کے دبایا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ میں ایک سیاستدان ہوں' میری بنیاد صرف لاڑکانہ میں نہیں پورے پاکستان میں ہے۔ ان حرکتوں سے یہ لوگ میرے لئے نہیں اپنے لئے مشکلات پیدا

www.bhutto.org

کر رہے ہیں۔"

جیسے جیسے حکومت کی طرف سے دباؤ اور تشدّد بڑھتا جا رہا تھا ذوالفقار علی بھٹو تحریک کو مزید تیز کرتے جا رہے تھے۔ انہوں نے ہر قیمت پر آمریت سے ٹکر لینے کی ٹھان لی تھی۔ ایک بار پھر لاہور آ کر انہوں نے لائل پور کے دورے کا پروگرام مرتب کیا وہ آخر میں تو کافی صاف اردو بول لیتے تھے مگر ان دنوں ابھی اردو میں وہ اتنے رواں نہیں ہوئے تھے۔ ایک بار اسلامیہ کالج میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے ازراہ تفنن کہا تھا کہ "اب میں فیض احمد فیض کی طرح صاف اردو بولنا سیکھوں گا" اور جدوجہد کے دوران وہ اپنا یہ وعدہ پورا کر رہے تھے۔ موقع بہ موقع وہ اپنے رفقاء سے مختلف اصطلاحات و الفاظ کے اردو تراجم پوچھ کر انہیں یاد کر لیا کرتے تھے۔ ان کے اکتساب کا یہ سلسلہ آخری وقت تک جاری رہا اور اس سلسلے میں مجھے بھی یہ اعزاز حاصل ہے کہ بہت سی صحبتوں میں، مَیں بھی یہ خدمت بجالایا۔

لائل پور کا سفر شروع ہوا تو عجیب پراسرار فضا تھی، شیخوپورہ اور لائل پور کے درمیان والی سڑک جس پر ٹریفک کا بے پناہ ہجوم رہتا ہے۔ بالکل سنسان پڑی ہوئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ لائل پور نشاط ملز سے بھی کافی آگے تک عوام کا بے پناہ ہجوم بھٹو کے استقبال کے لئے جمع تھا۔ جونہی ان کی کار ہجوم کے قریب پہنچی تو پرجوش نعرے گونج اٹھے۔ کسان، مزدور اور طالب علم جذبات سے بے قابو ہو کر

"ماریں گے مر جائیں گے بھٹو کو لائیں گے"

کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ عوام کے اصرار پر جگہ جگہ کار سے اتر کر انہیں خطاب کرنا پڑا۔ حالانکہ وہاں صرف وہ بار روم میں خطاب کرنے تشریف لے جا رہے تھے۔ لیکن عوامی طاقت کا مظاہرہ پہلے ہی ہو گیا۔ میر عبدالقیوم مرحوم کی کوٹھی تک پانچ میل کا فاصلہ طے کرنے میں ساڑھے چار گھنٹے صرف ہو گئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اصل ہجوم تو اس جگہ جمع ہے۔ لوگوں کے جذبات قابو سے باہر ہو رہے تھے۔ ان کے بے پناہ اصرار پر انہیں اپنی قیام گاہ کی چھت پر کھڑے ہو کر عوام سے خطاب کرنا پڑا۔ ظاہر ہے ان کی آواز اتنے بڑے اجتماع تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ لیکن عوام تو اپنے محبوب رہنما کی ایک جھلک دیکھنے کو بیتاب تھے۔ ان کے خیالات و نظریات سے تو وہ پہلے ہی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بھٹو کے منہ سے جو الفاظ بھی نکل رہے ہیں وہ ان کے دلوں کی دھڑکنوں کے ترجمان ہیں۔ مزدوروں اور کسانوں کے اس شہر میں جناب بھٹو نے کنونشن لیگ سے اپنی رسمی علیحدگی کا اعلان بھی کر دیا۔ اس اعلان نے ایوان اقتدار میں کھلبلی مچا دی۔ ان کی تحریک میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے لئے نئے احکامات جاری کئے جانے لگے۔ لیکن بھٹو اب بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ جس طوفان کو وہ حرکت میں لے آئے تھے اب اسے روکنا کسی حکومت کے بس کی بات نہیں رہ گئی تھی۔

www.bhutto.org

بھٹو کے نزدیک اب وہ لمحہ آ گیا تھا جب پاکستان کی فضا کسانوں ' مزدوروں کے تعاون سے ایک نئی انقلابی پارٹی منظم کرنے کے لئے ہموار ہو گئی تھی۔ چنانچہ کنونشن کے ابتدائی انتظامات کی تیاریاں شروع کر دی گئیں اور ساتھ ہی عوامی بیداری کی لہروں کا تلاطم برقرار رکھنے کے لئے انہوں نے پاکستان بھر کے دورے شروع کر دیئے۔ ڈھاکہ میں مختلف رہنماؤں سے ملاقاتوں اور عوامی رابطے کے بعد انہوں نے ایک پریس کانفرنس میں اپنے نظریات کا پرچار کیا۔ واپس مغربی پاکستان آ کر انہوں نے مختلف بیانوں اور پریس کانفرنسوں کے ذریعے اپنی نئی پارٹی کی نظریاتی بنیادوں کے بارے میں ابتدائی معلومات فراہم کرنا شروع کر دیں اور 5 نومبر کو پشاور کے اس اہم دورے پر روانہ ہوئے ' جس کے نتائج نے آمریت کو بُری طرح متزلزل کر دیا۔

پشاور کا یہ دورہ شیر کو اس کے کچھار میں جا کر للکارنے کے مترادف تھا۔ پشاور کے عوام نے بھی دل و جان کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔ مرحوم شیر پاؤ نے اپنے گاؤں چارسدہ میں بھٹو کو استقبالیہ دیا اس میں صوبہ سرحد کی تمام نامور سیاسی شخصیتوں کے علاوہ ہر طبقۂ فکر کے ہزار سے زائد مندوبین شریک تھے۔ یہاں انہوں نے نئی پارٹی کے قیام کی غرض و غائت بیان کرتے ہوئے اسلامی سوشلزم کے فلسفے کی وضاحت کی اور صوبہ سرحد کے اس نمائندہ اجتماع نے جناب بھٹو کو اپنے پُرجوش تعاون کا یقین دلایا۔

30 نومبر کی تاریخ قریب آ رہی تھی ' اور حکومت اس کنونشن کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں کھڑی کر رہی تھی۔ لاہور میں کوئی میدان یا ہال ایسا نہ تھا ' جہاں یہ کنونشن منعقد کرنے کی اجازت دی گئی ہو ' پورے ملک کے ڈپٹی کمشنروں اور تحصیل داروں کو احکامات جاری کر دیئے گئے کہ وہ اپنے اپنے علاقوں سے اس کنونشن میں شرکت کے لئے جانے والے افراد کو ہر قیمت پر روکیں۔ ان نامساعد حالات کے باوجود کنونشن کی تاریخ میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی۔ ڈاکٹر مبشر حسن کی قیام گاہ کو جہاں یہ کنونشن منعقد کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں ' سرکاری ایجنٹوں نے نذر آتش کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ اس کی اطلاع بھٹو صاحب کو بھی مل گئی اور جب انہوں نے کارکنوں کو اس متوقع خطرے سے آگاہ کیا تو لاہور کے طالب علموں اور مزدوروں نے اس مکان کی نگرانی شروع کر دی اور حکمرانوں کے مقرر کردہ غنڈوں کو حوصلہ نہ پڑ سکا کہ وہ ان عوامی مجاہدوں کی موجودگی میں اپنے مذموم عزائم پورے کر سکیں۔ حکومت کی طرف سے شدید مزاحمتی کارروائیوں کی وجہ سے مختلف صوبوں کے صرف چھ سو نمائندے کنونشن میں شرکت کر سکے۔ لیکن یہ چھ سو افراد جس جذبے اور عزم کے ساتھ تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے وہاں آ گئے تھے ' وہ پورے پاکستان کے محنت کش عوام کے نظریات کی ترجمانی تھی۔ اس نمائندہ اور تاریخی اجتماع میں جناب بھٹو کی تقریر اتنی مدلل ' مؤثر اور پرجوش تھی کہ حکومت کی طرف سے مخبری کے لئے آنے والے سی آئی ڈی کے کارندے بھی ایک بار تو جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ آخر میں پارٹی کی اساسی دستاویز تقسیم کی گئی اور تمام

www.bhutto.org

مندوبین نے متفقہ طور پر جناب ذوالفقار علی بھٹو کو اس نئی پارٹی کا سربراہ منتخب کر لیا' اسی کنونشن میں پارٹی کے بنیادی نظریات کی ترجمانی کرنے والے چار اصول مرتّب کئے گئے اور انہیں متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا' تنظیمی ڈھانچے کی تشکیل کے لئے مختلف کمیٹیاں مقرر کر کے ذمہ داریوں کی تقسیم کر دی گئی۔ ظاہر ہے اس اہم تاریخ ساز واقعے پر حکومت کے کنٹرول میں کام کرنے والے ذرائع کا رویہ کیا رہا ہو گا۔ صرف چند ایک اخبارات نے اس کی خبریں شائع کیں۔ لیکن بھٹو کو ان سہاروں کی ضرورت نہ تھی۔ جس طرح وہ عوام کے دلوں کی دھڑکنوں کو محسوس کر رہے تھے' اسی طرح عوام بھی اپنے محبوب قائد کی سرگرمیوں سے باخبر رہنے کے لئے اپنے طور پر جستجو میں لگے رہتے تھے۔

نئی پارٹی کا قیام بھی کیا کم تھا کہ اس کا انقلابی پروگرام بھی منظر عام پر آ گیا۔ آمریّت کے ایوانوں میں زلزلہ برپا ہو گیا۔ بھٹو سب سے پہلے لاہور میں عوام سے خطاب کر کے نئی پارٹی کے پروگرام کے بارے میں عوام کو اعتماد میں لینا چاہتے تھے لیکن شاہی قلعہ کے اس عقبی پارک میں جہاں' اس جلسے کو منعقد ہونا تھا' راتوں رات' بجری' پتھروں اور اینٹوں کے ڈھیر لگا دیئے گئے۔ پارٹی نے پیشکش کی کہ وہ اپنے خرچ پر ان چیزوں کو ہٹانے کے لئے تیار ہے مگر حکومت کا مقصد ہی جلسے کو روکنا تھا' مقررہ جلسہ گاہ کو جانے والے تمام راستوں کی غنڈوں اور پولیس نے مشترکہ طور پر ناکہ بندی کر رکھی تھی اور ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ اگر یہ جلسہ منعقد ہو جاتا تو شاید سینکڑوں بے گناہ لوگوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونے پڑتے اور بھٹو اس بات کے خواہش مند نہ تھے کہ وہ اپنی پارٹی کی بنیاد بے گناہ محنت کشوں کے خون اور ہڈیوں پر رکھتے' وہ تو ایک ماہر رہنما کی طرح عوام کو کم سے کم قربانیوں والی راہ سے گزار کر کامیابی سے ہمکنار کرنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آمریت کا بت اتنا مضبوط نہیں کہ اسے گرانے کے لئے عوام کی قیمتی زندگیوں کی قربانیاں دینی پڑیں۔

حکومت کی مہم تیز ہو رہی تھی' قاضی فضل اللہ کو جس فرض کی ادائیگی کے لئے وزارت کا منصب ملا تھا' وہ سرگرمی سے اس کی تکمیل میں مصروف ہو گئے' یہاں ان مضحکہ خیز الزامات کو دہرانے کی ضرورت نہیں کہ خود عوام کے ردِّ عمل نے ان کے دروغ و افترا کی تصدیق کر دی تھی' کردار کشی کے علاوہ حکومت کے زر خرید نام نہاد دانشوروں نے ان پر نظریاتی حملے شروع کر دیئے ان کے سوشلزم کے نعرے کو اسلام کے منافی قرار دیا گیا۔ پرانے اور فرسودہ سیاستدانوں نے نئی پارٹی کے قیام پر ناک بھوں چڑھائی اور اس ماہرانہ رائے کا اظہار کیا کہ "یہ پارٹی کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکے گی" بھٹو اپنی پریس کانفرنسوں میں ذاتی الزامات' نظریاتی کج بحثیوں اور پرانے سیاستدانوں کے خیالات کے بھرپور اور مدلّل جواب دے کر ان کے بخیئے اُدھیڑ رہے تھے۔ سیاسی جدوجہد میں ایسی مثالیں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں کہ فرد واحد نے ایک مضبوط حکومتی مشینری اور مخالف سیاسی رہنماؤں کے جوڑ توڑ کا اس کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا ہو' ہر چند

www.bhutto.org

جناب بھٹو کو اپنے چند پر خلوص رفقاء کی مدد حاصل تھی۔ لیکن ان کے جوش و جذبے کو بھی سائنٹیفک بنیادوں پر مرتّب کی گئی ایک سیاسی حکمت عملی کی ضرورت تھی' ورنہ صرف جذبہ بعض اوقات اصل منزل تک پہنچانے سے قبل ہی عوامی قوتوں کو غلط مواقع پر تصادم سے ہمکنار کر کے' تباہ کر سکتا ہے۔ ایشیا و افریقہ کے ترقی پذیر ممالک میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ یہ قائدانہ فرض صرف بھٹو انجام دے سکتے تھے۔ انہوں نے ایسی شاندار حکمت عملی مرتب کی کہ مخالفین اور حکومت اپنی کوتاہ اندیشی کے سبب ان میدانوں میں آ کر کھیل رہے تھے' جہاں بھٹو انہیں کھلانا چاہتے تھے اور وہ خود بپھری ہوئی عوامی قوّت کو محفوظ رکھتے ہوئے اس ہوشمندی سے تحریک کو آگے بڑھا رہے تھے کہ آمریت کی بنیادیں کھوکھلی ہوتی چلی جائیں اور عوامی قوّت میں اضافہ ہوتا جائے۔ اس جدوجہد کے دوران جناب بھٹو نے جو حکمت عملی اور حربے اختیار کئے وہ سیاست کے طالب علموں کے لئے نصاب کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ انتہائی نازک موقع تھا' عوامی قوت بپھری ہوئی تھی لیکن منظم نہ تھی' حکومت پوری طرح منظم تھی اور اس قوت کو کچل ڈالنے کا ارادہ کر چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حکومت بار بار اشتعال انگیزیوں سے کام لے کر جناب بھٹو کو مجبور کر رہی تھی کہ وہ براہ راست تصادم کی طرف آ جائیں۔ لیکن وہ ایسی ہر کوشش کو کامیابی سے طرح دے کر ناکام کر دیتے۔ جہاں حکومت مقابلے کے لئے تیار ہوتی' وہاں وہ عوام کو خوبصورتی سے بچا کر نکال لے جاتے اور جہاں حکومت ذرا غفلت کرتی وہ آگے بڑھ کے اس پر زوردار چوٹ کر جاتے' ان کے اس ماہرانہ جدید انقلابی طرزِ سیاست نے حکمرانوں کو مزید جھلاہٹ اور غصے میں مبتلا کر دیا۔ وہ اس جھلاہٹ میں زیادہ احمقانہ فیصلے کرتے چلے گئے اور یہی وہ میدان تھا' جہاں بھٹو حکمرانوں کو گھیر کر لا رہے تھے۔ جھلاہٹ' غصے اور غیظ و غضب کا میدان !' جہاں عقل و شعور انسان کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ جناب بھٹو کی اس سیاسی حکمت عملی کا علمی تجزیہ کر کے اگر کوئی رپورٹ مرتب کی جائے تو جدید سیاست کے طلباء کی بہترین رہنمائی کی جا سکتی ہے۔

www.bhutto.org

باب ہشتم

جدوجہد کے میدان میں

سرکاری دانشوروں اور الزام تراشیاں کرنے والوں کو اپنے مدلّل جوابات میں الجھا کر بھٹو خود پھر رابطہ عوام کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ اس بار انہوں نے ملتان کا انتخاب کیا تھا۔ حکومت ابھی ایک محاذ سے فارغ نہ ہوتی تھی کہ وہ دوسرا محاذ کھول دیتے تھے۔ اب تمام تر توجہ ملتان کی جانب مبذول ہو گئی۔ ضلع کے تمام افسروں کو ہنگامی احکامات جاری کئے گئے۔ حاشیہ بردار ممبران قومی و صوبائی اسمبلی کو افسروں کی طرف سے ہدایات دی گئیں کہ بھٹو کو اس دورے میں پوری طرح ناکام کیا جائے۔ کمشنر ملتان کو حکم دیا گیا تھا کہ "تم اس دورے کو ناکام نہ بنا سکے تو بھٹو کو ختم کرا دو" حکومت یہ منصوبے بنا رہی تھی اور ملتان کے مزدور کسان اور غریب لوگ یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ اپنے قائد کی مثالی پذیرائی کریں گے' بھٹو ملتان ایئرپورٹ پر اترے تو ان کے استقبال کے لئے بے پناہ ہجوم جمع تھا جو آمریت کے خلاف اور بھٹو کے حق میں پُرجوش نعرے لگا رہا تھا' ہجوم کی کثرت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ بھٹو کو ایئرپورٹ سے باہر آنے میں ایک گھنٹے سے زائد وقت لگا' رات کو کمشنر ملتان نے گورنر کا تلخیوں سے بھرا ہوا ٹیلیفون سن کر وعدہ کیا کہ وہ شیزان ہوٹل کے استقبالئے کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ فون رکھتے ہی کمشنر نے پولیس افسروں اور ممبران اسمبلی پر چڑھائی کر دی۔

"تم لوگوں نے تو کہا تھا ہم دفعہ 144 کے بغیر ہی بھٹو سے نپٹ لیں گے"

ان لوگوں نے اس بار اپنی کامیابی کا یقین دلایا اور ایئرپورٹ والے شاندار استقبال کی خفت مٹانے کے لئے زیادہ منظم انداز میں بھٹو کو ختم کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا۔

www.bhutto.org

شیزان کے استقبالئے میں تشریف لے جانے کے لئے بھٹو نے جس راستے کا انتخاب کیا' اس پر غنڈے مقرر کر دیئے گئے کہ وہ جگہ جگہ بھٹو کی کار پر پتھراؤ کریں اور اگر وہ پھر بھی نہ رکیں تو ان پر حملہ کر دیا جائے۔ بھٹو کے جان نثاروں نے انہیں اس پروگرام کی اطلاع دے دی' سرکاری سازش کے خلاف عوام نے اپنا پروگرام مرتب کر لیا۔ پیپلز پارٹی کے کارکن بھی بالکل اسی انداز میں مقررہ راستے پر کھڑے ہو گئے جیسے یہیں سے بھٹو کو گزر کے شیزان پہنچنا تھا۔ حکومت اور اس کے مقررہ غنڈے مطمئن تھے کہ وہ اپنی سازش پر عمل کر لیں گے اور پارٹی کے کارکن دل ہی دل میں ان پر ہنس رہے تھے' بھٹو پروگرام کے مطابق دوسرے راستے سے شیزان کے اندر پہنچ گئے تو حکام کو اس کی اطلاع ملی' اس وقت تک سپاسنامہ شروع کیا جا چکا تھا۔ بھگدڑ کے عالم میں غنڈوں کو شیزان کے باہر جمع کیا گیا۔ ان دنوں ہوٹل کی عمارت زیر تعمیر تھی' ابھی سپاسنامہ شروع ہی ہوا تھا کہ کھڑکیوں اور شیشوں پر اینٹ پتھروں کی برسات شروع ہو گئی۔ غنڈے دروازے کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ باہر پولیس ان کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ استقبالئے میں شریک مہمانوں نے آگے بڑھ کر غنڈوں سے دست بدست لڑائی شروع کر دی' شیزان کے بیروں نے بھٹو صاحب کے آگے میزیں کھڑی کر دی تھیں۔ ان کے نظروں کے اوجھل ہو جانے کی وجہ سے کسی نے کہا "بھٹو صاحب بھاگ گئے" اور بھٹو صاحب نے میز کو ایک طرف ہٹا کر ڈانٹتے ہوئے کہا .....

"شٹ اپ"

باہر یہ عالم تھا کہ ہوٹل کے سامنے لڑکیوں کے ہاسٹل کی چھت سے پولیس اور غنڈوں پر زبردست پتھراؤ جاری تھا اور وہ عجیب بدحواسی کے عالم میں ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ لڑکیوں کی پوزیشن ایسی تھی کہ ان پر جوابی پتھراؤ نہیں کیا جا سکتا تھا اور آنسو گیس یا گولی چلانے کا حکام کو حوصلہ نہیں پڑ رہا تھا۔ کیونکہ لڑکیوں پر اس ظلم کی صورت میں پورے ملک میں طوفان اٹھ کھڑا ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اندر سے استقبالئے میں شریک مہمانوں اور دوستوں نے اور باہر سے کارکنوں اور لڑکیوں کے پتھراؤ نے غنڈوں کو بے بس کر دیا اور وہ پولیس کی سرپرستی کے باوجود میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے اور بھٹو نے استقبالئے کا پروگرام مکمل ہونے تک' اس میں شرکت کی' یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا کہ کسی سیاست دان نے پولیس اور غنڈوں کی مشترکہ کوشش کو عوامی وقت سے پسپا کر کے اپنا پروگرام مکمل کیا۔

قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اسلام آباد اور لاہور میں اس کا کیا ردِ عمل ہوا ہو گا اور ضلع کی انتظامیہ کو کس قسم کے احکامات دیئے گئے ہوں گے دوسرے روز 17 جنوری کو بھٹو نے خانیوال کے جلسے کے لئے روانہ ہونا تھا۔ قادر پور راں راستے میں ایک چھوٹا سا قصبہ آتا ہے۔ یہاں ان پر قاتلانہ حملے کا انتظام کیا گیا تھا' صاف ظاہر تھا کہ یہ رات کے خاص احکامات کا نتیجہ ہے۔ اس قصبے کے باہر سڑک پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ جس نے آگے بڑھ کر بھٹو صاحب کے قافلے کی کاروں کو روکا۔ یہ لوگ پستولوں' بندوقوں اور پتھروں

www.bhutto.org

سے مسلح تھے۔ ایک نے آگے بڑھ کر کار کے ٹائر پھاڑ دیئے۔ موقع پر موجود پولیس کے کارندوں نے منہ دوسری طرف کر لئے۔ یہ صورت حال دیکھ کر بھٹو کے رفقانے بھی پستول نکال لئے اور ان کا رخ حملہ آوروں کی طرف کر کے واپس کاروں میں آئے اور ملتان کی جانب روانہ ہو گئے۔ لیکن بھٹو مصر تھے کہ میں خانیوال ضرور جاؤں گا۔ کار کو کھیتوں میں ڈلوا کر مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے خانیوال پہنچ گئے۔ شہر سے تین میل دور ہی انہیں سڑک پر حد نگاہ تک کسانوں کا ہجوم نظر آیا۔ ان لوگوں سے کہا گیا تھا کہ قادر پور راں میں بھٹو کی کار پنکچر کر دی گئی تھی اور وہ اسے چھوڑ کر واپس ملتان چلے گئے ہیں۔ لیکن ان لوگوں نے کسی کی بات کا یقین نہیں کیا۔ ظاہر ہے بھٹو کو اپنے درمیان پا کر ان کے جذبات کا کیا عالم ہو گا؟ اس جلسے میں انہوں نے قاتلانہ حملے کی روداد بتائی تو لوگ جوشِ غضب سے بُری طرح بپھر گئے۔ لیکن بھٹو نے انہیں صبر و تحمل اور ہوش و حواس کے ساتھ تحریک جاری رکھنے کی تلقین کی اور اس طرح حملہ آوروں کی تکا بوٹی کرنے پر تُلے ہوئے ہجوم کو کنٹرول کیا۔

بھٹو کی فراست نے یہاں بھی حکمرانوں کو شکست دے دی تھی۔ اگر وہ قادر پور راں میں مقابلہ نہ کرتے تو ان کی جان خطرے میں تھی' مقابلے کے بعد' واپس ملتان چلے جاتے' تو خانیوال میں شکوک و شبہات کی وجہ سے عوام میں اشتعال پھیل جانے کا اندیشہ تھا اور حکومت اس ہنگامے کی آڑ میں جبر و تشدد سے کام لے کر اُبھرتی ہوئی عوامی تحریک پر کاری ضرب لگا سکتی تھی۔ بھٹو نے ہر قیمت پر وہاں پہنچ کر اس حربے کو بھی ناکام بنا دیا۔ واپسی پر قادر پور راں کے باشندوں نے بتایا کہ حملہ آور پولیس کے ٹرکوں میں پولیس ہی کی حفاظت میں وہاں لائے گئے تھے اور مقامی باشندوں کو دہشت زدہ کر کے وہاں سے بھگا دیا گیا تھا۔

ملتان کے حکام کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ بھٹو قادر پور راں سے آگے نہیں بڑھ سکے' تو انہوں نے کامیابی کے جشن منانے شروع کر دیئے۔ مگر جب وہ کافی دیر ملتان نہیں پہنچے تو وائرلیس اور ٹیلیفون شروع ہوئے اس دوران جب پتہ چلا کہ بھٹو تو خانیوال میں تقریر کر رہے ہیں تو حکومت کے حامیوں اور حکام کے ہوش اڑ گئے۔ پھر ان "ذمہ دار" لوگوں کی ہنگامی میٹنگ بلائی گئی۔ انہیں ڈانٹا گیا' وہ سب حیرت کا اظہار کر رہے تھے کہ آخر اس قدر سخت اقدامات کے باوجود بھٹو خانیوال پہنچ کیسے گئے؟ یہ کس طرز کا سیاستدان ہے جو ان تشدد آمیز حربوں کو بھی ناکام بناتا چلا جا رہا تھا؟ یہ لوگ اپنی جگہ سچے تھے۔ اس سے قبل ان کا واسطہ کبھی ایسے جرأت مند سیاست دان سے پڑا ہی نہیں تھا۔ اس میٹنگ میں پھر طے کیا گیا کہ 19 جنوری کو قاسم باغ کے جلسہ عام میں بھٹو کو تقریر نہ کرنے دی جائے۔

سرکاری سیاستدانوں کی ڈیوٹیاں لگا دی گئیں۔ قاسم باغ کافی بلندی پر واقع ہے اور اس میں داخل ہونے کے چار دروازے ہیں۔ ہر گروپ کو ایک ایک دروازے کا نگران مقرر کر کے حکم دیا گیا کہ وہ ان

www.bhutto.org

راستوں سے بھٹو کو باغ کے اندر داخل ہونے سے روک دیں۔ ورنہ جس نگران گروہ کے دروازے سے بھی بھٹو اندر گئے' اسے حکومت کے عتاب کا نشانہ بننا پڑے گا۔ راتوں رات غنڈوں اور اسلحہ کا انتظام ہونے لگا۔ بھٹو کی عوامی سی آئی ڈی نے اس پورے منصوبے کی خبر دے دی۔ ان کے ساتھیوں نے بھی رات ہی کو ہزاروں ڈنڈے منگوا کر سٹیج کے نیچے چھپا دیئے اور سرگرم مزدور کسان اور طلبہ ساتھیوں کو آگاہ کر دیا کہ وہ پہلے ہی سے سٹیج کے ارد گرد جمع ہو جائیں اور بوقت ضرورت اس کے نیچے سے ڈنڈے نکال کر صورت حال کا مقابلہ کریں۔ جلسہ کا وقت شام کو تھا لیکن دونوں فریقوں نے صبح ہی سے اپنے اپنے طور پر تیاریوں کا آغاز کر دیا تھا۔ غنڈے چاروں دروازوں پر اپنے مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ عوام بھی دس بجے ہی جلسہ گاہ میں آنے لگے۔ ایک میلے کا سماں تھا۔ گول باغ لاہور والا حربہ آزمانے کے لئے پانی چھوڑا گیا تو کارکنوں نے ہاتھوں سے پائپ بند کر دیا اور ان کے نعرے سن کر حکام کو جلد ہی پائپ بند کرنے پڑے۔ بارہ بجے دوپہر کو جس وقت بھٹو صاحب وکلاء سے خطاب کر رہے تھے تو جلسہ گاہ پوری طرح بھر چکی تھی' اسی مرکزی دروازے سے گزر کے جلسہ گاہ تک جانے میں' نہ صرف فساد کا اندیشہ تھا۔ بلکہ اس طرح کا ہنگامہ جلسے کو افراتفری کا شکار بھی کر سکتا تھا' چنانچہ بھٹو جلسے کے وقت سٹیج کے عین عقب میں پہنچے اور سب لوگوں کی توقع کے خلاف قلعہ کی بلندی پر سیڑھیوں کے بغیر گھسٹ گھسٹ کر چڑھنے لگے۔ عوام نے انہیں یوں دیکھا تو کچھ ہلچل پیدا ہوئی۔ لیکن پارٹی کے ایک لیڈر نے لوگوں کو اشارے سے منع کر دیا کہ وہ ڈسپلن برقرار رکھیں' ایسا نہ ہو کہ ان کی حرکات سے حکام کو اندازہ ہو جائے کہ بھٹو صاحب جلسہ گاہ میں آ رہے ہیں' یہ بھٹو کا پیدا کردہ انقلابی شعور تھا کہ عوام نے اس اشارے کو سمجھ لیا اور عام طور پر مقبول مقررین کی آمد پر جلسہ گاہوں میں جس قسم کی ہلچل پیدا ہوتی ہے' وہاں بالکل نہ ہوئی' جب بھٹو صاحب سٹیج پر پہنچ گئے تو لوگوں کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا اور انہوں نے بے تابی سے پُرجوش نعرے بلند کئے۔ جوش و ولولے کا یہ عالم تھا کہ جناب بھٹو پندرہ منٹ تک سٹیج پر کھڑے رہے اور لاکھوں عوام اس پورے عرصے میں مسلسل تالیاں بجا کر آمریت کے خلاف اور بھٹو کے حق میں نعرے بلند کرتے رہے۔ ادھر حکام اور ان کے گماشتوں کے مقرر کردہ غنڈے سر بہ گریباں تھے کہ اس قدر محتاط بندوبست کے باوجود بھٹو سٹیج پر کیسے پہنچ گئے؟ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ناز و نعم کے پروردہ اور حکومت میں اتنی اہم پوزیشن پر فائز رہنے والے بھٹو' اس انقلابی جان جوکھم کا راستہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔

ابھی بھٹو نے تقریر کا آغاز کیا تھا اور حاضرین خاموشی سے ان کے خیالات سننے کے لئے ہمہ تن گوش تھے کہ سٹیج کے سامنے پندرہ سولہ فٹ کے فاصلے سے اچانک ایک گروہ اٹھا اور ہاکیاں لہراتا ہوا سٹیج کی طرف بڑھنے لگا۔ اس پر افراتفری مچ گئی' بہت سے لوگ سٹیج سے چھلانگیں مار کر اتر گئے اس ہنگامے میں بھٹو اسی طرح سٹیج پر تنے کھڑے تھے' ان کی آواز ابھری۔

www.bhutto.org

عبدالحفیظ پیرزادہ، کوثر نیازی، وزیراعظم بھٹو، صادق قریشی وزیراعلیٰ پنجاب

www.bhutto.org

"ملتان کے عظیم بہادر شہریو! یہ کرائے کے چند غنڈے ہیں' ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرو اور انہیں بتادو کہ عوام کی طاقت کے سامنے کوئی طاقت نہیں ٹھہر سکتی۔"

عوام نے اپنے رہنما کو یوں دلیری کے ساتھ حملہ آوروں کے سامنے سینہ سپر دیکھا تو انہوں نے پلٹ کر ان غنڈوں کو گھونسوں اور ٹھوکروں پر لے لیا۔ چند ایک تو وہیں گر گئے اور چند بد حواسی کے عالم میں بھاگ کھڑے ہوئے' لیکن آمریت کے ایجنٹوں کا یہ واحد بندوبست نہیں تھا۔ اس ٹولے کی شکست کے بعد جب بھٹو نے دوبارہ تقریر شروع کی تو چند ہی منٹ بعد سٹیج کے زیادہ قریب سے ایک دوسرا گروہ اٹھا۔ ان میں کچھ پستولوں سے اور چند ایک ننگی تلواروں سے مسلح تھے۔ ان میں ایک جو تلوار لہراتا ہوا اسٹیج کی جانب بڑھ رہا تھا وحشیانہ انداز میں للکارتا سنا گیا ...... "بھٹو آج تم زندہ واپس نہیں جاؤ گے" اور اس موقع پر بھٹو کی للکار گونجی'

"بھائیو! زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے غنڈے ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے' جو غنڈہ جس کے نزدیک ہے وہ اسے پکڑ لے' جو مجھ تک آیا میں خود اس سے نپٹ لوں گا' آپ نے چند لمحے قبل ان کے حوصلے دیکھ لئے ہیں' اب پھر دو دو ہاتھ کر لیں"

لوگوں نے ان غنڈوں کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا اور پھر جوتوں 'مکوں اور ٹھوکروں سے ان کا مقابلہ کرنے لگے۔ کچھ لوگوں نے پہلے حملے کے بعد سٹیج کے نیچے سے ڈنڈے نکال لئے تھے' بھٹو اس لڑائی کے دوران سٹیج پر عوام کے سامنے کھڑے رہے' اچانک ایک شخص سٹیج پر چڑھ آیا اور بھٹو کے قریب آکر اس نے بڑھک ماری ہی تھی کہ کوکا کولا کی ایک بوتل اس کے سر پر آکر لگی اور کرسیوں اور بوتلوں کی بوچھاڑ نے اسے نڈھال کر کے وہیں سٹیج پر گرا دیا۔ عوام بھی غنڈوں کو بے بس کر چکے تھے' کچھ بھاگ گئے اور جو زخمی ہو کر گر پڑے تھے انہیں پولیس بعد میں آکر اٹھا کر لے گئی۔ فتح مند عوام نے جائز احساسِ فخر اور جوش و جذبے کے ساتھ اپنے رہنما کی تقریر سنی' عوام نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ ان کا محبوب رہنما میدان میں موجود رہا اور اپنی زندگی سے بے نیاز ہو کر ان کے دوش بدوش حملہ آوروں کا مقابلہ کرتا رہا۔ عوام مدت سے ایسے رہنما کی تلاش میں تھے اور یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ بھٹو کی صورت میں انہیں وہ عظیم رہنما مل گیا تھا' ورنہ اس سے قبل کی سیاسی روایت یہ تھی کہ جلسوں میں چوہا چھوڑنے سے جلسے اکھڑ جاتے تھے اور قائدین دم دبا کر بھاگ نکلتے تھے۔ بھٹو کی ان جراٴت مندانہ سرگرمیوں کا یہ نقطہ عروج تھا۔ عوام اب جوق در جوق پیپلز پارٹی میں شامل ہونے لگے تھے۔

ملتان کے ان واقعات میں حکّام اور آمریّت کی پے در پے شکستوں نے گورنر موسیٰ کو بے چین کر دیا۔ وہ ملتان تشریف لے گئے اور تمام اعلیٰ حکام اور ممبران اسمبلی کا مشترکہ اجلاس بلا کر' ان کو بھٹو کے مقابلے میں اس بری طرح ناکام رہنے پر ملامت کی' آخر نوجوان ایم این اے حامد رضا گیلانی نے جراٴت

www.bhutto.org

سے کام لے کر کہا'

"جناب ہم نے عملی طور پر بھٹو کو قتل کرنے کے سوا دوسرا ہر طریقہ آزما کر دیکھ لیا ہے۔ اگر ہم پھر بھی ناکام رہے تو اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ عوام بھٹو کے ساتھ ہیں اور جب عوام کسی قائد کے لئے اس طرح قربانیاں دینے پر تل جائیں تو پھر اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا"

یہ جواب سن کر گورنر صاحب واپس لاہور چلے گئے اور بھٹو کے طوفانی دورے پھر شروع ہو گئے' ساہی وال' جھنگ اور سرگودھا کے علاوہ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں آمریت کے خلاف عوام کی صفوں کو منظم کرتے ہوئے وہ لائل پور تشریف لائے اور 26 جنوری کو اقبال پارک میں تین لاکھ کے عظیم اجتماع سے خطاب کیا۔ اب حکمرانوں نے دفعہ 144 کا حربہ آزمانے کا فیصلہ کر لیا تھا' لیکن بھٹو اسے توڑتے چلے جارہے تھے اس دورے نے آمریت کو مزید کمزور کر دیا عوامی محاذ پر' بھٹو کا یہ پہلا زوردار معرکہ تھا جس میں انہوں نے رجعت پسندوں' حکمرانوں' انتظامیہ اور اس کے سیاسی حاشیہ برداروں کو اکٹھے شکست دی تھی۔ آمریت کے مہرے اس دورے کے نتیجے میں ابھرنے والے طوفان کے سامنے بند باندھ رہے تھے اور بھٹو کراچی میں اپنے ذاتی سٹاف کو' اپنے بعد معاملات سنبھالنے کی ہدایات دے کر ایک نئے معرکے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

ذاتی امور کو اپنے بغیر چلانے کی ہدایات دینے کے بعد انہوں نے اپنی بیگم صاحبہ سے کہا' اب میں زیادہ بڑے خطروں سے دوچار ہونے والا ہوں۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ آپ ہر قسم کے حالات کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیں' بیگم صاحبہ تو پہلے ہی سے تیار تھیں اور آگے چل کر اپنے خاوند کی عدم موجودگی میں عوامی تحریک کی قیادت کا اعزاز ان کے مقدر میں لکھا تھا۔ ذاتی طور پر تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کی پیش بندیاں مکمل کر کے انہوں نے 21 ستمبر 1968ء کو حیدر آباد میں پارٹی کے دوسرے کنونشن کا اعلان کر دیا۔ پونے دس ماہ کے اس مختصر سے عرصے میں' جب سے پارٹی قائم ہوئی تھی' جناب بھٹو کی دن رات کی محنت' شاندار منصوبہ بندی' کامیاب سیاسی حکمت عملی اور عوام سے وسیع رابطوں کی بدولت اب پیپلز پارٹی اس انقلابی تحریک میں بدل چکی تھی جس کی نظریاتی قوت بھٹو تھے اور عملی قوت پورے ملک کے محنت کش اور غریب عوام۔

اس کنونشن کے اعلان کے ساتھ ہی حکومت کی طرف سے تمام ذرائع ابلاغ کو سختی سے ہدایات دے دی گئیں کہ اس کے بارے میں کسی قسم کی خبر شائع نہ کی جائے۔ حیدر آباد میں دفعہ 144 کا نفاذ کر دیا گیا۔ 20 ستمبر کو بھٹو بذریعہ ٹرین کراچی سے حیدر آباد تشریف لائے۔ دفعہ 144 کے باوجود ہزاروں عوام اسٹیشن پر ان کے پُرجوش استقبال کے لئے موجود تھے۔ اب بھٹو کے لئے اس طرح کے

www.bhutto.org

پُرہجوم استقبال معمول بن چکے تھے اور کسی بھی شہر کے حکام کے بس میں یہ بات نہیں رہ گئی تھی کہ وہ بھٹو کے خیر مقدم کے لئے جانے والے پرجوش عوام کے راستے میں کوئی بھی رکاوٹ ڈال سکیں۔ دوسرے دن کنونشن شروع ہوا اس میں تقریر کرتے ہوئے جناب بھٹو نے تفصیل سے ان تمام الزامات کا جواب دیا جو ایوب خاں کے حاشیہ برداران پر لگا رہے تھے۔ انہوں نے حکومت سے اپنی علیحدگی کے پس منظر پر روشنی ڈالی اور پھر اپنی جدوجہد میں تشدّد' دھمکیوں اور الزام تراشیوں کے ذریعے رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے حکمرانوں کو للکارا۔

"میں بزدل نہیں ہوں کہ دفعہ 144 اور ڈیفنس آف پاکستان رولز سے خوفزدہ ہوتا پھروں نہ ہی میں تمہاری توپوں سے ہراساں ہوں' تم اپنی توپیں نکال لاؤ' پاکستان کے عوام میرے ساتھ ہیں اور یاد رکھو عوام ایٹم بم سے بھی زیادہ طاقتور ہوتے ہیں' تم دیکھو گے کہ میں جمہوریت اور سوشلزم کی خاطر اپنے عوام کے دوش بدوش سر پر کفن باندھ کے نکل آؤں گا۔ تمہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ میں اپنی کشتیاں جلا چکا ہوں۔ تم عوام کی تباہ حالی کے ذمہ دار ہو یاد رکھو تمہارے آرام و آسائش بھی چھین لئے جائیں گے۔ تمہاری حکومت نے عوام کا خون چوسنے والے 22 گھرانوں کی خوشحالی کی خاطر بارہ کروڑ عوام کو برباد کیا ہے۔ حکومت کو یہ سودا مہنگا پڑے گا۔ تم عوام کی خاموشی سے یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ عوام بزدل ہیں۔ قوم بزدل نہیں ہے۔ اس کے نام نہاد رہنما بزدل ہیں۔ جب یہ بہادر قوم اپنے سے چار گنا بڑی طاقت کا مقابلہ کر رہی تھی تو یہی رہنما ڈر کے مارے گھروں میں دبکے ہوئے پڑے تھے۔ یہ قوم سامراجیوں اور ان کے بھارتی ایجنٹوں سے نبرد آزما رہ چکی ہے۔ اس لئے یہ اب ہر قسم کے ظلم و جبر کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہے۔"

یہ مکمل اور بھرپور تقریر تھی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ سابقہ احکامات کے برعکس دوسرے روز اخبارات میں یہ پوری تقریر شائع کر دی گئی۔ خصوصاً "پاکستان ٹائمز" نے اسے نمایاں طور پر چھاپا تھا۔ یہ انہونی بات دیکھ کر بھٹو نے پہلے ہی اندازہ کر لیا کہ "میری تقریر کو اس طرح شائع کرنے کے پیچھے ضرور کوئی مقصد ہے" اور اگلے ہی روز وہ مقصد سامنے آ گیا۔ گورنر مغربی پاکستان جنرل موسیٰ نے اس تقریر کے جواب میں بھٹو پر 21 الزامات عائد کئے اور ان کی پورے ملک میں تشہیر کی گئی۔ بھٹو اپنی حکمت عملی کے تحت حکمرانوں کے لئے جو جال بچھا رہے تھے وہ خود اس میں پھنستے جا رہے تھے۔ موسیٰ خاں کی طرف سے الزامات کی فہرست پڑھ کر بھٹو نے تبصرہ کرتے ہوئے اپنے احباب سے کہا۔

"اب ان لوگوں کی موت کے دن واقعی قریب آ گئے ہیں۔ موسیٰ نے مجھ پر 21

www.bhutto.org

الزامات نہیں لگائے بلکہ مجھے 21 توپوں کی سلامی دی ہے۔ اب میں انہیں ایسا جواب دوں گا کہ ان کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔ اب یہ جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو رہی ہے۔"

بھٹو نے جوابی طور پر نہ صرف ان الزامات کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے بلکہ وہ حکومت کی طرف سے قائم ہونے والے مقدمات کا بھی دلیرانہ مقابلہ کر رہے تھے۔ اسلحہ جمع کرانے کے حکم پر عدالت کی طرف رجوع کرتے وقت جب عدالت کو اس اسلحہ کی فہرست مہیا کی گئی جو بھٹو صاحب سے مانگا جا رہا تھا تو پوری قوم حکمرانوں کی بدحواسی سے لطف اندوز ہوئی تھی۔ اسلحہ یہ تھا۔

19 زیبائشی تلواریں جو دیوار سے لٹکی ہوئی تھیں۔ تین پرانی ساخت کی بندوقیں جن میں ہاتھ سے بارود بھرا جاتا تھا۔ ایک ہوائی پستول اور بچوں کے کھیلنے کی دو توپیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔

مقدمات اور آمرانہ احکامات کا مقابلہ کرنے اور موسیٰ خاں کے الزامات کا منہ توڑ جواب دینے کے بعد، بھٹو نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب خاموش رہنے کا وقت نہیں رہا۔ کنونشن کے بعد ان کا ارادہ کچھ دن آرام کرنے کا تھا۔ مگر اب انہوں نے سوچا کہ اس بڑھتے ہوئے دباؤ کی روشنی میں سیاسی جدوجہد میں ذرا سا بھی وقفہ آیا تو حکمران سوچ لیں گے کہ ان کے حربے اثر انداز ہو رہے ہیں اور یوں وہ مزید جبر و تشدد کے حربے آزمائیں گے۔ صوبہ سرحد کا دورہ شیڈول کے مطابق کچھ دنوں کے بعد شروع ہونے والا تھا۔ لیکن اب بھٹو نے فیصلہ کر لیا کہ یہ دورہ قبل از وقت ہی شروع کر دیا جائے۔

25 اکتوبر 1968ء کو وہ آمریت کے تابوت میں آخری کیلیں گاڑنے کے لئے پشاور کے ہوائی اڈے پر اتر رہے تھے اور پورا پشاور شہر عوامی تحریک کے انقلابی رہنما کو فاتحانہ انداز میں خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ ایک شاندار جلوس کی صورت میں انہیں شہر لے جایا گیا جہاں سے شام کو انہیں کوہاٹ کے جلسہ عام میں خطاب کے ساتھ دوسرے بڑے معرکے کا آغاز کرنا تھا۔ دفعہ 144 کے باوجود جلسے کی حاضری قابلِ دید تھی۔ اس سے قبل کوہاٹ میں اتنے بڑے اجتماع کی نظیر نہیں ملتی۔ پھر انہوں نے پشاور کے طلبہ کو خطاب کیا۔ چارسدہ اور مردان میں دفعہ 144 کے نفاذ کے باوجود عظیم الشان جلسے منعقد کئے۔ ایبٹ آباد میں آمریت کو للکارا، مانسہرہ کے عوام سے ملے۔ کیمبل پور بار ایسوسی ایشن میں آمریت کو جھٹکے دیئے۔ غرض وہ صوبہ سرحد میں جہاں بھی گئے حکمرانوں کے تمام حربوں اور دفعہ 144 کی تمام پابندیوں کے باوجود طوفان اٹھاتے چلے گئے۔ یہ صورت حال دیکھ کر ایک صوبائی وزیر موسیٰ خاں کے پاس پہنچا اور پیشکش کی کہ وہ اپنے علاقے ڈیرہ اسماعیل خاں میں بھٹو کی سیاست کو دفن کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ انتظامیہ کو اس کی تمام ہدایات پر پوری طرح عمل کرنے کا حکم دے دیا جائے۔ ضلع کے ڈپٹی کمشنر کو اس کی خواہش کے مطابق حکم دے دیا گیا۔

www.bhutto.org

پروگرام کے مطابق جناب بھٹو کو 30 اکتوبر کو ڈیرہ کے دورے پر جانا تھا۔ لیکن اچانک کیمبل پور میں ان کے بیمار ہو جانے کی وجہ سے اس میں التواء ہو گیا اور انہیں راستے میں روکنے کے لئے مسلح غنڈوں کی جو آٹھ بسیں بھر کے لائی گئی تھیں۔ ان کے سواروں نے اس بازار میں ہنگامہ برپا کر دیا جہاں پیپلز پارٹی کا دفتر تھا۔ وہ بھٹو کے استقبال کے لئے عوام کی طرف سے لگائے گئے آرائشی دروازوں اور بینروں کو نوچتے کھسوٹتے باہر نکل گئے۔ شہر میں دفعہ 144 نافذ تھی اور یہ غنڈے پولیس کی سرپرستی میں ہنگامہ آرائی کر رہے تھے۔ عوام نے یہ دیکھ کر فیصلہ کر لیا کہ اپنے رہنما کا استقبال کرنے کے لئے وہ بھی دفعہ 144 کی پروا نہیں کریں گے اور کھل کر اپنے دلی جذبات کا اظہار کریں گے۔ دوسرے دن جناب بھٹو کو ڈیرہ پہنچنا تھا۔ عوام نے استقبال کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آج پولیس دفعہ 144 کی حرمت کا خاص خیال رکھ رہی تھی جہاں بھی لوگ اکٹھے نظر آتے ان پر لاٹھی چارج کیا جاتا۔ مگر عوام نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ان حربوں کا مقابلہ کریں گے۔ چنانچہ کئی مقامات پر لوگوں نے باقاعدہ طور پر پولیس کا مقابلہ کیا۔ جناب بھٹو ڈیرہ اسماعیل خاں سے چند میل دُور کھوڑ کے مقام پر تھے کہ انہیں حق نواز گنڈہ پور مرحوم اور بہت سے دوسرے کارکن پُرجوش نعرے لگاتے سڑک پر دکھائی دیئے۔ یہاں انہیں شہر کی صورت حال سے آگاہ کیا گیا اور بتایا گیا کہ عوام پولیس تشدد کا مقابلہ کرتے ہوئے 'ان راستوں پر بے جگری کے ساتھ ڈٹے ہوئے ہیں' جن سے جناب بھٹو کو گزرنا ہے۔ ادھر وہ وزیر صاحب اپنے کارندوں کے ہمراہ ایک سڑک پر کھڑے اس اطلاع کے منتظر تھے کہ بھٹو شہر میں داخل نہیں ہو سکے۔ لیکن بھٹو اور ان کے رفقاء راستے میں کھڑے غنڈوں کو شکست دے کر عوام کے بے پناہ ہجوم کے ساتھ شہر کی طرف آ رہے تھے۔ اس چھوٹے سے شہر میں تیس ہزار سے زیادہ افراد اپنے رہنما کی کار اپنے جلوس میں لئے فاتحانہ انداز کے ساتھ چل رہے تھے۔ ہجوم کے ایک حصے کو وزیر صاحب کی موجودگی کی اطلاع ملی تو ان کی کار کو گھیر لیا گیا۔ ان کے محافظوں اور کارندوں کو بے بس کر کے انہیں کار سے باہر نکالا گیا اور مجبور کیا گیا کہ وہ "ذوالفقار علی بھٹو زندہ باد" کہیں اور وزیر کو اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ وہ بھٹو زندہ باد اور ایوب خاں مردہ باد کے نعرے بلند کریں۔ بعد میں ان کے ساتھی غنڈوں کو بھی عوام کے اصرار پر یہی نعرے لگانے پڑے اور یوں بھٹو کی سیاست کو اپنے علاقے میں دفن کرنے کے عزائم لے کر آنے والا وزیر اپنے ہی سرپرست آمر کی سیاست کو دفن کر کے گھر کو روانہ ہو گیا۔

یہاں ایک دلچسپ واقعے کا ذکر بے جا نہ ہو گا۔ جب بھٹو شہر کی جانب جا رہے تھے تو انہوں نے چند میل پہلے سکول کے بچوں کو سیاہ جھنڈیاں لے کر ایک قطار میں کھڑے دیکھا۔ وہ نعرے لگا رہے تھے "بھٹو واپس جاؤ ....." جناب بھٹو نے اپنی کار ان بچوں کے قریب رکوائی اور اپنے ساتھ چلنے والے کارکنوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے سیدھے ان کے پاس پہنچے اور پوچھا "بچو کدھر ہے بھٹو؟" ..... ایک

www.bhutto.org

بچے نے جواب دیا "ہمیں کیا معلوم کدھر ہے؟ ہمیں تو غلام سرور خاں نے حکم دیا ہے کہ شام تک یہیں کھڑے رہ کر یہ نعرے لگاتے رہو' ہم صبح سے لگے ہوئے ہیں۔" بھٹو یہ سن کر واپس کار کی طرف مڑتے ہوئے بولے "ہاں لگاؤ" مگر اتنے میں کسی نے بچوں کو بتایا دیا کہ "یہی تو بھٹو ہیں" بچوں نے جھٹ جھنڈیاں پھینک کر بھٹو زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ بھٹو مسکراتے ہوئے اپنی کار میں بیٹھ گئے۔ یہ بچے کافی دور تک تعاقب میں دوڑتے' بھٹو زندہ باد کے نعرے لگاتے رہے۔ شہر سے قریب ہجوم میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اب لوگوں کا جوش و خروش بھی بڑھ رہا تھا۔ اتنے میں جب بھٹو صاحب کی نظر خون میں لت پت کھڑے چند لوگوں کی طرف گئی تو اس غیر معمولی جوش و خروش کی وجہ ان کی سمجھ میں آ گئی۔ جب انہوں نے رُک کر ان لوگوں سے حالات دریافت کئے تو پتہ چلا کہ پولیس کئی دفعہ لاٹھی چارج کر کے انہیں بھٹو کے راستے سے ہٹنے کا حکم دے چکی تھی اور یہ لوگ تھے کہ زخم کھا کر بھی خون بہاتے ہوئے اپنے قائد کے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ تشدّد کے اس حربے کے بعد یہ افواہ سازی کی گئی کہ بھٹو نے آج بھی اپنا دورہ ملتوی کر دیا ہے۔ لیکن لوگ اس بات کو بھی نہیں مانے' انہیں یقین تھا کہ بھٹو ان کے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتے اور اب اس بے پناہ جوش و خروش کی وجہ یہ تھی کہ بھٹو کو اپنے درمیان پا کر وہ دراصل حکومت کے ان کارندوں کو دکھا رہے تھے کہ وہ اپنے جھوٹ کا انجام دیکھ لیں۔ شہر تک آتے ہجوم جوشِ جذبات سے بے قابو ہو چکا تھا اور عوام کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا کہ وہ ان سے خطاب کریں۔ اچانک بھٹو نے کار کا دروازہ کھولا اور تیزی کے ساتھ ہجوم کے اندر سے راستہ بناتے ہوئے ایک مکان کے اندر گھس گئے اور بالکونی میں آ گئے۔ اتفاق سے یہ مکان اس علاقے کے ایک ایم پی اے کا تھا۔ بھٹو کو سامنے دیکھتے ہی عوام کی بے تابی میں اضافہ ہو گیا اور تقریر کے لئے تقاضے بڑھ گئے۔ ادھر ان کی زبان سے چند الفاظ ادا ہوئے تھے کہ پولیس کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ عوام فوری طور پر منتشر ہو جائیں ورنہ ابھی گولی چلا دی جائے گی۔ لیکن عوام نے تقریر سنے بغیر منتشر ہونے سے انکار کر دیا۔ ابھی پولیس افسروں اور لوگوں کے درمیان بحث جاری تھی کہ اچانک چاروں طرف سے لاٹھی چارج' آنسو گیس اور فائرنگ شروع کر دی گئی۔ اب نہتے عوام پر پولیس کی یلغار جاری تھی۔ آنسو گیس شدت کے ساتھ پھیل چکی تھی۔ بھٹو عوام سے کہہ رہے تھے۔

"میرے بھائیوں پُرامن طور پر منتشر ہو جاؤ۔ جب تک تم لوگوں میں کوئی ایک یہاں موجود ہے میں تمہارے سامنے موجود رہوں گا۔"

آنسو گیس کی شدت نے ان کی آنکھوں کو سرخ کر دیا تھا۔ گال آنسوؤں سے تر تھے۔ لیکن بھٹو استقامت کے ساتھ تشدد کا مقابلہ کرتے ہوئے عوام کے درمیان ڈٹے ہوئے تھے۔

www.bhutto.org

پُرامن طور پر منتشر ہونے کی اپیل کے بعد بھی جب پولیس کا تشدد زور پکڑتا گیا اور ادھر عوام نے دیکھا کہ بھٹو اس حالت میں بھی عوام کے ساتھ موجود ہیں تو وہ بھی مشتعل ہو گئے۔ اب انہوں نے بھی مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر جو کچھ ہاتھ آیا پولیس پر پھینکنا شروع کر دیا۔ پولیس کا خیال تھا کہ بھٹو کو یوں سامنے موجود پا کر لوگ زیادہ حوصلے کے ساتھ مقابلہ کر رہے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اپنے حملے کا رخ اس طرف کر دیا۔ جس مکان میں بھٹو صاحب کھڑے ہوئے تھے۔ اس موقع پر حق نواز گنڈہ پور مرحوم بندوق لے کر بھٹو صاحب کے سامنے آ گئے اور للکارتے ہوئے کہا "جب تک ڈیرے کے ایک شہری کے بھی دم میں دم ہے' ہمارے قائد کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا" پولیس اب آنسو گیس کا تمام اسٹاک اس مکان پر ختم کرنے لگی تھی۔ گیس کی تلخی میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔ بھٹو کے تمام ساتھی اپنی اپنی قمیص اتار کر پانی میں بھگو بھگو کر آنکھوں کو لگا رہے تھے۔ لیکن وہ اکیلے اسی طرح اپنی آنکھوں کے ساتھ آنسو گیس کی چبھن برداشت کر رہے تھے۔ اس دوران انہیں پولیس کی طرف سے یہ پیغام پہنچایا گیا کہ

"اگر آپ شہر سے باہر جانے کو تیار ہوں تو ہم بحفاظت آپ کو پہنچا آتے ہیں"

بھٹو کا جواب تھا

"میں عوام کے درمیان ہوں انہیں اس جبر و تشدد کے سامنے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ مجھے ان گولیوں سے خطرہ نہیں' اگر خطرہ ہے تو آپ لوگوں سے ہے۔"

ڈھائی گھنٹے تک جبر و تشدد کا یہ بازار گرم رہا اور عوام مقابلہ کرتے رہے۔ بھٹو اس پورے عرصے میں اپنی جگہ جمے کھڑے رہے۔ یہاں تک کہ پولیس کو مجبوراً اپنی کارروائی بند کرنی پڑی اس دوران سینکڑوں افراد شدید زخمی ہوئے۔ لیکن عوام کے جوش و جذبے میں ذرہ برابر کمی نہ آئی۔

اس تکلیف دہ تجربے اور آنسو گیس کی شدید تکلیف کے بعد بجائے اس کے کہ بھٹو آرام کے لئے کہیں جاتے وہاں سے سیدھے ڈسٹرکٹ بار کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاں انہیں وکلاء سے خطاب کرنا تھا بار کو بھی پولیس نے چاروں طرف سے محاصرے میں لے رکھا تھا اور بہت سے افراد کو مار مار کر اس جرم میں زخمی کر دیا گیا تھا کہ وہ بھٹو کی تقریر سننے کے لئے اندر جانا چاہتے تھے۔ یہاں انہوں نے تقریر کی' ڈیرہ اسماعیل خاں کے عوام کے دلیرانہ کردار کو سراہتے ہوئے آمریت کے خلاف تحریک کو تیز کرنے کی تلقین کی۔ اس روز پولیس نے اٹھارہ مرتبہ شدید اور ان گنت بار خفیف لاٹھی چارج کیا۔ آنسو گیس کے گولے لوگوں کے گھروں کے اندر پھینکے گئے۔ جس کی وجہ سے معصوم بچوں اور گھریلو خواتین تک تشدد کی زد میں آ گئیں۔ لیکن ان تمام کارروائیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوامی جدوجہد زیادہ تیز ہوتی گئی۔

ایوب خاں نے اپنے ہی گھر اپنی لٹیا ڈوبتے دیکھی تو اس کے احمق مشیروں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ خود عوام کے سامنے جا کر بھٹو کے الزامات کے جواب دیں ۔ یہ سیاسی طور پر بنیادی غلطی تھی۔ ایک

www.bhutto.org

وزیر اعظم بھٹو (خوشگوار موڈ میں) کتاب کے مصنف اور عبدالحفیظ پیرزادہ کے ساتھ

www.bhutto.org

طرف تو انتظامیہ دفعہ 144 لگا کر بھٹو کے جلسے روک رہی تھی اور دوسری طرف صدر مملکت کے جلسۂ عام کا پروگرام بنایا جا رہا تھا۔ بھٹو کو رات ہی کو اطلاع ملی کہ انہیں مقررہ جلسہ گاہ میں جلسہ کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے انتظامیہ کے سربراہ کو الٹی میٹم دے دیا۔

"اگر تم نے مجھے جلسے کی اجازت نہ دی تو میں اس روز اسی جگہ جلسہ کروں گا جس روز تم ایوب خاں کے جلسے کے لئے دفعہ 144 ہٹاؤ گے۔ اب فیصلہ کر کے بتا دو۔"

انتظامیہ اس صورت حال کے لئے بالکل تیار نہ تھی۔ مجبوراً اس نے جلسے کی اجازت دے دی مگر تاریخ 6 کے بجائے 5 کر دی۔ مقام ایسا رکھا جو شہر سے کافی دور تھا۔ لیکن دوریاں لوگوں کی محبت و عقیدت کے سامنے کیا حیثیت رکھتی ہیں؟ سابقہ تمام ریکارڈ توڑتے ہوئے' پشاور کے عوام نے بھٹو کی قیادت پر اپنے بھرپور اعتماد کا اظہار کیا' پشاور میں بھی اس سے پہلے اتنا عظیم الشان اجتماع کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ جلسہ گاہ کے قریب ہی خان عبدالقیوم خاں کا مکان تھا۔ وہ ان دنوں سیاسی ریٹائرمنٹ کے دن گزار رہے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے گھر کی چھت سے عوام کا یہ امڈتا ہوا سیلاب دیکھا یہاں بھٹو نے عوامی بیداری کی لہر کا حوالہ دیتے ہوئے حزب اختلاف کی سیاسی پارٹیوں کو بھی غیرت دلائی اور انہیں بے عملی کے کنج سے نکال کر عوامی جدوجہد کا ساتھ دینے کا مشورہ دیا۔ سرحد کے اس دورے کا اختتام صوبہ سرحد میں بیداری اور جدوجہد کے نئے دور کا آغاز تھا۔ بھٹو نے اپنی شعلہ بیانی سے بہادر اور دلیر پٹھانوں کو آمریت کے خلاف متحد کر دیا تھا۔

7 ر نومبر کو ذوالفقار علی بھٹو آمریت کے مرکز میں انقلابی دھماکہ کرنے کے لئے راولپنڈی پہنچنے والے تھے۔ سرحد کے غیور عوام کی بیداری کی خبریں سن کر راولپنڈی کے طلبہ اور محنت کش پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ صبح ہی ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کو جانے والی تمام سڑکیں عوام سے بھر چکی تھیں۔ شہر میں دفعہ 144 کا نفاذ تو حسب روائت پہلے ہی کیا جا چکا تھا لیکن پنڈی کے عوام حکمرانوں کی ناک کے عین نیچے اس کی دھجیاں اڑا رہے تھے۔ لوگ پُرامن طور پر اپنے رہنما کا انتظار کر رہے تھے کہ شہر کی انتظامیہ نے خود ہی اشتعال انگیزی کی' پولیس نے ہوٹل کے گرد پوزیشنیں سنبھال لیں اور عوام سے کہا گیا کہ دفعہ 144 کے احترام میں وہ منتشر ہو جائیں۔ ورنہ انہیں سبق سکھا دیا جائے گا۔ نوجوان یہ سن کر بپھر گئے اور ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر ہوٹل کی عمارت پر پیپلز پارٹی کا پرچم لہرا دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے نوجوانوں نے بھی پرچم لہرا دیئے اور ارد گرد موجود سارے لوگ اس پرچم سلامی دینے لگے۔ یہ جوش و جذبہ راولپنڈی کی پولیس کے لئے بھی حیرت کا باعث تھا۔ پوری مال روڈ پر عوام کا فاتحانہ قبضہ تھا اور پولیس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟

www.bhutto.org

پولیس کے افسران نے طاقت کا پہلا مظاہرہ پولی ٹیکنیک کے ان طلبہ کے خلاف کیا جو با اثر لوگوں کی اسمگلنگ کے خلاف مظاہرے کرنے کے بعد بھٹو کے استقبال کے لئے پُرامن کھڑے تھے۔ بغیر کسی وارننگ کے ان لوگوں پر گولی چلا دی گئی۔ جس سے کئی طلبہ زخمی ہوئے اور ایک 17 سالہ نوجوان طالب علم عبدالحمید جمہوریت کی راہ میں قربان ہو گیا۔ فائرنگ کے تھوڑی دیر بعد بھٹو وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ انسٹیٹیوٹ پر پولیس کی بھاری جمعیت متعیّن ہے اور سڑک سنسان ہے تو وہاں رکے اچانک چاروں طرف سے طلبہ نے نکل کر ان کی کار کو گھیر لیا۔ بھٹو نے عمارت کے اندر جانے کی کوشش کی لیکن پولیس افسران بپھرے کھڑے تھے' انہوں نے مزید فائرنگ کی دھمکی دی' جس پر بھٹو طلبہ کی زندگیوں کو بچانے کے لئے' شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ادھر بھٹو وہاں سے روانہ ہوئے اور ادھر انٹر کانٹی نینٹل پر استقبال کے لئے جمع پُرامن ہجوم پر اچانک لاٹھی چارج شروع کر دیا گیا۔ حالانکہ اس وقت وہاں کسی قسم کا ہنگامہ نہیں تھا۔ پرچم لگانے اور نعرے لگانے کا واقعہ کافی دیر پہلے ہو چکا تھا۔ بے گناہ عوام سے انتقام لینے کے لئے اتنی شدّت اور کثرت کے ساتھ آنسو گیس کے گولے چلائے گئے اور پھر اندھا دھند لاٹھیاں برسائیں گئیں کہ راولپنڈی کے باشندے اس سفاکانہ منظر کو کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ غیر ملکی مہمان وحشت و درندگی کا یہ منظر اپنے کمروں کی کھڑکیوں سے دیکھ رہے تھے۔ مال روڈ پر طلباء کو جس بے رحمی سے گھسیٹا جا رہا تھا اسے دیکھ کر ایک معزز خاتون سے برداشت نہ ہو سکا اور انہوں نے ایس ایس پی کو اس ظلم پر زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔ ظلم و بربّریت کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ جناب بھٹو وہاں پہنچ گئے انہوں نے اپنی آنکھوں سے پولیس کے یہ مظالم دیکھے۔ ان کی مداخلت پر یہ کارروائی روک دی گئی۔ بھٹو نے اس واقعے کے بعد چند لفظی تبصرہ یوں کیا۔

"ایوب خاں کے دن پورے ہو چکے"

اگلے روز وہ عبدالحمید کے گاؤں فاتحہ پڑھنے تشریف لے گئے اور پورا دن عوام پر کئے گئے اس ظلم و بربریت کے اندوہ میں کوئی کام نہ کر سکے۔ عوامی سطح پر یہ ظلم رنگ لے آیا تھا۔ پورے ملک میں مظاہرے شروع ہو گئے تھے۔ لوگوں نے پولیس کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ مری اور اسلام آباد کی طرف جانے والی کاریں جلا دی گئیں' آنسو گیس' لاٹھیاں' گولیاں سب بے کار ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ حالات کو قابو میں لانے کے لئے فوج طلب کرنا پڑی۔ اسی رات بھٹو کے ساتھیوں کی گرفتاریاں شروع کر دی گئیں۔ اس کی اطلاع پا کر بھٹو نے کہا۔

"ایوب خاں میرے نزدیک آ رہا ہے۔ اب یہ مجھے گرفتار کرے گا اور یہ اس کی زندگی کی آخری سیاسی گرفتاری ہو گی۔"

www.bhutto.org

بعد کے واقعات نے اس پیش گوئی کو پورا کر دیا۔ عوام کی اس کھلی نفرت اور ظلم و بربریت کے خلاف اس مجاہدانہ جدوجہد کے باوجود ایوب خاں کے ہوش ٹھکانے نہیں آئے۔ وہ حالات اور حواریوں کے درمیان اس بری طرح گھر گئے تھے کہ اب بھی یہی تصوّر کر رہے تھے کہ وہ عوام میں مقبول ہیں۔ چنانچہ موصوف طے شدہ پروگرام کے مطابق 10 نومبر کو جلسۂ عام سے "خطاب" فرمانے پشاور پہنچ گئے۔ بھٹو کے دورے کے اثرات بالکل تازہ تھے' جونہی مائیک پر آ کر گوہر افشاں ہوئے کہ

"میں کافی عرصے سے گھر میں بیٹھ کر صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا اور وہ تمام بے ہودگی دیکھ رہا تھا۔"

قبل اس کے کہ ان کے لبوں پر بھٹو کا نام آئے' عوام نے ایوب خاں کو سننے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ پولیس نے جلسے میں شریک ہونے والوں کی اچھی طرح چھان بین کر لی تھی اور ان کی تلاشیاں بھی لی گئی تھیں۔ لیکن ظاہر ہے وہ لوگوں کے دلوں کی تلاشیاں لینے سے قاصر تھی' جن کے اندر بھٹو کی محبت و عقیدت کا جذبہ موجزن تھا۔ نہ صرف حاضرین نے ایوب خاں کو سننے سے انکار کر دیا بلکہ ایک نوجوان نے ایوب خاں پر فائر بھی جھونک دیئے' اور اس طرح یہ جلسہ افراتفری کی نذر ہو گیا۔ "مرد آہن" عوام کے اس احتجاج کے سامنے چند لمحے بھی نہ ٹھہر سکا۔ جب یہ جلسہ اُکھڑ رہا تھا تو بھٹو لاہور میں تھے۔ وہ پنڈی سے تیز گام کے ذریعے پورے راستے میں بپھرے ہوئے عوام کو آمریت کے خلاف منظم جدوجہد کے لئے تیار کر آئے تھے۔ یہ خبر سن کر انہوں نے قیاس آرائی کی کہ "ایوب خاں یقیناً مجھے یا میرے ساتھیوں کو اس ہنگامے اور فائرنگ میں ملوّث کرے گا۔" اس کے ساتھ ہی لاہور سے ٹرین کے ذریعے کراچی جانے کا پروگرام مرتب کر لیا۔ انہوں نے عہد کر لیا تھا کہ وہ جس راستے سے گزریں گے بغاوت کے شعلے بھڑکاتے ہوئے جائیں گے۔ یہاں تک کہ کراچی پہنچنے سے پہلے آمریت کی چتا ان شعلوں میں جل کر بھسم ہو چکی ہو گی اور اگر اس میں کچھ دم باقی رہ گیا تو بھٹو مشرقی پاکستان کا دورہ کر کے اس پر آخری ضرب لگا دیں گے۔

www.bhutto.org

باب نہم

گرفتاری اور رہائی

بھٹو کی پیش گوئی کے مطابق 13 نومبر کی رات کو دو بجے، انہیں لاہور میں گرفتار کر کے میانوالی جیل بھیج دیا گیا۔ ان کے ساتھ دوسری جماعتوں کے سیاسی رہنما بھی گرفتار کر لئے گئے۔ لیکن انہیں گرفتار کرنے کا مقصد، ان کی سیاسی حیثیت کو بہتر بنانا تھا۔ آمریت کا سنگھاسن بُری طرح ڈول چکا تھا۔ جدوجہد کے دو رُخ بن چکے تھے۔ ایک وہ جو محلاتی ماحول کے اندر استحصالی نظام کو برقرار رکھتے ہوئے اقتدار کی کشمکش کی صورت میں ہو رہی تھی اور دوسری وہ جو بھٹو کی پھونکی ہوئی انقلابی روح کے باعث کھیتوں اور بازاروں میں استحصالی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے جاری تھی۔ اس دور کی سیاست کو پورے سیاق و سباق میں سمجھنے کے لئے، جدوجہد کے ان دو واضح چہروں کی پہچان از حد ضروری ہے۔ بھٹو کو جیل میں ڈال کر، اقتدار کی اندرونی سودے بازی کے لئے، ضروری تھا کہ عوامی ابھار کی اس لہر کو انقلابی سمت سے موڑ کر رجعت پسندوں کی قیادت کی زنجیر پہنا دی جائے۔ لیکن بھٹو نے عوام کو اتنا شعور دے دیا تھا کہ یہ طبقے انہیں گمراہ کرنے میں ناکام رہے اور انقلابی محنت کش طبقوں نے بھٹو کی رہائی کی مہم جاری رکھی۔ بھٹو جیل کے اندر رہ کر بھی قانونی تقاضے پورے کرتے ہوئے، انقلابی تحریک کو قیادت فراہم کرتے رہے اس کی زندہ مثال ہائی کورٹ میں ان کا تاریخی حلفیہ بیان ہے، جس میں انہوں نے کھل کر اپنے انقلابی نظریات کا اعلان کیا۔ ایسے موقع پر جب کہ متعدد رجعت پسند، آمریت دشمن کے ماسک چڑھا کر انقلابی تحریک کا رخ بدلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بھٹو نے اپنے اس بیان حلفی میں جیل کے اندر سے عوام کی رہنمائی کرتے ہوئے، صحیح راستے کی نشاندہی کی۔ بیان حلفی کا یہ حصہ خاص طور پر قابل غور ہے۔

"لوگ جبر کے عہد اور ان بدیوں کے خلاف، جنھوں نے حکومت کے طرز حکمرانی

www.bhutto.org

کے باعث ہمارے معاشرے کو مصیبت میں ڈال دیا ہے احتجاج کے لئے میدان میں نکل آئے ہیں ہمارے عوام دوسرے ملکوں کے عوام سے مختلف نہیں۔ ان کی برداشت کی بھی ایک حد ہے۔ وہ بھی کسی کا درد محسوس کرتے ہیں اور اپنے بچوں کی مسرت کے آرزومند ہیں۔ ان کا افلاس ناقابل تصوّر ہے لیکن پھر بھی وہ بہتر مستقبل کی امید رکھتے ہیں' ان کا حق ہے کہ انہیں مناسب سامان زیست' رہائش اور لباس میسر ہو۔ فاقہ کشی نے ماؤں کی چھاتیوں سے دودھ اور ابتلا نے کتنے ہی باپوں کے آنسوؤں کو خشک کر دیا ہے۔ یہ قانون خداوندی نہیں کہ ہمارے عوام تا ابد مایوس و نامراد رہیں اور ان کے بچے بھوک اور بیماری سے مرتے رہیں۔ انہیں خوراک اور لباس کی ضرورت ہے اور روزگار اور تحفظ کی ضرورت ہے۔ یہ کوئی بے ہنگم خواب نہیں۔ بلکہ وہ توقعات ہیں جو سائنس کے اس شاندار دور نے ابھاری ہیں۔ اگر عوام کے حقوق سے انکار کیا جائے گا تو وہ کسی نجات دہندہ کو تلاش کر لیں گے اور اگر نجات دہندہ میسر نہ آیا تو خود اپنی نجات کی راہ نکال لیں گے"

جب آمریت کی مخالفت کے نقاب اوڑھ کر' عوام کے ابھرے ہوئے جذبات کو تسکین دینے کے لئے استحصالی قوتوں کے محافظ رہنما آگے بڑھ کے صرف جمہوریت کے قیام کو تمام مسائل کا حل بتا رہے تھے تو بھٹو نے اس وقت بھی جیل کے اندر سے ان کی رہنمائی کرتے ہوئے اصل منزل کی نشاندہی کر دی اور عوام کو بتا دیا کہ جس چیز کے لئے وہ جدوجہد کر رہے ہیں وہ صرف ووٹوں کی جمہوریت نہیں سیدھے اور صاف الفاظ میں "روٹی' کپڑا اور مکان" ہے اور یہ چیزیں استحصالی نظام کو یکسر بدلے بغیر میسر نہیں آ سکتیں۔

اپوزیشن کے متحدہ محاذ نے آمریت کو ڈانواں ڈول ہوتے اور عوام کے اُبھار کو شدید ہوتے دیکھ کر اس صورت حال کو اپنے حق میں استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ایوب خاں کو بلیک میل کر کے اقتدار میں زیادہ سے زیادہ حصہ طلب کر رہے تھے۔ اسی مقصد کے تحت انہوں نے آنے والے صدارتی انتخاب کا بائیکاٹ کر کے' پارلیمانی جمہوریت کی بحالی کا نعرہ بلند کر دیا تھا۔ یہ منظر کچھ اس طرح ترتیب دیا جا رہا تھا کہ ملک میں صرف دو ہی طاقتیں برسرپیکار دکھائی دیں۔ ایوب خاں اور متحدہ محاذ ..... چونکہ عوام آمریت سے نفرت کرتے تھے' لہٰذا وہ لازمی طور پر متحدہ محاذ کا ساتھ دیں گے۔ یہ ایک گہری سیاسی چال تھی مگر جیل کے اندر بیٹھے ذوالفقار علی بھٹو نے 7 جنوری سنہ 1969ء کو ایک ہی بم شیل پھینک کر یہ منظر بھی بدل دیا۔ انہوں نے اپنی پارٹی کے سیکرٹری جنرل کے ذریعے اعلان کرا دیا کہ

"ذوالفقار علی بھٹو آئندہ صدارتی انتخاب میں صدر ایوب خاں کے مدمقابل امیدوار

www.bhutto.org

ہوں گے۔"

متحدہ محاذ بائیکاٹ کا فیصلہ کر کے اپنے ہاتھ پہلے ہی کاٹ چکا تھا۔ لہٰذا ایک بار پھر جو طاقتیں اُبھر کے سامنے آئیں وہ ایوب اور بھٹو تھے اور رجعت پسندوں کا متحدہ محاذ پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا' بھٹو جیل کے اندر ہوتے ہوئے بھی ان لوگوں کو پٹخنیاں دے رہے تھے۔ یہ بھٹو کی انقلابی سیاست کا اعجاز تھا کہ انہوں نے جیل میں رہ کر بھی خود کو ملک کے سیاسی عمل میں قائدانہ طور پر شامل رکھا۔ برصغیر کی سیاست میں صرف گاندھی جی کی مثال ایسی ہے' جو مرن برت رکھ کر سیاسی تحریک سے مربوط رہا کرتے تھے۔ لیکن جس طرح بھٹو نے قید میں رہ کر بھی عوامی تحریک کی قیادت کی' اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ بیان حلفی' رٹ درخواست کی واپسی' صدارتی انتخاب میں امیدواری کا اعلان اور آخر میں مرن برت کا اعلان۔ یہ سب ایک سائنٹفک انداز میں مناسب لمحوں پر سامنے آئے اور انہوں نے سیاسی تحریک کے اس رخ کو برقرار رکھا۔ جس کی جانب بھٹو عوامی جدوجہد کو گامزن کر کے جیل گئے تھے۔

استحصالی قوتوں کے نمائندوں اور حکومت کے مابین اقتدار کی بندر بانٹ کے لئے جوڑ توڑ میں تیزی آ گئی تھی' عوامی جدوجہد کا رخ بدلنے کی سازشیں اب زور پکڑ رہی تھیں کہ جناب بھٹو نے جولاڑ کانہ میں نظر بند تھے ایک اور دھماکہ کر دیا۔ 7 فروری کو انہوں نے عدالت عالیہ سے اپنی رٹ درخواست واپس لینے کا اعلان کرتے ہوئے حکومت کو وارننگ دے دی کہ اگر ایک ہفتے کے اندر اندر ہنگامی حالات کے خاتمے کا اعلان نہ کیا گیا تو وہ تا مرگ بھوک ہڑتال کر دیں گے۔ ایوب خاں اور رجعت پسندوں کا گروہ عوامی قوّت کے جن کو بوتل میں بند کرنے کے لئے' جب بھی کسی سمجھوتے پر پہنچنے کے قریب آتا تھا' بھٹو قید کے اندر سے بیٹھے ایسا دھماکہ کر دیتے تھے کہ ان کی باہمی سازشیں ناکام ہو جاتی تھیں' اس بھوک ہڑتال کے اعلان نے عوام کو پھر دوسری طرف متوجہ کر دیا۔ یہی نہیں اس کے ساتھ پیپلز پارٹی کے دوسرے رہنماؤں کی طرف سے بھی بھوک ہڑتال کے اعلانات سامنے آنے لگے اور صورتحال ایک نیا رخ اختیار کر گئی عدالت عالیہ میں بھٹو کے بیان حلفی اور پھر رٹ درخواست کی واپسی پر عدالت عالیہ کے ریمارک ایوب خاں کی قانونی و آئینی پوزیشن پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ بھٹو نے ثابت کر دیا تھا کہ ان کی گرفتاری واقعی ایوب خاں کی زندگی کی آخری سیاسی گرفتاری تھی۔

جمعے کے مبارک دن بھٹو کو لاڑکانہ میں بھوک ہڑتال شروع کئے ابھی چار ہی گھنٹے گزرے تھے کہ عوام کے متوقع غیظ و غضب کے خوف سے ایوب خاں نے گھبراہٹ میں ان کی رہائی کے احکامات جاری کر دیئے۔ دوسرے تمام نظر بندوں کو بھی جو ڈی پی آر کے تحت قید تھے' رہا کر دیا گیا مگر بھٹو نے رہائی پر کسی مسرت کا اظہار کرنے کے بجائے ایک ضرب لگائی۔

"حکومت نے مجھے رہا تو کر دیا ہے' یہ توقع کے عین مطابق ہوا ہے۔ مگر میں نے مرن

www.bhutto.org

برت اس لئے نہیں رکھا ہے کہ خود کو رہا کراؤں۔ میرے مرن برت کا مقصد تو صرف
یہ ہے کہ حکومت ہنگامی حالات کے خاتمے کا اعلان کرے۔"

ان کی رہائی پر لاڑکانہ کے عوام نے جس مسرت و شادمانی کے جذبات کا اظہار کیا اور پورے شہر نے جس انداز میں خوشیاں منائیں' وہ پاکستان کے دیگر محنت کش عوام کے احساسات کی حقیقی ترجمانی تھی۔ ابھی بھٹو کے مطالبے کی صدائے بازگشت فضا میں گونج رہی تھی کہ یہ خبر شائع ہو گئی کہ حکومت 7 فروری سے ہنگامی حالات کے خاتمے کا اعلان کر رہی ہے' بھٹو خود ہی جیل سے باہر نہ آئے بلکہ اپنے ساتھ بارہ کروڑ عوام کو بھی جبر و استبداد کی حراست سے نکال لائے۔ یہ تنہا ان کی جدوجہد اور پاکستان کے عوام کی عظیم جدوجہد کا پھل تھا۔

یہاں اتنی وضاحت ضروری ہے کہ بھٹو کی گرفتاری کے بعد مشرقی پاکستان میں بھی عوامی تحریک شروع ہو گئی تھی۔ ایوب خاں اسے دبانے کے لئے خود وہاں گئے۔ لیکن جب ان کے اپنے گھریلو حصۂ ملک میں حالات قابو سے باہر تھے تو مشرقی پاکستان میں بھلا ان کی کون سنتا تھا؟ لہٰذا وہاں سے بھی وہ نامراد واپس چلے آئے۔ اس موقع پر اس دور میں ملک کے دونوں حصوں کی عوامی تحریکوں کا باہمی تقابل عوام کے مقاصد اور قیادتوں کے فرق کا باہمی تجزیہ ناگزیر ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے بغیر' بعد میں پیش آنے والے واقعات کے صحیح مقام کا تعین ممکن نہیں۔

www.bhutto.org

باب دہم

مشرقی پاکستان میں عوامی تحریک

بنگال کے مظلوم مسلم عوام اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف کی ابتدا میں ہی سامراجی لوٹ کھسوٹ کا شکار ہو چکے تھے۔ یہ خطّہ ماضی کا ایک خوش حال خطّہ تھا جہاں مسلمان کسان اور دست کار عزت و آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یورپ کے تاجروں نے برّصغیر میں سب سے پہلے یہیں اپنے پنجے گاڑے۔ اس سے قبل یورپ برّصغیر خصوصاً بنگال اور چین کی تیار شدہ مصنوعات کی منڈی تھا۔ سترہویں صدی کے اختتام پر برطانوی دستکاروں کے احتجاج کے نتیجے میں' وہاں ان ممالک کے ریشمی اور سوتی کپڑے کی درآمد پر پابندی لگائی گئی۔ یہ طویل داستان تاریخ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ بہرحال انگریزوں نے آہستہ آہستہ نہ صرف بنگال کی گھریلو صنعتوں کو تباہ و برباد کر کے دست کاروں کو بے روزگار کیا بلکہ کسانوں کی بھی کمر توڑ کر رکھ دی۔ یہ بے کار ہونے والے چھوٹے دستکار جب روزگار کی تلاش میں کھیتوں میں جا کر کسانوں میں گھلے ملے تو اپنے ساتھ شہری معاشی و تجارتی شعور بھی لے کر گئے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ پاکستان میں شامل صوبوں کے برعکس بنگال کے مسلم عوام کوئی پونے دو سو سال قبل سامراجی لوٹ کھسوٹ کا شکار بننا شروع ہو گئے تھے اور یہ بات محتاج بیان نہیں کہ سامراج کی معاشی لوٹ کھسوٹ اپنے ردّعمل کے طور پر اسی تناسب سے عوام میں سیاسی شعور کو بھی جنم دیتی ہے۔

بنگال کے مسلم عوام کا سیاسی شعور ایک مختلف صورتحال میں مرتّب ہو رہا تھا۔ ایک طرف تو انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ اور دوسری طرف ہندو مہاجن کا ان سے تعاون۔ گویا سامراجیوں کے خلاف وہ قومی بنیادوں پر نفرت کرتے تھے تو' ان کے ہندو حاشیہ برداروں کے استحصالی کردار کو مذہبی بنیادوں پر دیکھ

www.bhutto.org

رہے تھے۔ انگریز اپنے مفادات کے تحت اس مذہبی منافرت کا خواہاں تھا۔ چنانچہ اس نے اس تیار مال کی خریداری اور مالیہ کی وصولی میں ہندو مہاجنوں کو اپنا شریک بنا کے' اس منافرت کو معاشی تضاد میں بدلنے کی بنیاد بھی فراہم کر دی۔ جو بعد میں مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ برّصغیر کے تضادات کو سمجھنے کے لئے اس کے مخصوص تہذیبی معاشی اور تاریخی پس منظر کو یہیں کے معروضی حالات میں دیکھنا ضروری ہے۔ جو لوگ یہاں "عالمی معیاروں" کا اطلاق کر کے تجزیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں' ان کا بھٹک جانا لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں برسوں جدوجہد کرنے کے باوجود سوشلسٹ عوام میں اپنی جڑیں نہیں پھیلا سکے۔ کیونکہ وہ یہاں بھی مذہب کو یورپ یا ایشیا کے دیگر ممالک کے حالات کی روشنی میں دیکھتے رہے۔ وہ اس فرق کو محسوس ہی نہیں کر سکے کہ ایک تو یہاں کا مذہب ان کے سائنسی تجزیئے کی بنیاد فراہم کرنے والے مذاہب سے مختلف تھا اور دوسرے یہاں کے معاشرے کے طبقاتی تضادات میں مذہب کا رول وہ نہیں رہا' جو یورپ میں عیسائیت کا تھا۔ وہاں چرچ یورپ کے استحصالی طبقوں کی لوٹ کھسوٹ میں برابر کا حصہ دار ہونے کی وجہ سے' عوامی انقلابی تحریکوں کے راستے میں مزاحم ہوا۔ لہٰذا وہاں کے انقلابیوں نے مذہب کو بھی استحصال کا حصہ سمجھ کر اس کی مخالفت کی۔ اس کے برعکس اسلام کبھی استحصال کا ذریعہ نہیں بنا۔ عام بادشاہ اتنے بھرپور مسلمان نہیں ہوتے تھے کہ ان کے ساتھ مذہب کو وابستہ کیا جا سکتا۔ اسلام میں مذہب کی شناخت زیادہ تر علمائے دین' اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کے حوالے سے ہوئی ہے اور یہ بہرحال کسی بھی دور میں ملکیتی طبقوں میں شامل نہیں رہے۔ اگر کبھی کچھ علمائے سوء نے استحصالی طبقوں کو اسلام کے نام پر کوئی تقویت دینے کی کوشش کی تو اسی دور کے علمائے حق نے انکے سامنے آ کر جھٹلایا۔ بہر حال بنیادی فرق یہ ہے کہ چرچ براہ راست ملکیت اور ٹیکسوں کا حصہ دار ہوتا تھا۔ لیکن مذہب اسلام کا مرکز یعنی مسجد کبھی بھی اس کردار کی حامل نہیں رہی۔ سائنسی مطالعہ کرتے وقت اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے' ہر مذہب' ہر دور میں' ہر خطّے کے جداگانہ جغرافیائی' تاریخی' تہذیبی اور معاشی حالات میں یکساں کردار کا حامل نہیں ہوتا۔ یہ تمام تبدیلیاں بھی مذہبی اصولوں کو متاثر کئے بغیر' اس کے مقامی کردار پر لازماً اثر انداز ہوتی ہیں۔ آج لاطینی امریکہ کے عیسائی پادری دوسرے انقلابیوں کے دوش بدوش عوامی جنگیں لڑ رہے ہیں اسی طرح ویت نام میں بدھ مت کے مذہبی رہنماؤں کے انقلابی رول کو کون فراموش کر سکتا ہے؟۔

اس وسیع بحث کو یہیں چھوڑ کر برّصغیر کے مخصوص حالات میں اسلام کے کردار کا جائزہ لیں تو ہم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہاں اسلام نے کسی بھی دور میں عوام دشمن کردار ادا نہیں کیا۔ مغل بادشاہوں کے دور کا سرسری تجزیہ میں پہلے کر چکا ہوں۔ انگریزوں کی آمد کے بعد جب مسلمانوں کو ان دونوں نے مل کر استحصال کا نشانہ بنایا تو اسلام مظلوم مسلمانوں کی طبقاتی یکجہتی اور تحفظ کی بنیاد بنا۔ گویا

www.bhutto.org

وہ مظلوموں کی جدوجہد میں ان کا معاون ثابت ہوا' نہ کہ مزاحم' اس صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں میں اپنے مذہب کے خلاف کسی قسم کے جذبات پیدا ہوں۔ یا وہ اسے اپنی طبقاتی جدوجہد کے دوران اپنے راستے کی رکاوٹ تصوّر کریں' انگریزوں کے خلاف برّصغیر میں مسلمانوں کی تمام سامراج دشمن تحریکوں کی قیادت کا اعزاز مسلمان مذہبی رہنماؤں کو حاصل ہے۔ خود تحریک پاکستان میں ہندو کی استحصالی ذہنیت کے خلاف اسلام نے ہی مسلمانوں کی جدوجہد کو واضح مفہوم عطا کیا! اس تحریک کی قیادت کرنے والے قائداعظم ایک روشن خیال اور ترقی پسند قوم پرست مسلمان رہنما تھے۔

بنگال کی صورتحال میں اسلام کا کردار کچھ زیادہ ہی انقلابی رہا ہے۔ وہاں سامراجی استبداد کی ابتدا ہی مسلمان محنت کشوں کے استحصال سے ہوئی۔ بعد میں ہندو مہاجن کی ساجھے داری نے مسلمان ہونے کے مطلب کو مستحصل طبقے کا فرد بنا کر رکھ دیا۔ قومی جنگِ آزادی بنگال کے مسلمانوں کی اکثریت نے اپنے مذہبی ایمان کے ساتھ لڑی۔ یہ کوئی اتفاق یا حادثہ نہیں کہ مسلم لیگ سب سے پہلے ڈھاکہ میں قائم ہوئی۔ بلکہ یہ بنگال کے خارجی تاریخی و معاشی تضادات کا لازمی نتیجہ تھا اور قائداعظم کی قیادت میں تحریک پاکستان کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے بنگال ہی کے مسلمانوں نے اس میں نمایاں حصہ لیا۔ اگر زیادہ غور سے دیکھنا ہو تو تحریک پاکستان میں حصہ لینے والی علاقائی قیادتوں کا طبقاتی فرق بھی اسے سمجھنے میں کافی مدد دے سکتا ہے' مغربی پاکستان کی طرف سے تحریک پاکستان کی نمائندگی کرنے والے جاگیرداروں کے نمائندے تھے تو بنگال کی نمائندگی متوسط طبقے کے بھاشانی اور سہروردی کر رہے تھے بنگال کی نمائندگی کرنے والوں میں وہاں کے جاگیرداروں کا تناسب پندرہ فیصد سے زائد نہ تھا' یہ بھی یاد رہے کہ عوام اور قیادت کے مقاصد ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے۔ مغربی پاکستان کے عوام گو مذہبی آزادی کے ساتھ ساتھ معاشی آزادی کے بھی خواہاں تھے۔ لیکن یہاں کی جاگیردارانہ قیادت نے اپنے طبقاتی مفاد میں معاشی پہلو کو نمایاں نہیں ہونے دیا۔ اس کے برعکس بنگال کی متوسّط طبقے کی قیادت مذہب کے ساتھ ساتھ معاشی پہلو کو بھی ابھارتی رہی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی سنٹرل کمیٹی کے اجلاس میں بنگالی نمائندوں کے وہ مطالبے آج بھی محفوظ ہیں' جو وہ مستقبل کے پاکستان میں معاشی انصاف کا نظام قائم کرنے کے سلسلے میں کیا کرتے تھے۔ گویا جب تحریک پاکستان چل رہی تھی۔ اس وقت بھی ہرچند کہ عوام کی امنگیں یکساں تھیں۔ لیکن دونوں طرف کی قیادتوں میں معاشی نظام کے سلسلے میں گہرا تضاد موجود تھا۔ وہ قائداعظم ہی کی ذات تھی کہ انہوں نے اپنے تدبر سے اس تضاد کو معاندانہ شکل اختیار نہ کرنے دی۔ اور اگر خدا انہیں کچھ مزید مہلت دیتا تو ممکن تھا کہ وہ ملک کے دونوں حصوں کی قیادتوں کے اس تضاد کو کامیابی سے عوام کے حق میں حل بھی کر لیتے۔

www.bhutto.org

یہ تھے وہ اندرونی تضادات جنہیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے پاکستان معرض وجود میں آیا۔ یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ قائداعظم جلد ہی رحلت فرما گئے۔ ورنہ وہ دونوں حصوں کے عوام کی امنگوں کی یکسانی اور قیادتوں کے باہمی تضادات سے بخوبی آگاہ تھے۔ یہ بھی محض اتفاق نہ تھا کہ انہوں نے قیام پاکستان کے بعد اس ملک کے مستقبل پر اثرانداز ہونے والے دو بنیادی مسائل پر اظہار خیال کرنے کے لئے بنگال ہی کی سرزمین کو منتخب کیا تھا۔ انہوں نے چٹاگانگ میں اسلامی سوشلزم کی تائید کی تو ڈھاکہ میں اردو کے قومی زبان ہونے کا حتمی اعلان فرمایا۔ پہلا اعلان ان کے معاشی نظریئے کی ترجمانی کرتا ہے تو دوسرا تہذیبی نظریئے کی۔ ان کے بعد ہمیں کوئی ایسا رہنما نہ مل سکا جو پاکستان کی صورتحال کا اتنا گہرا شعور رکھتا ہو۔ لہٰذا ان کی موت کے فوراً بعد ملک کے دونوں حصوں کی قیادتوں کا باہمی تضاد اپنا رنگ دکھانے لگا بنگال کی قیادت کا جاگیرداری سسٹم کے ساتھ کوئی طبقاتی مفاد وابستہ نہ تھا۔ جب کہ مغربی پاکستان کی قیادت سندھ اور پنجاب کے جاگیرداروں' سرحد کے خوانین اور بلوچستان کے سرداروں کے طبقاتی مفادات کی محافظ تھی۔ یہاں کی قیادت جاگیردارانہ ریاستی ڈھانچہ برقرار رکھنے پر اصرار کر رہی تھی تو بنگال کے قائدین بورژوا جمہوریت کے ذریعے' اپنے خطے کے عوام کا استحصال کرنے کے خواہاں تھے۔ دونوں کے بنیادی مقاصد میں کوئی فرق نہ تھا لیکن دونوں کو اپنی اپنی تاریخی و جغرافیائی مجبوریاں ایک دوسرے سے متصادم ہونے پر مجبور کر رہی تھیں۔ جاگیردارانہ ریاستی ڈھانچہ استحصال کا وہ فرسودہ نظام تھا جسے بنگال کے انقلابی عوام کسی قیمت پر قبول نہیں کر سکتے تھے۔ مغربی پاکستان کے جاگیردار اپنے مفادات پر کسی قسم کا سودا کرنے کو تیار نہیں تھے اس تضاد نے آئین کی شکل کو مشکل بنا دیا تھا۔ مغربی پاکستان کے جاگیردارانہ مفادات کا تحفظ کرنے کے لئے یہاں کے مذہبی ٹھیکے دار بھی میدان عمل میں اتر آئے تھے یہ وہ موقع تھا جب دونوں حصوں میں زرعی اصلاحات پر سمجھوتہ ہو جاتا تو قیادتوں میں باہمی مفاہمت پیدا ہو سکتی تھی، لیکن 1954ء کے انتخابات کے بعد مشرقی پاکستان نے مجبوراً یک طرفہ طور پر زرعی اصلاحات نافذ کر کے اپنے لئے علیحدہ راستہ اختیار کر لیا۔ جواب میں مغربی پاکستان کے حکمران جاگیردار طبقے نے وہاں کی منتخب حکومت کو برطرف کر کے اپنے اس عزم کا اظہار کر دیا کہ وہ پورے جبر کے ساتھ پورے ملک پر جاگیردارانہ نظام مسلّط رکھنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ طاقت کے اس کھلے استعمال کا مظاہرہ بعد میں مغربی پاکستان میں بھی ون یونٹ بنا کر پیریٹی کے نفاذ کی صورت میں کیا گیا ملک کے صرف ایک حصے کے صوبوں کو ون یونٹ کہنے کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ دوسرا حصہ دوسرا یونٹ کہلاتا اور ہو بھی یہی رہا تھا۔ عملاً یہ یونٹ ایک دوسرے کے ساتھ نبرد آزما ہو گئے۔ دونوں طرف کی قیادتوں کا یہ تضاد پاکستان کو فوجی آمریّت کی طرف لے جا رہا تھا اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ فوجی آمریّت قوّت کے مزید برہنہ استعمال کا واضح اعلان تھا۔

www.bhutto.org

اس صورتحال میں المیہ یہ تھا کہ دونوں طرف کی انقلابی تحریکیں عوام سے بالکل کٹی ہوئی تھیں۔ مشرقی پاکستان جہاں کی صورتحال عوامی انقلاب کی تحریک کے لئے زیادہ سازگار تھی مناسب قیادت سے محروم تھی اور مغربی پاکستان جہاں خارجی حالات ابھی عوامی انقلاب کی تحریک کے لئے سازگار نہ تھے وہاں کے فیشن ایبل سوشلسٹ "انقلابی بحثوں" سے شوق فرما رہے تھے۔ ایوبی حکومت آئی تو سیاست دانوں کی بدعنوانیوں اور جھگڑوں سے تو لوگوں کو نجات مل گئی مگر اس پر جلد ہی نوکر شاہی اور قومی سرمایہ داروں نے غلبہ حاصل کر لیا اور ان دونوں نے مل کر مشرقی پاکستان کے عوام کا خوب خوب استحصال کیا ایک طبقہ اسے منڈی بنا کر مفاد حاصل کر رہا تھا اور دوسرا ملازمتوں میں زیادہ حصہ لے کر' غیر شعوری طور پر ادھر کے عوام بھی اس منافع میں حصے دار بن رہے تھے' اس صورت حال نے مشرقی پاکستان کے مظلوم عوام کو بری طرح مایوس کیا تھا' چند سال تو خوشگوار امیدوں میں گذر گئے اس کے بعد ملکی سیاست میں ایک نیا عنصر داخل ہوا۔ یعنی خارجی سطح پر سامراج کے ساتھ پاکستان کے قومی تضاد کا واضح شعور اور اس کے تحفظ کا احساس اس نئے عنصر کو سامنے لانے والے ایوب کابینہ کے وزیر ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ سامراج کے ساتھ قومی تضاد کے اس ابھار نے عوام کو ایک بار پھر آزادی و خود مختاری کی نئی امیدوں سے ہمکنار کر دیا۔ عوام کی یہی امیدیں تھیں' جن کی وجہ سے داخلی تضادات کچھ عرصے کے لئے دب گئے اور ایوب خان اطمینان سے حکومت کرنے لگے'

1965ء کی جنگ تک حالات کنٹرول میں تھے لیکن اس جنگ کے بعد بھٹو نے سائنسی انداز میں سامراج کے ساتھ اپنے قومی تضادات کو ابھارتے ہوئے لوگوں کو یہ بتایا کہ کامل آزادی حاصل کرنے کے لئے داخلی استحصالی نظام کو بھی ختم کرنا ضروری ہے۔ انہوں نے بتایا کہ عوام اسلامی عقائد و اقدار پر قائم رہ کر بھی معاشی انصاف اور سامراج سے آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ پروگرام پیش کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں طوفانی رفتار کے ساتھ عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ مغربی پاکستان جہاں اچھے خاصے روشن خیال حلقوں میں سوشلزم کا نام لینا گناہ تھا وہاں اب عوام الناس اس نعرے کو اپنا کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس طرح نہ صرف تاریخی طور پر مشرقی پاکستان سے بچھڑے ہوئے مغربی پاکستانی عوام ایک ہی جست میں ترقی پسندانہ انقلابی سیاست کے دور میں داخل ہو گئے بلکہ انہوں نے آمریت اور استحصالی قوتوں اور سامراج کے خلاف جدوجہد میں بھی مشرقی پاکستان کے عوام پر سبقت حاصل کر لی گویا یہاں عوامی ابھار اور قیادت کے مقاصد ایک ہو گئے۔ ان میں کوئی تضاد نہ رہا حالانکہ یہاں کوئی بھی پارٹی موجود نہ تھی لیکن بھٹو نے اس خلا کو بھی برق رفتاری سے پُر کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تیز رفتاری کے ساتھ پارٹی منظم کرنے میں جو کمزوریاں رہ سکتی ہیں ان سے پیپلز پارٹی بھی محفوظ نہیں رہ سکی۔ مغربی پاکستان کے برعکس مشرقی پاکستان میں خارجی' معاشرتی سیاسی حالات انقلاب کے لئے پوری طرح سازگار تھے گویا وہ

www.bhutto.org

انقلابی حالت میں تھا۔ حکمران لرز چکے تھے عوام کی مصیبتیں اور مشکلات ناقابل برداشت حد تک بڑھ چکی تھیں' وہ انقلابی قدم اٹھانے کو تیار تھے لیکن وہاں انقلاب کے لئے ساز گار خارجی حالات کے ساتھ ساتھ اس کا داخلی لازمہ یعنی انقلابی پارٹی اور قیادت موجود نہیں تھی' مولانا بھاشانی معاشی نعرے ضرور دیتے تھے لیکن ان کا سیاسی شعور اپنے ملک کے حالات کا تجزیہ کرنے میں ناکام رہا۔ وہ داخلی سیاست میں عالمی شاطروں کی چالوں کا توڑ اور تجزیہ کر کے ان کا رد بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے غیر منظم اور طبقاتی انقلابی شعور سے غیر مسلح عوام کو توڑ پھوڑ کی طرف لگا دیا جو داخلی عنصر یعنی انقلابی شعور' منظم انقلابی پارٹی اور سیاسی شعور سے بہرہ ور قیادت سے محروم ہونے کے سبب اس راہ پر چل کر انارکی اور بالآخر حکمران طبقوں کے تشدد کا شکار ہو گئے۔ اس وقت اگر مشرقی پاکستان کے عوام کو انقلابی قیادت میسر آ جاتی تو عوامی لیگ کے علیحدگی کے نعروں کے باوجود بھٹو کے معاشی انقلابی نعرے عوامی جدوجہد کو اس کے منطقی راستے پر ڈال سکتے تھے اسی خوف کی وجہ سے بھٹو کو نظر بند کر کے مشرقی پاکستان کے عوام سے رابطہ پیدا نہ کرنے دیا گیا کیونکہ سامراج اور اس کے ملکی ایجنٹ اندازہ کر چکے تھے کہ جو شخص مغربی پاکستان کے نیم انقلابی حالات میں انقلابی تلاطم برپا کر سکتا ہے وہ مشرقی پاکستان کے مکمل انقلابی حالات کو قیادت فراہم کر کے اس سے بھی بڑا دھماکہ کر سکتا ہے اس پورے پس منظر کو ذہن میں رکھ کر جب ہم بھٹو کی رہائی کے وقت کے حالات کا تجزیہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کوشش صرف ایک آمرانہ حکومت کو بچانے یا اقتدار کو استحصالی طبقوں میں تقسیم کر کے' جمہوریت بحال کرنے کی نہ تھی بلکہ اصل کوشش یہ ہو رہی تھی کہ پورے پاکستان کو عوامی انقلاب سے کس طرح بچایا جائے؟۔ جو بھٹو کی قیادت میں تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتا دکھائی دے رہا تھا' اس عوامی انقلاب سے حکمران طبقے ہی نہیں بلکہ امریکہ اور بھارت بھی لرزہ براندام تھے کیونکہ یہ متوقع انقلاب سب سے زیادہ بھارت پر اور اس کے ساتھ ہی امپیریلزم کے عالمی سامراجی مفادات کے لئے ایک ضرب کاری ثابت ہوتا۔

مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی نہ تو عوامی انقلاب کے کام کے تھے اور نہ سامراج کے مطلب کے' لہٰذا جلد بازی میں بپھری ہوئی وہاں کی عوامی قوتوں کو از خود انقلاب کا راستہ دریافت کرنے کے مرحلے سے پہلے قیادت فراہم کرنا ضروری تھا یہ عمل کافی عرصہ پہلے چھ نکات کو سرکاری ذرائع ابلاغ سے اُچھال کر اور پھر احمقانہ انداز میں اگرتلہ سازش کیس کی بعد از وقت سماعت کر کے شروع کیا جا چکا تھا۔ مشرقی پاکستان کے عوام کی انقلابی تحریک کو علاقائی خود مختاری کے سانچے میں ڈھال دیا گیا کسی علاقائی خود مختاری کی تحریک کا قومی خود مختاری کی تحریک میں بدل جانا' صرف ایک معمولی سے جھٹکے کا محتاج ہوتا ہے اس کام کے لئے قرعہ فال شیخ مجیب الرحمان کے نام نکلا اور انہیں ستمبر 1968ء میں اس وقت رہا کیا گیا جب ان کی رہائی کے لئے کوئی تحریک نہیں چل رہی تھی۔ مشرقی پاکستان میں عوامی مظاہرے نومبر میں جا کر

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو۔ شیخ مجیب الرحمان

چندی گڑھ کے ہوائی اڈے پر بھارت کے وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ صدر بھٹو کا استقبال کر رہے ہیں

www.bhutto.org

شروع ہوئے چنانچہ جب فروری میں "سٹیٹس کو" برقرار رکھنے کے لئے گول میز کانفرنس کی جارہی تھی تو بھٹو مشرقی پاکستان کے عوام کی نمائندگی پر اصرار کر رہے تھے۔ مولانا بھاشانی عوام کے جذبات اور رفتار کار کا ساتھ دینے سے قاصر رہے تھے اب عوامی سیاست کا سارا بوجھ بھٹو کے کاندھوں پر آگیا۔ ایوب خان کے ساتھ گول میز کانفرنس میں متحدہ محاذ اقتدار کی بندر بانٹ کی تیاریاں کر رہا تھا کہ بھٹو نے دھکا دے کر مجیب الر حمان کو بھی اس کانفرنس میں دھکیل دیا' اور یوں عوام کو محسوس کرا دیا کہ ظاہری طور پر ایک دوسرے کو وطن دشمن' سازشی' علیحدگی پسند اور کافر کہنے والے' باطنی طور پر بالکل ایک ہیں ایک دوسرے پر یہ الزام لگانے والے ایک ہی میز پر بیٹھے آمر کے ساتھ ساجھے داری کرنے کو تیار تھے جب مشرقی پاکستان کے عوام کی تحریک اس جوش و خروش سے جاری رہی اور مغربی پاکستان میں بھٹو نے عوامی گول میز کانفرنسیں کر کے' انقلابی جدوجہد کو شدّت کے ساتھ جاری رکھا تو مجیب کو ہوش آیا کہ بھٹو نے اسے کانفرنس کے اندر بٹھا کر اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟۔ لہٰذا وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس بھاگا اور عوامی تحریک کے سامنے سودے بازی کا یہ کھیل بھی نہ چل سکا اور یوں ایوب خان کی سربراہی میں مجیب الر حمان وزیر اعظم بن کر دونوں حصوں میں بائیں بازو کی تحریکوں کو کچلنے کا فرض انجام نہ دے سکے۔

اب یہ محسوس کر لیا گیا تھا کہ اس بڑھتے ہوئے انقلاب کو روکنا کسی کے بس کی بات نہیں اب آخری اور واحد طریقہ فوج کو استعمال کرنے کا رہ گیا تھا ناچار ایوب خان نے اقتدار یحییٰ خان کے حوالے کیا اور خود گوشۂ گمنامی میں چلے گئے۔ یحییٰ خان نے فوری طور پر مارشل لاء کے خاتمے اور جمہوریت کے وعدے کر کے عوام کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور خود ایک نئے تاریخی مرحلے میں اپنا شرمناک کردار ادا کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اب سوال یہ پیدا ہو گیا تھا کہ پاکستان کی عوامی انقلابی تحریک کو کس طرح روک کر فرسودہ ریاستی ڈھانچے اور سامراجی مفادات کا تحفظ کیا جا سکتا ہے؟ ایوب خان جاتے جاتے بھی اپنا پرانا آمرانہ کردار ادا کر گئے ورنہ انہیں اقتدار چھوڑنا ہی تھا تو ان کا اپنا بنایا ہوا آئین اور اپنی منتخب کی ہوئی اسمبلی موجود تھی وہ اپنی جگہ اسمبلی کے سپیکر کو اقتدار سونپ سکتے تھے جو ملک میں عام انتخابات کا اعلان کرتا اور عوام کی منتخب کردہ پارلیمان ملک کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ کرتیں۔ لیکن یہاں تو مسئلہ یہ تھا کہ اُبھرتی ہوئی انقلابی قوت کو فوری طور پر کیسے روکا جائے؟۔ چنانچہ یحییٰ خان نے فوراً ہی تمام سیاسی سرگرمیاں معطّل کر دیں' اسمبلیاں توڑ دیں اور آئین منسوخ کر دیا۔ انتخابات کو ایک سال آگے ڈال کر اس نے اپنی سرپرستی میں رجعت پسند پارٹیوں کو جنہیں عوام حقارت کے ساتھ ٹھکرا چکے تھے مختلف انجکشن دے دے کر اس قابل کرنا شروع کر دیا کہ وہ ایک بار پھر عوام کے پاس جا سکیں اگر عملی صورت حال کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو یحییٰ خان کی حکومت قطعاً غیر سیاسی نہ تھی۔ یہ درحقیقت عوامی قوتوں کے خلاف رجعت پسندوں کی متحدہ سیاسی حکومت

www.bhutto.org

تھی۔ جس نے غیر سیاسی ہونے کا لبادہ اس لئے اوڑھا تھا کہ اس کی آڑ میں طلبہ ' مزدوروں، کسانوں اور نچلے طبقوں کی سیاسی جدوجہد کو روکا جاسکے اور اس خلا میں ان رجعت پسندوں کو اپنے پاؤں جمانے کا موقع دیا جائے۔ جو گذشتہ عوامی تحریک کے تند و تیز ریلوں کی وجہ سے بری طرح اکھڑ چکے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اقتدار سنبھالنے کے فوراً ہی بعد یحییٰ خان نے رجعت پسند رہنماؤں سے رابطہ پیدا کر کے انہیں حوصلہ دیا تھا کہ وہ اپنی سیاسی حیثیت کو بحال کرنے کی کوشش کریں۔ گو مزدوروں' طلبہ، کسانوں اور نچلے متوسط طبقوں کی سرگرمیاں معطل کر دی گئی تھیں اور الٹا ان کے سرکردہ لیڈروں کے خلاف مارشل لاء کے کوڑے متحرک ہو گئے تھے۔ مگر ان نامساعد حالات میں بھی بھٹو نے اپنی پارٹی کا تنظیمی کام جاری رکھا اور مظلوم طبقوں کے خلاف ہونے والی فوجی حکومت کی ہر کارروائی پر صدائے احتجاج بلند کی۔ یہ ان دنوں روائیت بن چکی تھی کہ ہر ستایا ہوا اور مظلوم سیدھا بھٹو کے پاس جاتا اور بھٹو اس کی حمایت میں جو ممکن ہوتا کر گذرتے۔ 15 اگست 1969ء کو وہ اپنی پارٹی کے کنونشن کے سلسلے میں مشرقی پاکستان گئے۔ بھٹو کی عوامی سیاست کے لحاظ سے یہ دورہ بے معنی تھا کہ اس وقت سیاسی سرگرمیوں کی اجازت نہ تھی صرف دانشوروں پیشہ ور سیاسی کارکنوں اور لیڈروں سے رابطہ ممکن تھا اور یہ وہ لوگ تھے جو مجیب کے چھ نکات کے اصل حامی تھے، کیوں کہ ان کے بورژوا مفادات کے تحفظ کا یہی بہترین ذریعہ تھا۔ لہٰذا نتائج کی توقع فضول تھی اس کے باوجود بھٹو نے اپنی آواز وہاں کے دیانتدار دانشوروں تک پہنچائی اور اصل کوشش یہ کی کہ شیخ مجیب کے ساتھ مفاہمت کی کوئی راہ نکل آئے۔

آپ کو یہ یاد ہو گا کہ جب چھ نکات پہلی بار منظر عام پر آئے تھے تو یہ بھٹو تھے جنہوں نے مشرقی پاکستان جا کر ڈھاکہ کی پلٹن میدان میں شیخ مجیب کے ساتھ مناظرے کی پیش کش کی تھی! اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک مجیب اپنے عوام کی حقیقی اُمنگوں کو شاطرانہ گمراہی کا اسیر کر کے چھ نکات کو جدوجہد کی بنیاد میں نہ ڈھال سکے تھے بلکہ یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کے عوام کو بتایا جائے کہ ان کی شکایات مشکلات اور بے چینی بالکل جائز ہے، لیکن ان مشکلات کا حل چھ نکات میں نہیں بلکہ پورے استحصالی نظام کو ختم کرنے میں ہے' جو ملک کے دونوں حصوں کے عوام کا خون چوس رہا ہے۔ ظاہر ہے ایوب خان اپنی ہی کابینہ کے ایک وزیر کو اپنے خلاف کسی مہم پر جانے کی اجازت کیسے دے سکتے تھے؟۔ بعد میں مجیب نے عوامی اُمنگوں کے ساتھ "بنگلہ شاؤنزم" کی مدد پا کر ایک ہسٹریائی کیفیت پیدا کر دی تھی جب صورتحال نے یہ رُخ اختیار کر لیا تو چھ نکات پر ڈھاکہ پلٹن میدان میں بحث کے خواہشمند بھٹو' حد درجہ محتاط ہو گئے کیونکہ وہ جان چکے تھے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی سیاسی رہنمائی کرنے والے تمام طبقے اب ان چھ نکات کو عوام کی نظر میں نجات کا وسیلہ ظاہر کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں چنانچہ انہوں نے پہلے سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ

www.bhutto.org

"ان میں سے کچھ نکات پر مذاکرات ہو سکتے ہیں اور کچھ کو زیر بحث لانا مناسب نہیں"۔

سیاسیات کے طالب علم اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب چھ نکات کا سیاسی جواب ممکن تھا تو پورے پاکستان میں ان کے خلاف سب سے پہلی آواز بھٹو کی ابھری تھی اور سیاسی طور پر یہ نکات مشرقی پاکستان کے عوام کا جذباتی مسئلہ بنا دیئے گئے' تو ان کے بارے میں سب سے زیادہ محتاط رویہ بھٹو نے اختیار کیا' نہ انہوں نے ان کی تائید کی اور نہ ہی اس موقع پر مخالفت۔ اب بھٹو کے دورہ مشرقی پاکستان کے مقاصد کا تجزیہ کر لیا جائے اس وقت بھی وہاں بائیں بازو کی ایسی منتشر طاقتیں موجود تھیں خاص طور پر وہاں کے بکھرے ہوئے کسان لیڈر جو چھ نکات کے چکر میں پڑنے کے بجائے اپنے اصل معاشی مسائل کے حل کے آرزو مند تھے مگر ان سے رابطہ کرنے کے لئے مجیب الرحمان کے ساتھ کسی نہ کسی ڈھب کی مفاہمت ضروری تھی ورنہ مارشل لاء کی موجودگی اور مڈل کلاس پر مجیب الرحمان کے تسلط کی وجہ سے یہ ناممکن تھا لہٰذا اگست 1969ء میں بھٹو کے دورۂ ڈھاکہ کی روداد اخباروں میں پڑھیں تو پتہ چلتا ہے کہ بھٹو شیخ مجیب کی طرف بڑھ رہے تھے اور وہ ان کے ساتھ تعاون سے گھبرا رہے تھے' کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ میرا تعاون حاصل کر کے بھٹو اگر ایک مرتبہ یہاں کے عوام میں گھس گئے تو ان کا حقیقی انقلابی پروگرام اور گوریلی سامراج دشمنی اس نعرے کا جادو توڑ کر رکھ دیں گی جو چھ نکات کی صورت میں ان کے حواری بورژوا مفاد پرست گروہوں نے ان کی قیادت میں عوام کے سامنے پورے زور سے لگایا ہے۔ شیخ مجیب وہاں کی انقلابی قوتوں کو شکست دے کر عوام کی قیادت سنبھالنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن یہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر ایک مرتبہ بھٹو نے اس خطے کے عوام سے براہ راست رابطہ قائم کر لیا تو پھر ان کی قیادت باقی نہیں رہ سکے گی ملکی تاریخ کے اس موڑ پر بھی مشرقی پاکستان کے ترقی پسند لیڈر کوئی فیصلہ کن مؤقف اختیار نہ کر سکے اور اس طرح مجیب الرحمان نے بپھرے ہوئے انقلابی عوام کو چھ نکات کی زنجیر میں جکڑ کر انقلابی راہ سے ہٹا دیا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں شیخ مجیب کس طرح گوارا کر سکتے تھے کہ بھٹو اپنے انقلابی اور سامراج دشمن پروگرام کے ساتھ وہاں کے عوام کی تائید حاصل کر سکیں؟

www.bhutto.org

گیارہواں باب

طوفانی دورے اور انتخابی مہم

28 ستمبر کو بھٹو نے بیرونی سفر اختیار کیا۔ قاہرہ میں صدر ناصر مرحوم سے ملاقات کر کے انہیں کشمیر پر پاکستان کے مؤقف سے ایک بار پھر آگاہ کیا۔ پیرس سے ہوتے ہوئے برطانیہ گئے اور وہاں پارٹی کی تنظیمی صورت حال کا جائزہ لیا' وہاں مقیم پاکستانیوں نے بھی ہر شہر میں ان کا شاندار اور پرجوش استقبال کیا۔ نومبر میں واپس پاکستان آئے اور عوامی رابطہ کی مہم دوبارہ شروع کر دی اس بار انہوں نے معاشی نظام کی تبدیلی پر زیادہ زور دینا شروع کر دیا اس سے قبل زورِ بیان کا جو حصہ آمریّت کے خلاف صرف ہوتا تھا وہ بھی معاشی نظام کی تبدیلی کے لئے وقف ہو گیا پارٹی کے مرکزی دفتر اور کورنگی میں پارٹی آفس کے قیام پر وہاں کے مزدوروں سے خطاب کے دوران ان کا زیادہ تر موضوع معاشی ناہمواریاں تھیں بعد میں وہ اندرون سندھ کے دورے پر تشریف لے گئے اور لاڑکانہ' غریبو' شہداد کوٹ اور حیدر آباد وغیرہ میں نمائندہ اجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے رجعت پسندوں کی طرف سے کھڑے کئے گئے سندھی مہاجر شوشے کی مذمت کی اور عوام کو تلقین کی کہ وہ اس قسم کی سازشوں کا شکار نہ ہوں اصل مسئلہ صرف لوٹ کھسوٹ کے نظام کا خاتمہ ہے' جو سندھیوں اور مہاجروں کو بلا امتیاز کھائے جا رہا ہے۔ عوام کو ان رجعت پسندانہ نعروں سے متاثر نہیں ہونا چاہئے اور متحد رہ کر انقلابی جدوجہد کو جاری رکھنا چاہئے ان تقریروں میں انہوں نے یحییٰ حکومت پر دباؤ ڈالنے کی پالیسی بھی جاری رکھی تاکہ وہ انتخابات میں کوئی تاخیری حربہ اختیار کرنے کی جرأت نہ کر سکے انہوں نے واضح کر دیا کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ اس آمریّت کے خلاف بھی جدوجہد کے لئے تیار ہیں۔

www.bhutto.org

سندھ کا دورہ مکمل کر کے وہ پھر پنجاب کے دورے پر آ گئے اور اب انہوں نے مستقبل کے دستور کے بارے میں بھی اپنے نظریات واضح کرنا شروع کر دیئے۔ 24 نومبر کو ملتان کی پریس کانفرنس میں انہوں نے پانچ بنیادی نکات سامنے رکھے جو وفاقی پارلیمانی نظام' بالغ رائے دہی' مغربی پاکستان کے سابقہ صوبوں کی بحالی' آبادی کی بنیاد پر منتخب ایوان زیریں اور تمام صوبوں کی یکساں نمائندگی کی بنیاد پر ایوان بالا کی تجاویز پر مشتمل تھے۔ جیسے جیسے بھٹو عوام کو جذباتی فضا سے نکال کر معاشی نظام کی ٹھوس بنیادوں پر منظم کر رہے تھے' اسی تناسب سے رجعت پسندوں کی مخالفت شدّت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ پورے ملک میں سوشلزم کے خلاف زبردست مہم شروع کر دی گئی اور اس مہم کو یحییٰ حکومت کی براہ راست سرپرستی حاصل تھی' یحییٰ خان نے مستقل طور پر برسر اقتدار رہنے کے لئے جوڑ توڑ شروع کر دیئے تھے وہ جماعتیں جو کبھی بھی عوام میں اپنی جڑیں نہیں بنا پائی تھیں انہیں اصل سائز سے بڑھا چڑھا کر پیش کیا جانے لگا۔ مقبوضہ اخبارات اور سرکاری ذرائع ابلاغ نے اس میں کافی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سرکاری حوصلہ افزائی نے "صالحین" کے حوصلے بڑھا دیئے اور وہ نہ صرف سیاست میں تشدّد کی زبان استعمال کرنے لگے' بلکہ عملی طور پر بھی یہ روّیہ اختیار کر لیا۔ 28 نومبر کو جناب بھٹو صادق آباد میں کارکنوں کے ایک اجتماع سے خطاب فرمانے لگے تو وہاں چند مذہبی کارکنوں نے ہنگامہ آرائی کی کوشش کی' لیکن پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے پورے نظم و ضبط اور حوصلہ مندی کے ساتھ ان پر قابو پا لیا اور یوں یہ اجلاس کامیابی سے جاری رہا۔ لیکن فسادی ایک ٹرک میں سوار ہو کر جناب بھٹو کی واپسی کے راستے پر مورچہ زن ہو گئے اور جب وہ اپنی کار میں ریلوے کراسنگ کے قریب سے نکلنے لگے تو یہ لوگ اپنی کمین گاہوں سے بر آمد ہو کر ان پر حملہ آور ہو گئے اور اندھا دھند اینٹوں اور پتھروں کی بارش ہونے لگی' جناب بھٹو کی کار کو اس وقت مصطفیٰ کھر چلا رہے تھے جو ایک ماہر ڈرائیور ہیں' انہوں نے پھرتی سے کار کو اصل سڑک سے ہٹا کر ان دیکھے کچے راستے پر ڈال لیا لیکن دوسری کاروں میں آنے والے کارکنوں کو حملہ آور نرغے میں لینے میں کامیاب رہے اور امان اللہ خان اور دوسرے چند کارکن شدید زخمی ہو گئے' بمشکل تمام یہ لوگ اپنی جانیں بچا کر وہاں سے نکل پائے۔ جناب بھٹو تقریباً پانچ گھنٹے تک انجانے راستوں پر بھٹکنے کے بعد رحیم یار خان پہنچ سکے ان کی طبیعت پہلے ہی خراب تھی لیکن اس تکلیف دہ سفر نے بخار کی شدّت میں اضافہ کر دیا لیکن اس حالت میں بھی انہوں نے رحیم یار خان سے ملتان کی جانب سفر جاری رکھا۔ اس صریح قاتلانہ حملہ کی خبر پھیلتے ہی پاکستان کے عوام میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ طلبہ' وکلاء اور مزدوروں کی طرف سے اس واقعے کی مذمت کی جانے لگی' لیکن جماعت اسلامی نے تمام دینی و اخلاقی اقدار کو نظر انداز کرتے ہوئے قاتلانہ حملے کی اس خبر کو "سیاسی جھوٹ" قرار دیا اور اس طرح عوام کے اس شک کو تقویت دی کہ اس حملے میں جماعت والوں کا ہاتھ تھا۔

www.bhutto.org

جماعت اسلامی ان دنوں رجعت پسندوں کی سرخیل بن چکی تھی اور اسے ملک بھر کے سرمایہ داروں کی دامے' درمے' سخنے بھرپور مدد حاصل تھی۔ جاگیرداری' سرمایہ داری اور لامحدود ذاتی ملکیتوں کو اسلام کا تحفظ مہیا کرنے کے لئے بنیادی مقاصد سے ہٹ کر مساواتِ محمدیؐ کے نظام کے خلاف اس کے حملے تمام دینی و اخلاقی حدود پھلانگ رہے تھے' میں کچھ اس وجہ سے اور کچھ دوسرے بنیادی دینی اختلافات کے باعث 65ء میں جماعت اسلامی سے الگ ہو جانے پر مجاہدانہ اور قوم پرستانہ مؤقف اختیار کیا تھا اس کی وجہ سے ان کی ذات ملک بھر کے عوام کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ ظاہر ہے میں اس عوامی موڑ سے الگ نہ تھا لیکن میں نے عملی سیاست سے مکمل کنارہ کشی اختیار کر رکھی تھی۔ لہٰذا اس وقت جناب بھٹو کو پسند کرنے اور ان کے قوم پرستانہ کردار کا تجزیہ کرنے کی نوعیت صرف اکیڈیمک تھی لیکن میں پورے خلوص سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ جس تیزی کے ساتھ وہ ملکی سیاسی منظر میں ابھر رہے ہیں لازماً وہ مستقبل کی قومی سیاست میں اہم کردار ادا کرنے والے ہیں' پھر جب وہ ایوب آمریت کے خلاف میدان جنگ میں اترے اور عوامی تحریک کی قیادت کرتے ہوئے اپنے انقلابی معاشی نظام کا پرچار کرنے لگے تو ان کی ذات میں میری دلچسپی اور بڑھ گئی۔ اس سے قبل سوشلزم سے میرا واسطہ صرف ان فیشن ایبل سوشلسٹوں کی حد تک تھا جو جناب بھٹو کے میدان سیاست میں آنے سے پہلے اس فلسفے کے پرچارک تھے ان کی وجہ سے یہ جدید سیاسی و معاشی نظریہ مجھے کچھ زیادہ متاثر نہ کر سکا تھا لیکن جب بھٹو نے مساواتِ محمدی کا نعرہ بلند کیا اور سوشلزم کو اپنی پارٹی کا معیشتی نظریہ قرار دیا تو اس توانا سیاسی شخصیت کے اس نئے نعرے نے سوشلزم کو پاکستان میں ایک نئی جہت دے دی۔ یہی وجہ تھی کہ ان دنوں میں نے نہ صرف سوشلزم کے لٹریچر کا از سر نو مطالعہ کیا بلکہ اسلام کے معاشی و اقتصادی نظام پر بھی اردو عربی انگریزی زبان میں میسر آنے والی تمام کتابیں میں نے پڑھ ڈالیں اس تقابلی مطالعے نے میرے فکر کو ایک نئی جلا بخشی اور میں یہ جان کر سخت متعجب ہوا کہ ہمارے بعض مذہبی حلقے جس معاشی و اقتصادی سرمایہ دارانہ نظام کو اسلام کا نظام قرار دینے پر مصر ہیں اس کی تو کوئی مثال اسلام کے اس پہلے معاشرے میں دکھائی نہیں دیتی جو حضورؐ نے پہلی صدی ہجری سے لے کر بارہ ہجری تک تعمیر کیا تھا اور جسے خلفائے راشدین نے اپنے عہدِ رُشد وہدایت میں تکمیل بخشی تھی۔

حضورؐ نے تو مساواتِ محمدی کی بنیاد رکھی تھی۔ حضورؐ نے تو اپنا لباس اس لئے کوتاہ رکھا کہ جماعت کے دوسرے افراد کو لباس مہیا ہو۔ حضورؐ نے تو کئی کئی دن تک اس لئے بھوک برداشت کی کہ حضورؐ کے ساتھیوں کو روٹی میسر آئے۔ حضورؐ نے تو کبھی جماعت کے بھوکے افراد کو ساتھ رکھے بغیر کھانا نوش نہ فرمایا۔ حضورؐ نے تو کئی بار اپنی قمیص اپنے جسم سے اتار کر ننگے ساتھیوں کو پہنا دی۔ حضورؐ نے تو اپنی صاحب زادی سیدۃ الزہراؑ کی ضرورتوں پر مدینہ کی بیواؤں کی حاجتوں کو ہمیشہ مقدم رکھا۔ حضورؐ تو ایسی کھردری

www.bhutto.org

چٹائی پر سوتے جس کے نشان حضورؐ کے جسم مبارک پر اکثر پڑ جاتے تھے حضورؐ تو ایسے حجروں میں رہائش رکھتے تھے جن کی چھتیں صرف سوا سات فٹ تھیں' جن پر پھونس اور مٹی ڈالی گئی تھی حضورؐ کے ان حجروں کی دیواریں تو کچی مٹی کی بنی تھیں۔

اور حضورؐ تو جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے تو ان کی ایک زرہ بکتر ایک یہودی کے پاس چند سیر جو کے عوض رہن رکھی ہوئی تھی۔

میں نہیں کہہ سکتا جماعت اسلامی اور بعض دوسری "اسلام پسند" جماعتوں نے جناب بھٹو کے اسلامی سوشلزم یا مساواتِ محمدی کے خلاف جب مہم شروع کی تھی تو ان میں سے کسی ایک نے حضورؐ کی معاشی حکمت عملی کے بارے میں مورّخ ابن سعد' محدث الترمذی' مورّخ ابن اسحاق' ابن ہشام' قاضی ابویوسف اور امام ابو عبیدؒ کی تصریحات پڑھی تھیں یا نہیں پڑھی تھیں۔ تاہم جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد مجھے جو سعادت نصیب ہوئی اور میں نے ان کتابوں کا مطالعہ کیا تو مجھے بڑی شدت کے ساتھ یہ احساس ہوا کہ جناب بھٹو مساواتِ محمدی کا جو نعرہ بلند کر رہے ہیں اور جاگیرداریوں' سرمایہ داریوں اور غریبوں کے استحصال کے خلاف جو احتجاج فرما رہے ہیں یہی وہ معاشی انصاف و عدل ہے جس کی تعلیم اسلام نے دی ہے اور میں نے خلوص نیت کے ساتھ یہ چاہا کہ میں بھی جناب بھٹو کا ہم نوا بن جاؤں اور انکی آواز کے ساتھ اپنی آواز کا زیر و بم شامل کر کے پاکستان کے مسلمانوں کو یقین دلاؤں کہ اسلام کا اصل معاشی نظام وہی ہے جسے اسلامی سوشلزم اور مساوات محمدی کہا جا رہا ہے۔

ماضی کے سوشلسٹوں کے برعکس جناب بھٹو نے پاکستان کے تہذیبی تاریخی اور دینی پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے جو متوازن نظریہ پیش کیا تھا اس وقت کی صورتحال میں مجھے اپنے قومی حالات کے تحت وہی سب سے زیادہ موزوں و مناسب دکھائی دیا۔ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی ہنوز قائم تھی سیاست اس وقت صرف پریس کانفرنسوں' بند کمروں کے اجلاسوں اور اخباری بیانات تک محدود تھی۔ لہٰذا اپنے ان نظریات کی روشنی میں' میں نے اپنے سیاسی نظریات سے عوام کو آگاہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ جماعت اسلامی کی طرف سے حکومت کی اعانت کے ساتھ اس زمانے میں ترقی پسند نظریات رکھنے والوں پر شدید حملے ہو رہے تھے میں ان کی مزاحمت میں ڈٹ گیا تھا چنانچہ جس وقت انجمن حمایت اسلام کے کالج سے چند اساتذہ کو محض اس لئے برطرف کیا گیا کہ وہ ترقی پسند نظریات رکھتے تھے تو اس اقدام کے خلاف پہلی صدائے احتجاج میں نے بلند کی اور کچھ دنوں کے بعد اس کی مذمّت میں ایک بیان بھی جاری کیا اپنے اس بیان میں اساتذہ کی جبری بے روزگاری کی مذمّت کے علاوہ میں نے سوشلزم کے اقتصادی نظام کے بارے میں بھی اپنے خیالات کی وضاحت کی تھی پاکستان پیپلز پارٹی کے وہ کارکن جو ان دنوں تقریباً سبھی مذہبی حلقوں کی طرف سے ہدف بنے ہوئے تھے انہوں نے میرے ان بیانات سے کافی تقویت محسوس کی اگر اسے تعلّی

www.bhutto.org

نہ قرار دیا جائے تو یہ امر واقعہ ہے کہ اس دور میں مذہبی حلقوں سے غالباً میں پہلا قابل ذکر دینی طالب علم تھا جس نے یوں کھل کر نہ صرف مساواتِ محمدی کے نعرے کی تائید کی تھی بلکہ یہ نعرے لگانے والوں کو اسلامی نقطہ نظر سے دلائل و براہین کی کمک بھی پہنچائی تھی۔ یہی سبب تھا کہ پیپلز پارٹی کے کارکنوں اور مقامی رہنماؤں سے میرا گہرا رابطہ قائم ہو گیا تھا اور میں نے جناب بھٹو کی کتابیں اور بیانات پڑھنے کے بعد ان کے فلسفہ سیاست سے کافی واقفیت بہم پہنچائی تھی اور ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کر لیا تھا کہ ملکی حالات کے تحت ایسے اہم موڑ پر کسی بھی دردمند اور باشعور فرد کے لئے سیاست سے کنارہ کشی بے حسی کے مترادف ہوگی میں پوری طرح طے کر چکا تھا کہ اگر مستقبل کی سیاست میں مجھے کوئی رول ادا کرنا ہے تو وہ صرف ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں ہی ادا کروں گا۔

اہل وطن کو خبر ہے کہ ان دنوں ملک میں مارشل لاء نافذ تھا اور یحییٰ حکومت نے سیاسی جلسوں اور جلوسوں پر پابندی لگا رکھی تھی' یہ پابندی 1969ء کے آخری مہینہ کے آخری ہفتہ میں اٹھائی گئی تھی اور پیپلز پارٹی نے اپنا پہلا جلسہ یکم جنوری 1970ء کو سرگودھا میں منعقد کیا تھا میں نے پیپلز پارٹی کی دعوت پر اس جلسہ میں پارٹی میں شامل ہوئے بغیر مساواتِ محمدی پر پہلی تقریر کی اور پارٹی کے عوامی مقاصد کو اپنی پوری خطیبانہ قوت کے ساتھ لوگوں کے گوش گذار کیا۔

اس تاریخ کے بعد ملک کا شاید ہی کوئی حصہ ہو جہاں میں نے پارٹی کے جلسہ سے خطاب نہ کیا ہو' جناب بھٹو جہاں جہاں بھی تشریف لے گئے اور جہاں جہاں بھی پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم پر عوام کو خطاب کیا میں ان میں سے بعض مقامات پر ان کے ساتھ شامل تھا۔

خیال رہے کہ میں نے اگست 1970ء تک پیپلز پارٹی کے لئے یوں تو اپنی ساری توانائیاں وقف کر دی تھیں اس کے باوجود میں نے اس کی باقاعدہ رکنیت اس پریس کانفرنس میں اختیار کی تھی جو جناب بھٹو نے راولپنڈی میں یہ اعلان کرانے کے لئے بطور خاص طلب کی تھی اس کے چند ہی دن بعد مجھے پارٹی کا سیکرٹری اطلاعات مقرر کیا گیا تھا اور میں پارٹی کی حکومت کے بعد بھی تادم آخر اسی منصب پر فائز رہا۔

جناب بھٹو اس سارے زمانے میں مجھ پر بے حد شفقت فرماتے رہے۔ کئی کئی دن مجھے لاڑکانہ میں اپنے دولت کدہ پر مہمان رکھتے اور مجھے اپنی خلوتوں میں بھی شریک کرتے اور جلوتوں میں بھی۔

میں نے کئی سفر ان کے ساتھ کئے اور ایسی محفلوں میں بھی ان کے ساتھ رہا جن میں صرف ان کے چند ہی دوست بار یابی کے قابل سمجھے جاتے تھے۔

یہ تمہیدی کلمات میری زبان پر صرف اس لئے آئے ہیں تاکہ میں قارئین کرام کو بتا سکوں کہ میں نے جناب بھٹو کی شخصیت اور ان کی سیرت و کردار کو بہت قریب سے دیکھا ہے میں نے ان کے روشن چہرے کے سارے خدوخال حتیٰ کہ تابناک پیشانی کی شکنیں تک شمار کی ہیں میں نے ان کے دن بھی

www.bhutto.org

دیکھے ہیں اور راتیں بھی میں نے ان پر صبحوں کو طلوع ہوتے بھی پایا ہے اور شاموں کے غروب کی سرخی کو بھی انہیں پیٹے دیکھا ہے اور میں پورے وثوق اور پورے استشہاد کے ساتھ یہ گواہی دے سکتا ہوں کہ انہوں نے عوامی جدوجہد کے دنوں میں بھی شاموں میں بھی اور راتوں میں بھی عوام کی مصیبتوں' دُکھوں اور تکلیفوں کا کرب کچھ اس طرح محسوس کیا ہے جیسا کہ یہ ساری مصیبتیں ان کی اپنی مصیبتیں اور دکھ ان کے ذاتی دکھ ہیں۔

ان کی راتیں نیند سے محروم رہیں تو صرف اس لئے کہ عوام اس استحصال سے نجات پالیں' جس میں اس ملک کے سرمایہ داروں نے عوامی زیست کو جکڑ رکھا ہے ان کی صبحیں محض اس لئے پریشان رہیں کہ وہ عوام کی پریشانیاں گوارا نہ کر سکے تھے۔

انہوں نے 1967ء کے دسمبر سے لے کر 1970ء کے دسمبر تک جو عوامی جدوجہد کی ہے وہ ایک مثالی جدوجہد ہے وہ ایشیا کی نئی تاریخ میں ایک سنہرے باب کی حیثیت رکھتی ہے۔

عظیم لینن' عظیم ماؤزے تنگ' کم ال سنگ' صدر ناصر اور صدر سوکارنو یقیناً ان سے قدیم العہد بھی ہیں اور اوّلیت بھی رکھتے ہیں ان عظیم شخصیّتوں نے اپنے ہاں کے عوام کو سکھ اور آرام پہنچانے کے لئے بے پناہ کاوش کی ہے اور عوامی فلاح اور معاشی انصاف کی ترویج کی خاطر بڑی جدوجہد کی ہے۔

میں جناب بھٹو سے ان کا مقابلہ نہیں کروں گا البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ جناب بھٹو نے بھی عوامی احیاء اور جبر و ظلم کے خلاف جدوجہد میں ان شخصیتوں کے قدم بہ قدم چلنے کی پوری سعی کی ہے۔

انہوں نے عوامی جدوجہد کے دنوں میں ایک ایک دن میں کئی کئی سو میل کی دشوار گذار مسافتیں قطع کیں ایک ایک دن اور ایک ایک رات میں پینتیس جلسوں سے خطاب کیا۔

اور کئی مواقع تو ایسے بھی آئے کہ وہ سخت بیمار ہونے کے باوجود پے در پے کئی جلسوں میں شامل ہوئے۔ ایک دن تو انہیں ایک سو دو درجے کا بخار تھا۔ گرمی سخت پڑ رہی تھی وہ کئی جلسوں میں مسلسل تقریریں کرنے کے بعد مظفر گڑھ پہنچے تھے جہاں مصطفےٰ کھر اور نواب زادہ نصر اللہ خان میں انتخابی مقابلہ ہو رہا تھا۔ حالانکہ ڈاکٹر نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ کسی جلسہ میں شریک نہ ہوں اس کے باوجود وہ مظفر گڑھ کے جلسہ میں شامل ہوئے اور تقریر کے لئے مائیک پر آئے اور تقریر شروع کر دی۔

تقریر کے دوران بیماری پہلے سے بھی زور پکڑ گئی بخار کئی درجے اور بڑھ گیا ان کا جی متلانے لگا اور وہ بے ہوش ہو کر سٹیج ہی پر گر گئے مگر جیسے ہی ہوش آیا تو وہ ساتھیوں کے سہارے اوپر کو اٹھے اور رکی ہوئی تقریر پھر سے شروع کر دی اور عوام النّاس کو ایسے محسوس ہوا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

ان کی ذاتی خوبیوں اور شخصیت کی دل آویزی کے بارے میں مزید تاثرات کا اظہار تو میں آگے چل کے کروں گا یہاں صرف اتنا بتانا مقصود تھا کہ پیپلز پارٹی میں رسمی شمولیت سے در حقیقت کافی عرصہ قبل ہی

www.bhutto.org

میں عملی سیاست میں ان کا شریک سفر ہو چکا تھا اور اس وقت ان کا ساتھ دینا کوئی آسان کام نہ تھا اور خاص طور پر مجھ ایسے مذہبی پس منظر رکھنے والے فرد کے لئے اس وقت بھٹو کا ساتھ دینے کا مطلب مارشل لاء حکومت کا عتاب، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی مخالفت اور رجعت پسند مذہبی تنظیموں کا ہدف ملامت بننے کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے اس پُرخطر راستے کا انتخاب پوری طرح سوچ سمجھ کے کیا تھا، اس وقت میرے پیش نظر صرف ایک بات تھی، پاکستان کے غریب اور مظلوم عوام کی فلاح و بہبود اور میرے نزدیک عوام کو اس منزل پر پہنچانے والے قائد صرف ایک تھے اور وہ تھے ذوالفقار علی بھٹو۔

ان دنوں مشرقی پاکستان کے عوام تو آبادی کی بنیاد پر نمائندگی کا مطالبہ کر رہے تھے، لیکن مغربی پاکستان میں ان کے اس مطالبے کے حق میں کوئی قابل ذکر آواز بلند نہ ہوئی تھی۔ جناب بھٹو نے نہ صرف اپنی مہم کے دوران مشرقی پاکستان کے عوام کے اس مطالبے کی تائید کی بلکہ، اسے منظور کرانے کے لئے بھرپور جدوجہد بھی کی اور ون یونٹ کے خلاف تو وہ ابتدا ہی سے برسرپیکار تھے، یہ انہی کی جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ یحییٰ خاں کو مجبور ہو کے نومبر میں یہ دونوں مطالبات تسلیم کرنے پڑے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ بھٹو نے درحقیقت انہی دو فیصلوں کے اعلان کی یقین دہانی پر یحییٰ کی فوجی حکومت کو تسلیم کیا تھا۔ ورنہ اگر یحییٰ خاں بھٹو کو یقین نہ دلاتے کہ وہ آبادی کی بنیاد پر نمائندگی اور ون یونٹ کو توڑنے کے فیصلے نہیں کریں گے تو بھٹو کو عوام کی اتنی انقلابی تائید حاصل تھی کہ وہ اس فوجی حکومت کو بھی متزلزل کر دیتے، اس فیصلے کا اعلان کرا کے بھٹو نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام کے دیرینہ مطالبات کی تکمیل کر دی تھی۔

سیاسی سرگرمیوں سے پابندی اٹھ جانے کے بعد بھٹو نے خود انتخابی مہم کی قیادت کرتے ہوئے 4 جنوری 1970ء کو کراچی کے عظیم جلسہ عام سے خطاب فرمایا۔ اس تقریر میں ان کا زیادہ تر موضوع اسلامی سوشلزم ہی کی وکالت تھی، جس میں انہوں نے علامہ اقبالؒ، قائداعظمؒ، قائد ملتؒ اور سہروردی کے حوالوں سے ثابت کیا کہ یہ رہنما بھی اسلامی سوشلزم کے قائل تھے۔ انہوں نے عوام کو یہ بھی بتایا کہ یہ رجعت پسند مجیب کے سوشلزم کے نعرے پر کیوں خاموش رہتے ہیں اور بھٹو کے سوشلزم پر کیوں سیخ پا ہوتے ہیں؟ اس تقریر کے دوران انہوں نے عوام کو یہ نعرہ دیا کہ

اسلام خطرے میں نہیں

سرمایہ داری اور جاگیرداری خطرے میں ہے

اس پوری تقریر میں اسلامی سوشلزم پر اسلامی نقطہ نگاہ سے جس شدت کے ساتھ زور دیا گیا، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت مذہبی حلقوں کی طرف سے پیپلز پارٹی پر کس قدر شدید حملہ جاری تھا۔ یہی وہ حملہ تھا جس کے مقابلے میں ڈٹ جانے کے لئے میں نے بھٹو کی قیادت قبول کی اور سرمایہ داروں اور

www.bhutto.org

جاگیرداروں کے مقابلے میں محنت کشوں کی صفوں میں شامل ہو کے' اسلام کی انقلابی روح کی ترجمانی کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ 6 ر جنوری کو بھٹو کراچی بار ایسوسی ایشن میں خطاب فرمانے تشریف لے گئے تو یہاں بھی جماعت کے حامی وکلاء نے غنڈہ گردی کرنے کی کوشش کی' لیکن جناب بھٹو نے پامردی سے اس غنڈہ گردی کا مقابلہ کیا اور اپنی تقریر مکمل کر کے ہی دم لیا۔

گیارہ جنوری کو بھٹو راولپنڈی میں پہلے انتخابی جلسے سے خطاب فرمانے آئے۔ لیاقت باغ کا یہ جلسہ بھی ماضی کے تمام ریکارڈ توڑ گیا اور اس کی حاضری نے پنجاب کے عوام کے رجحان کی نمائندگی کی۔ اب یہ ثابت ہو گیا تھا کہ عوام کی اکثریت نے رجعت پسندوں کے الزامات کو رد کر کے' بھٹو کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ اس موقع پر جیسا کہ دوسری پارٹیاں وسیع پیمانے پر طویل انتظامات کر کے اور زر کثیر کے صرفے کے بعد بھی جو جلسے کرتی تھیں' ان میں حاضرین کی تعداد ناقابل ذکر ہوتی تھی' اس کے برعکس پیپلز پارٹی کے پاس نہ فنڈز تھے اور نہ اسے سرکاری ذرائع ابلاغ میں پبلسٹی ملتی تھی۔ اس کے باوجود عوام جوق در جوق انہی جلسوں میں شریک ہوتے تھے' نہ صرف شریک ہوتے' بلکہ سرگرمی کے ساتھ خود ہی ان جلسوں کا انتظام بھی کرتے۔ ہر شہر اور ہر گاؤں میں جگہ جگہ مکانوں کی چھتوں پر صرف پیپلز پارٹی کے پرچم دکھائی دیتے۔ اس صورتحال سے گھبرا کر بعض دوسری جماعتوں نے بھی ہزاروں کی تعداد میں اپنی جماعت کے ریشمی اور خوبصورت جھنڈے بنوا کر لوگوں میں تقسیم کئے۔ لیکن انہیں نصب کرنے والا کوئی نہیں ملتا تھا۔ یحییٰ خاں کا وزیر اطلاعات تمام احتیاطیں نظرانداز کر کے پوری طرح رجعت پسندوں کا سرغنہ بن چکا تھا اور نہ صرف اپنی تقریروں اور بیانات میں کھل کر اپنے عوام دشمن نظریات کا پرچار کرتا بلکہ اس کی نگرانی میں چلنے والے اخبارات اور ریڈیو ٹیلی ویژن کو یہ ہدایات جاری کر دی گئی تھیں کہ دوسری رجعت پسند جماعتوں کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا جائے اور بھٹو کی خبریں دبائی جائیں۔ چنانچہ بڑی دلچسپ صورت حال پیدا ہو گئی۔ عوام صرف بھٹو کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ رجعت پسندوں کے جلسوں میں اتنے حاضرین ہی نہ ہوتے کہ اخباروں کے فوٹو گرافر کیمرہ ٹرک کے ساتھ بھی ان کی تعداد کو معقول کر کے ہی دکھا سکیں۔ اس مجبوری کا علاج یہ تلاش کیا گیا کہ بھٹو کے جلسوں کے حاضرین کی تصویر لے کر ان کے سامنے کسی "اسلام پسند" لیڈر کی تصویر چسپاں کر دی جاتی' بھٹو کے ساتھ ستم یہ تھا کہ سرکاری و غیر سرکاری دونوں ہی قسم کے اخبارات ان کے خلاف تھے' غیر سرکاری اخبارات سرمایہ داروں کے مفادات کی وجہ سے بھٹو کے خلاف تھے اور سرکاری اخبارات شیر علی خاں کی سرپرستی میں ہمارے خلاف پارٹی بن چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف بھٹو کی خبروں کو نظرانداز کیا جاتا بلکہ جو تھوڑی بہت خبر شائع بھی ہوتی اسے بھی یوں مسخ کیا جاتا کہ عوام تک بھٹو کے اصل خیالات نہ پہنچ پاتے' اس صورت حال نے اخبارات میں کام کرنے والے اہل دل صحافیوں کو بھی بے چین کر دیا تھا اور وہ اس پر احتجاج کر رہے

www.bhutto.org

تھے۔ جس کا حل شیر علی خاں نے یہ ڈھونڈا کہ ان صحافیوں ہی کو بیروزگار کر دیا جائے' چنانچہ پاکستان بھر کے اخبارات سے ترقی پسند صحافیوں کو چُن چُن کر نکالا جانے لگا۔

پارٹی کے پاس جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں کوئی سرمایہ نہ تھا' اس کا سرمایہ صرف غریب اور محنت کش عوام کی محبت و عقیدت تھی' جس کا اظہار وہ جلسوں' جلوسوں اور استقبالیوں میں شریک ہو کر کیا کرتے۔ لیکن رجعت پسندوں کی دیدہ دلیری اس قدر بڑھ چکی تھی کہ وہ بھٹو پر نظریاتی حملوں سے گذر کے ان کی کردار کشی پر اتر آئے تھے۔ ان کی ذات پر حد درجہ پست اور گھٹیا الزامات لگائے جاتے۔ لیکن پارٹی کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہ تھا جو الزام تراشی کے جواب میں ویسا ہی جارحانہ انداز اختیار کر کے الزام لگانے والوں کا منہ توڑ جواب دے سکتا۔ ہفت روزہ "نصرت" جناب بھٹو کی تقریروں اور سرگرمیوں کی رپورٹیں تو بہم پہنچاتا تھا' لیکن اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دے سکتا تھا۔ عوام کے جذبات بپھرے ہوئے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان کے رہنما ہر گھٹیا الزامات لگانے والوں کو منہ توڑ جواب دیا کریں۔ میں خود بھی متوسّط طبقے کا آدمی تھا۔ میرے ذاتی وسائل اتنے نہیں تھے کہ اپنے طور پر کوئی بڑا اخبار جاری کر سکوں' لیکن وہ صورت حال بھی میں برداشت کرنے سے قاصر تھا' چنانچہ میں نے اپنے ذاتی ہفت روزہ "شہاب" ہی کو اپنے محدود وسائل کی روشنی میں پارٹی کی خدمت کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کر لیا اور مارچ 1970ء میں مشہور صحافی نذیر ناجی کی مدد سے اخباری محاذ پر بھٹو کے مخالفین کو منہ توڑ جواب دینا شروع کیا' میں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں رجعت پسندوں کے سرکاری سرغنہ شیر علی خاں پر بھی بھرپور تنقیدیں شروع کر دیں' صحافیوں کو بے روزگار کرنے کی رجعت پسندانہ مہم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا' بھٹو کی کردار کشی کرنے والوں کو انہی کے رنگ میں آئینہ دکھایا۔ اس ہفت روزہ کو جو عوامی مقبولیت نصیب ہوئی' اس کی مثال پورے برّصغیر کی صحافتی تاریخ میں نہیں ملتی۔ بعد میں اس ہفت روزہ کے ذریعے پارٹی کے ترجمان روزنامہ "مساوات" کے لئے بھی عوام سے چندے کی اپیل کی گئی۔ یہ ہفت روزہ جو اپنے حلقۂ اثر سے دو روزناموں کو ہزاروں روپے کے عطیات جمع کر کے دے رہا تھا۔ اس کے لئے میں نے خود نہ کسی پارٹی کارکن سے اور نہ ہی پارٹی سے کسی قسم کی مالی مدد قبول کی۔

بھٹو اَن تھک طریقے سے' تمام رجعت پسندوں کے مقابلے میں اپنی انتخابی مہم کی قیادت کر رہے تھے' جنوری ہی میں وہ سندھ کے اندرونی حلقوں میں گئے۔ اس دورے کے دوران وہ نہ صرف عوام کو پارٹی کے حق میں منظم کر رہے تھے۔ بلکہ اپنی ماہرانہ نظروں سے پارٹی کی انتخابی جیت کو بھی پرکھ رہے تھے۔ وہ عوام کے کتنے گہرے نبض شناس ہیں؟ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک بار سندھ میں انہوں نے بھاری جلسے سے خطاب کیا' حاضرین کی تعداد بہت زیادہ تھی' بھٹو نے وہاں خاصی پُراثر تقریر کی لیکن واپسی پر انہوں نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ

www.bhutto.org

"ہم یہ نشست نہیں جیت سکیں گے"

اور وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ

"میں نے جلسے میں موجود حاضرین کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا ہے' ان کی آنکھوں میں وہ انقلابی چمک مفقود تھی' جو میری پارٹی کے انقلابی منشور سے عوام کی آنکھوں میں عزم وہمت کے باعث پیدا ہوتی ہے"

بعد میں انتخابی نتائج نے ان کے خیال کی تصدیق کی اور ہم وہ نشست ہار گئے۔ جس رہنما کو عوام کے جذبات کی پہچان میں یہ دسترس حاصل ہو' اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ انتخابات میں اتنی کامیابی کی خود توقع نہیں کر رہے تھے سراسر غلط ہوگا۔ میں انتخابات سے کافی عرصہ پہلے جیل چلا گیا تھا۔ لیکن اس وقت بھی بھٹو کو اپنی پارٹی کی کامیابی کا حقیقت پسندانہ اندازہ تھا۔ وہ قومی وصوبائی اسمبلیوں میں اپنی متوقع نشستوں کی ٹھیک ٹھیک تعداد بتایا کرتے تھے۔ وہ پوری طرح محسوس کر رہے تھے کہ آنے والے انتخابات میں امیدواروں کی ذاتی شخصیت ورسوخ کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی اور محض ان کا جاری کردہ ٹکٹ امیدوار کی کامیابی کی ضمانت ہوگا۔ یہاں ان کی سیاسی مہارت کی ایک اور مثال کا ذکر بھی بے جانہ ہوگا۔ جب پارٹیوں کو انتخابی نشانات الاٹ کئے جارہے تھے تو بھٹو نے پہلے اپنی پارٹی کے لئے رائفل کا نشان منتخب کیا تھا اور جب یہ نشان فہرست میں شامل نہ کیا گیا تو انہوں نے بلا تامل تلوار کا نشان چن لیا۔ اس نشان کا انتخاب کرتے وقت بھی وہ پاکستان کے عوام کی نفسیات کو پوری طرح سمجھ رہے تھے' بعد کے واقعات نے ان کے اس انتخاب کی مقبولیت کو عملاً ثابت کر دکھایا۔

سندھ کا انتخابی دورہ مکمل کرنے کے بعد وہ سرحد تشریف لے گئے۔ وہاں "نیپ" اپنے پروگرام کے ساتھ پوری طرح سرگرم تھی۔ لیکن بھٹو نے اس صوبے میں بھی عوام کو اپنی قیادت میں منظم کر لیا۔ عوامی سطح پر اس صوبے میں پارٹی کو قابل ذکر مقبولیت حاصل ہوگئی' 21 ر جنوری کو وہ راولپنڈی ڈویژن کے دورے پر آئے۔ یہ تو ایک طرح ان کا اپنا علاقہ تھا' عوام نے دل وجان سے ان کا خیر مقدم کیا۔ 23 ر کو وہ سرگودھا ڈویژن اور سیالکوٹ کے دورے پر پہنچے' اس دوران وہ جدھر سے گذرے عوام نے ان کے رستے میں آنکھیں بچھادیں۔ اب وہ آہستہ آہستہ اپنی انتخابی مہم کو دیہی علاقوں پر مرتکز کر رہے تھے۔ وہ کسانوں کو ایک نیا شعور دے رہے تھے۔ اس سے قبل مزارعوں کو جاگیرداروں کی میراث سمجھ کر انہیں سیاسی چوہدریوں کی میراث تصوّر کیا جاتا تھا اور کسی بھی سیاست دان نے انہیں جیتے جاگتے انسان سمجھ کر' ان کے پاس جاکے' اپنا سیاسی پروگرام ان کے گوش گذار کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بھٹو پہلی بار براہ راست آبادی کے اس مظلوم اکثریتی طبقے کے پاس چل کر گئے اور انہی کی زبان میں بات کر کے ان کے سیاسی شعور کو بیدار کیا۔ اس کے بعد سندھ کا مختصر سا دورہ کر کے وہ ملتان ڈویژن کے دورے پر

www.bhutto.org

تشریف لے آئے۔ فروری میں سرحد کے دورے پر تشریف لے گئے۔ اس بار مردان اور پشاور میں لوگوں نے پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش سے ان کا استقبال کیا۔

ابھی تک وہ گوجرانوالہ نہیں جا سکے تھے' سرحد کا دورہ مکمل کر کے وہ فروری کے آخر میں گوجرانوالہ آئے۔ یہاں شدید بارش کے باوجود ان کا جلسہ اس شہر کی تاریخ کا سب سے بڑا اجتماع تھا۔ عوام کی محبت و عقیدت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ پورے جلسے کے دوران شدید بارش ہو رہی تھی لیکن اس کے باوجود کوئی ایک فرد بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ تقریر کے دوران جناب بھٹو کو چھتری دے کر بارش سے بچانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن انہوں نے چھتری لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ جس طرح عوام بارش میں بھیگ کر میری تقریر سن رہے ہیں' میں بھی ان کے ساتھ بھیگوں گا۔

یکم مارچ کو دینہ پہنچے' وہاں سے ایک تاریخی جلوس کی قیادت کرتے ہوئے گجرات تک آئے۔ 45 میل لمبا یہ جلوس عوام کے حقیقی جوش و جذبے کا آئینہ دار تھا۔ کسانوں' مزدوروں' طلبہ اور غریب شہریوں نے ہر وہ سواری جو انہیں میسر آئی لے کر اس جلوس میں شمولیت کی۔ یہ انسانوں کا انبوہ عظیم تھا' جو قومی شاہراہ پر ایک سیلاب کی صورت میں آگے بڑھ رہا تھا۔ دریائے جہلم کا پل عبور کر کے' یہ انسانی سیلاب گجرات شہر کی جانب رواں دواں تھا' یہاں انہوں نے عظیم انتخابی جلسے سے خطاب کیا اور حافظ آباد سے ہوتے ہوئے لاہور تشریف لائے۔ جہاں ایک پُرہجوم پریس کانفرنس میں مارشل لاء حکومت کے رویے پر تنقید کی اور الزام لگایا کہ وہ چند مخصوص سیاسی جماعتوں کی سرپرستی کر رہی ہے اور ان کے ارکان کو لائسنسوں اور پرمٹوں سے نواز رہی ہے۔ جن سے حاصل شدہ سرمایہ وہ انتخابات پر خرچ کریں گے۔ کراچی جا کر انہوں نے پھر یہ الزام دہرایا اور وارننگ دی کہ عوام اس سیاسی اقربا پروری کو کسی صورت میں برداشت نہیں کریں گے۔

8 مارچ کو لاہور کے باغ بیرون موچی دروازہ میں وہ ناقابل فراموش جلسہ ہوا جس کے حاضرین کی تعداد نے سابقہ تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ حاضری کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ حاضرین برانڈرتھ روڈ' دہلی دروازے' شاہ عالمی کے موڑ اور اس کے اندر کی تمام گلیوں تک پھیلے ہوئے تھے' مکانوں کی چھتیں انسانی سروں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ درجنوں لاؤڈ سپیکروں کے شاندار انتظامات کے باوجود اس پھیلے ہوئے انسانی انبوہ تک بھٹو کی آواز پہنچنا مشکل ہو گئی تھی۔ اس جلسے میں انہوں نے پبلک اسٹیج پر اپنی زندگی کی طویل ترین تقریر کی۔ اور وہ تین گھنٹے دس منٹ تک داخلی و خارجی مسئلے پر دل کھول کے بولے۔ اس پورے عرصے کے دوران حاضرین حد درجہ صبر و سکون اور نظم و ضبط کے ساتھ ان کی تقریر سنتے رہے۔ کسی مقرر کو اتنے لمبے عرصے تک' اتنے بڑے اجتماع نے ایسے غور اور توجہ کے ساتھ' پہلے کم ہی سنا ہو گا۔

www.bhutto.org

رجعت پسندوں کی بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ وہ بھٹو کی قیادت میں بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لئے 'اسلام کو باقاعدہ سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ اسلامی سوشلزم کا نام لینے والوں پر کفر کے فتوے لگائے جا چکے تھے۔ میں اپنے طور پر ان فتوؤں کا مذہبی عقائد کی روشنی میں جواب دے رہا تھا۔ لاہور کے جلسے میں جناب بھٹو نے خود بھی یہ فتوے جاری کرنے والوں کو آڑے ہاتھوں لیا اور سامراجیوں کی ان سازشوں کو بھی بے نقاب کیا جو وہ پاکستان کی آزادی و خود مختاری کے خلاف کر رہے تھے۔ گیارہ مارچ کو کراچی میں کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے مستقبل کے آئین کے بارے میں اپنے نظریات کی وضاحت کی اور صاف کہہ دیا کہ اگر دستور میں معاشی مسائل کا حل فراہم نہ کیا گیا تو ان کی پارٹی اسے قبول نہیں کرے گی۔ اس موقع پر وقت کے لحاظ سے یہ اہم اعلان تھا کیونکہ تیرہ مارچ کو وہ ڈھاکہ جانے والے تھے اور ایک طرح روانہ ہونے سے قبل ہی انہوں نے اشارہ کر دیا تھا کہ ان کی پارٹی کی جدوجہد اس استحصالی نظام کے خلاف ہے' جو ملک کے دونوں بازوؤں کے غریبوں کا خون چوس رہا ہے۔ ڈھاکہ پہنچ کر انہوں نے ایئرپورٹ پر ہی اعلان کر دیا کہ

"صوبائی خود مختاری کی حدود کا تعین نمائندہ سیاسی جماعتیں ہی کر سکتی ہیں'
مارشل لاء حکومت کو اپنے طور پر یہ کام کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں"

اس دورے کے دوران وہ کارکنوں سے ملے اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس وقت چھ نکات کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے با اثر حلقے کافی حد تک مجیب کے حلقۂ اثر میں آ چکے تھے اور ایسی فضا پیدا کر دی گئی تھی کہ کوئی معقول آواز بلند کرنی مشکل ہو گئی تھی۔ اس فضا میں جناب بھٹو نے مفاہمت کے دروازے کھلے رکھے اور ڈھاکہ کی پریس کانفرنس میں صاف کہا کہ ہم نے اپنے طور پر صوبائی خود مختاری کی کوئی حدود متعین نہیں کیں۔ ہماری صرف ایک شرط ہو گی کہ ایک قابلِ عمل اور مؤثر مرکز کے تحت جو ملک کی سالمیت و یکجہتی کا ضامن ہو' ہر قسم کی گفت و شنید کی جا سکتی ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ انتخابات کے نتائج کے بعد پیپلز پارٹی نے اپنا مؤقف بدلا تھا ان کی تردید کے لئے اس پریس کانفرنس کی روداد ہی کافی ہے۔ بھٹو نے ابتدا ہی سے پاکستان کی سالمیت و یکجہتی کی ضمانت کی موجودگی میں ہر قسم کی مفاہمت کا راستہ کھلا رکھا تھا اور صرف اس ڈیڑھ نکتے پر اختلاف کیا تھا جو یہ بنیاد فراہم کرنے سے قاصر تھا۔ اس نظریئے کے تحت انہوں نے چھ نکات کا مکمل تجزیہ کر کے رائے دی تھی کہ

"چھ نکات کا اصل مقصد علیحدگی کے سوا کچھ نہیں"

ہر چند انہوں نے چھ نکات کو اپنی انتخابی مہم کا موضوع نہیں بنایا کہ شیخ مجیب ردِ عمل کے طور پر کوئی مزید شوشہ نہ کھڑا کر دیں۔ لیکن جہاں نظریاتی مؤقف کی وضاحت کرنی پڑتی' وہاں بھٹو ان پر اپنے اعتراضات کا برملا اظہار کرتے۔ لیکن پاکستان کے قومی مفاد کی خاطر انہوں نے انتہائی رویہ اختیار کرنے

www.bhutto.org

سے گریز کیا۔ جب کہ دوسری پارٹیاں ان کی مخالفت کی آڑ میں مشرقی پاکستان کے عوام کی خواہشات کو بھی تنقید کا نشانہ بنا رہی تھیں اور باہمی نفرت کی خلیج کو اپنی اس روش کے باعث وسیع کر رہی تھیں۔ ڈھاکہ سے واپس آکر وہ سندھ کے انتخابی دورے پر چلے گئے اور ٹھٹھہ ' سجاول ' جھوک ڈیرو ' حیدر آباد ' بدین ' ٹنڈو جام ' میرپور خاص ' سمارو اور ٹنڈو الہ یار میں عوام سے رابطہ قائم کیا۔ اس دورے میں سندھ کے عوام نے جس گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا اور پیپلز پارٹی کی جس شدت سے تائید کی ' اس نے رجعت پسندوں کی نیندیں حرام کر دیں۔ انہیں صاف دکھائی دینے لگا کہ اگر بھٹو اس انقلابی رفتار سے عوام کو منظم کرتے رہے تو ان کا جنازہ نکل جائے گا۔

مارچ کے آخر میں اس دورے کے دوران جب وہ سانگھڑ کے جلسے میں خطاب کرنے تشریف لے گئے تو ان گنت افراد کو ان کی ہلاکت پر مامور کیا گیا۔ جلسہ شروع ہو چکا تھا اور جناب بھٹو اپنے کارکنوں کے ہمراہ جلسہ گاہ کی طرف جا رہے تھے کہ ایک مقام پر انہیں اطلاع دی گئی کہ کچھ مسلح افراد ان پر حملے کے لئے مورچے سنبھالے بیٹھے ہیں۔ جناب بھٹو یہ سن کر اپنی جیپ سے اترے اور کارکنوں کے جلوس کی قیادت کرنے لگے۔ ابھی وہ چند فرلانگ آگے بڑھے ہوں گے کہ مکانوں کی چھتوں سے گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ جس سے جلوس میں شریک کارکن زخمی ہو کر گرے۔ جناب بھٹو سے برداشت نہ ہوا اور انہوں نے تیزی کے ساتھ حملہ آوروں کی طرف بڑھتے ہوئے سندھی زبان میں پکار کے کہا

"میں بھٹو ہوں۔ گولی مارنی ہے تو مجھے مارو۔ غریب عوام کو کیوں مارتے ہو"

اسی دوران ایک گولی ان کے سر کے بالکل قریب سے گذر گئی ' یہ دیکھ کر ان کے ذاتی ملازم نور محمد مغل مرحوم نے آگے بڑھکر زبردستی انہیں زمین پر لٹا دیا اور خود ان کے اوپر جھک گئے۔ سینکڑوں دوسرے کارکنوں نے اپنے قائد کے گرد اپنے جسموں کا حصار کھڑا کر دیا۔ جناب بھٹو اٹھنے کی کوشش کرتے رہے ' لیکن کارکنوں نے انہیں گولیوں کی زد سے محفوظ رکھا۔ تین کارکن اس فائرنگ سے ہلاک ہوئے اور بیس سے زیادہ زخمی۔ اس کے بعد پولیس موقع واردات پر آئی اور آنسو گیس چھوڑ کر حملہ آوروں کو منتشر کیا۔ جناب بھٹو اب بھی جلسہ گاہ کی طرف جانے پر مصر تھے ' لیکن انہیں اطلاع دی گئی کہ شرپسندوں کے دوسرے منظم گروہ نے جلسہ گاہ پر حملہ کیا تھا اور اب لوگ منتشر ہو چکے ہیں۔ بھٹو پھر بھی خود جلسہ گاہ جا کر ذاتی طور پر موقع کا معائنہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے رفقاء انہیں زبردستی اپنے ساتھ لے کر حیدر آباد کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس حملے کی خبر نے پورے ملک میں اضطراب اور بے چینی پھیلا دی۔ جگہ جگہ احتجاجی جلوس نکلے ' جلسے ہوئے ۔ مزدوروں ، کسانوں نے رجعت پسندوں کی اس حرکت پر شدید نفرت کا اظہار کیا۔ مجھے ذاتی طور پر اس حملے سے شدید دکھ پہنچا تھا۔ جس کا اظہار میں نے "شہاب کے اداریے" "لیاقت سے بھٹو تک۔ ایک ہی گولی" کے عنوان سے کیا کیونکہ اس تحریر کا ایک ایک لفظ

www.bhutto.org

عوام کے دلوں کا ترجمان تھا اس لئے یہ اداریہ بعد میں سندھی ' پشتو اور اردو میں پوسٹروں کی صورت میں طبع کرا کے عوام نے ہر شہر اور گاؤں کی دیواروں پر چسپاں کر دیا۔

اس حملے کے خلاف عوام کے مثالی ردّعمل کا اظہار 15 اپریل کو اس جلوس کی صورت میں ہوا جو موئن جو دڑو کے ہوائی اڈے سے شروع ہو کر لاڑکانہ تک گیا۔ ہزاروں عوام نے فاتحانہ انداز میں بھٹو کو ایئرپورٹ سے ریسیو کر کے لاڑکانہ تک مارچ کیا اور یہ جلوس تین گھنٹے تک شہر کے بازاروں میں گشت کرتا رہا اور اپنے پرجوش نعروں میں حملہ آوروں کی مذمت کر کے ' انہیں للکارتا رہا۔ المرتضیٰ کے سامنے جناب بھٹو کی مجاہدانہ آواز ابھری۔

" پاکستان کے عوام بہادر عوام ہیں۔ وہ بہادروں ہی کو اپنا رہنما بناتے ہیں۔ بزدلوں اور منافقوں کو پسند نہیں کرتے۔ لاڑکانہ ہمارا سانگھڑ ہے ' لاڑکانہ ہی پر کیا موقوف پورا پاکستان ہمارا سانگھڑ ہے حتیٰ کہ سانگھڑ بھی ہمارا ہے "

اس تقریر میں انہوں نے واضح کر دیا کہ اس قسم کے بزدلانہ حملے انہیں خوفزدہ نہیں کر سکتے بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ جرأت اور سرگرمی کے ساتھ ملک کے غریب عوام کی جدوجہد کی قیادت کریں گے۔ سانگھڑ میں اڑنے والے مظلوموں کے خون کے چھینٹوں نے عوامی جدوجہد کو نئی توانائی عطا کر دی ' غریب عوام تشدد کے جواب میں دلیرانہ انداز میں ڈٹ گئے اور اب انہوں نے عہد کر لیا کہ بھٹو کی قیادت میں اگر انہیں خون کے دریا سے گذر کے بھی منزل تک پہنچنا پڑا تو وہ اس سے دریغ نہیں کریں گے۔

بارہ اپریل کو لیاری میں جلسہ کر کے جناب بھٹو نے کراچی کی سیاست کو نیا رُخ دے دیا۔ لیاری کا علاقہ کراچی کے ایک سرمایہ دار کی خاندانی جاگیر تصوّر کیا جاتا تھا اور کوئی دوسرا امیدوار اس حلقے سے کامیابی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن کراچی میں یہی حلقہ پیپلز پارٹی کا گڑھ بن گیا۔ بھٹو کے جلسے میں لاکھوں غریب باشندوں نے عہد کیا تھا کہ وہ ووٹ کے ذریعے اپنے علاقے کے سیاسی سیٹھوں کا جنازہ نکال دیں گے۔ اس جلسے میں جناب بھٹو نے لیگل فریم آرڈر کے نکات کے باہمی تضادات پر روشنی ڈالی اور منتخب نمائندوں کے مرتب کردہ دستور کو نامنظور کرنے کا اختیار فرد واحد کو دینے پر تنقید کی۔ انتخابات کے دوران لیاری کے عوام نے قدیم سیاسی سیٹھوں کا برج الٹ دیا اور بھٹو کی تلوار کو ووٹ دے کر اپنے انقلابی موڈ کی نشاندہی کر دی۔

19 ر اپریل کو وہ پھر سرحد کے طویل اور تفصیلی دورے پر تشریف لائے اور مانسہرہ ' ہری پور ' نوشہرہ ' کوہاٹ ہنگو ' ڈیرہ اسماعیل خان ' ٹانک ' کلاچی ' بنوں ' پشاور ' مردان ' صوابی ' چارسدہ اور منصورہ تشریف لے گئے۔ گیارہ دنوں کے مختصر سے عرصے میں ان شہروں کے علاوہ انہوں نے راستوں میں جابجا عوام کے اجتماعات سے خطاب کیا۔ یہ طوفانی دورہ انہوں نے 29 ر اپریل کو مکمل کیا۔ اب ان

www.bhutto.org

کی انتخابی مہم شہروں اور قصبوں سے نکل کر براہ راست ملک کی وسعتوں میں پھیلے مظلوم کسان عوام تک رسائی حاصل کر رہی تھی۔ موسم گرما کا آغاز انہوں نے گرم ترین خطے لیہ سے کیا۔ ملتان جا کر ممتاز آباد کے باشندوں سے ملے۔ جناب دولتانہ کے گڑھ وہاڑی تشریف لے گئے اور دولاکھ کے تاریخی اجتماع سے خطاب کیا۔ اس وقت پیپلز پارٹی کی طوفانی یلغار دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سندھ' پنجاب اور سرحد کے کھیت اور میدان بھٹو کی منظم فوجوں کے آماجگاہ ہیں۔ کسی بھی مقام پر بھٹو کی آمد میلے کا منظر پیدا کر دیتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ صدیوں کا خوابیدہ کسان بھٹو کی آواز پر اب پوری طرح بیدار ہو چکا ہے۔ رجعت پسندوں کا سرمایہ سرکاری اور غیر سرکاری پریس کی سرپرستی اور تنخواہ دار کارکنوں کی محنت سب بیکار جا رہے تھے۔ حالانکہ انتخابات کے لئے اکتوبر میں وقت معین کر دیا گیا تھا۔ لیکن عوام کے جذبات کا اندازہ کر کے ان لوگوں کی بدحواسی بڑھ گئی تھی اور اب وہ مارشل لاء حکومت کے سامنے فریاد کناں تھے کہ ..... "خدارا انتخابات کسی بہانے سے ملتوی کر دو" تاکہ یہ لوگ اپنی سی کوشش کر دیکھیں۔ انہی دنوں شیر علی خاں نے پیپلز پارٹی کے پرچموں کی ملک کے ہر حصے میں بھرمار دیکھ کر اس ارادے کا اظہار کیا کہ "سیاسی جماعتوں کے پرچموں پر پابندی لگا دی جائے" عوام اس تجویز کی مخالفت میں ڈٹ گئے کیونکہ اس کا مقصد صرف پیپلز پارٹی کے پرچم اُتروانا تھا۔ کسی اور جماعت کے جھنڈے لگانے کو عوام تیار ہی نہیں تھے اور اپنی اس خفت پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ قانون کی مدد چاہ رہے تھے۔ جناب بھٹو نے چیچہ وطنی کے جلسے میں انتخابات کے التواء کی تجاویز کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ لوگ اپنی عدم مقبولیت سے گھبرا کر مزید جوڑ توڑ کے لئے مہلت تلاش کر رہے ہیں۔ بعد میں ان لوگوں نے یحییٰ خاں پر الزام لگایا کہ اس نے انتخابی مہم کو طول دے کر مسائل کو الجھانے میں مدد دی ہے۔ 3 راگست کو ساہیوال میں بھٹو نے پھر انتخابات کے التوا کی تجویزوں کی مخالفت کی اور مطالبہ کیا کہ وزیروں کو برطرف کر دیا جائے کیونکہ وہ انتخابات پر اثرانداز ہونے کے لئے اپنی سرکاری پوزیشن کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ساہیوال سے پاک پتن تک کا تمام راستہ کسانوں سے پُر تھا۔ انہوں نے 28 میل کی مسافت دو گھنٹے میں طے کی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ لوگ جشن منا رہے ہیں۔ جیسے ہی انہیں دور سے بھٹو کی کار دکھائی دیتی' وہ فرطِ مسرت سے بے تاب ہو کر اپنے دہقانی انداز میں ڈھول کی تھاپ پر یہ گیت گاتے ہوئے رقص کرنے لگتے۔

"بھٹو آ گیا میدان میں ہے جمالو"

ملکہ ہانس کے قصبے میں عوام کے شدید اصرار پر بھٹو نے انہیں خطاب کیا اور پاک پتن میں حضرت بابا فرید گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کی درگاہ پر سلام کے لئے حاضر ہوئے اور مزار پر چادر چڑھانے کے بعد اس وسیع اجتماع سے خطاب کرنے تشریف لے گئے جو تین گھنٹے سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ ان دنوں بھٹو کا سفر درحقیقت ایک رواں دواں میلے کا منظر ہوا کرتا تھا۔ وہ عوام کے دلوں کی دھڑکن بن چکے تھے۔ جس راہ

www.bhutto.org

سے بھی گذرتے وہ تاحد نگاہ ایک میلے کا سماں باندھ دیتی۔ اسی عوامی انداز میں وہ اوکاڑہ تشریف لے گئے۔ چوہنگ میں عوام سے رابطہ قائم کرنے کے بعد وہ لاہور آئے اور آس پاس کے دوسرے شہروں کے علاوہ قصور میں عظیم الشان جلسے سے خطاب کیا۔ ان دنوں ان کا اچھرہ میں منعقد ہونے والا جلسہ اس لحاظ سے یادگار ہے کہ وہ پیپلز پارٹی کی زبردست مخالفت کرنے والی جماعت اسلامی کے گڑھ میں منعقد ہوا تھا۔

18 اگست کو جناب بھٹو اچھرہ میں لاہور کے عوام سے مخاطب ہوئے اور جماعت کے راہنماؤں کو للکار کر کہا

"میں نام نہاد اسلام پسندوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ جس اسلام کا تم نام لیتے ہو وہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا نہیں، تمہارا خود ساختہ اسلام ہے"

یحییٰ حکومت اب نام نہاد غیر جانبداری کو چھوڑ کر، رجعت پسندوں کے پلڑے میں پوری طرح اپنا وزن ڈالنے لگی تھی۔ بھٹو کی طرف سے انتخابات کے التواء پر تنقید کے باوجود اس نے ان لوگوں کے مطالبوں پر انتخابات ملتوی کر دیئے۔ 25 راگست کو بہاولنگر کے تاریخی اجتماع میں بھٹو نے اس فیصلے پر کڑی تنقید کی اور یہیں انہوں نے کابینہ کے تین وزراء کے نام لیکر ان کی جانبداری کا بھرم کھولا۔ واپسی پر ہیڈ باریکا، میکلوڈ گنج روڈ، اوکاڑہ، سلیمانکی، پتوکی اور بھائی پھیرو غرض راستے میں ہر جگہ عوام نے ان کا روایتی شان و شوکت سے استقبال کیا۔ یہی دن تھے جب ہمارے مجاہد ساتھی اور بھٹو کے جانثار کارکن حق نواز گنڈہ پور انتخابی مہم کے دوران شہادت پا گئے۔ جناب بھٹو کو اس کا دلی صدمہ پہنچا اور وہ کئی روز تک مغموم رہے۔ اس شدت غم کی کیفیت میں انہوں نے ضلع لائل پور کا دورہ کیا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ، کمالیہ، ڈجکوٹ، رجانہ، سمندری وغیرہ کے علاوہ ہر گاؤں میں گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ پورا پنجاب گھروں سے نکل کر بھٹو کے راستے میں آ گیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی ہر گذرگاہ دراصل ایک نہ ختم ہونے والے جلسے کا سلسلہ بن چکی تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ اس دورے میں بھی یہی صورت حال دیکھنے میں آئی۔ اگست کے آخری ہفتے میں انہوں نے وزیر آباد، لالہ موسیٰ، گکھڑ، فتح جنگ، تلہ گنگ، کہوٹہ، کوٹلہ عرب علی خاں، منڈی بہاؤالدین وغیرہ کا دورہ کیا اور لاکھوں عوام سے خطاب کیا۔ لاہور سے واپس آئے تو لاہور چھاؤنی اور برکی میں جلسوں سے مخاطب ہوئے۔ برکی کا جلسہ یوم دفاع کے سلسلے میں تھا۔ ظاہر ہے کہ جنگ ستمبر کا بھٹو سے جو گہرا واسطہ ہے، اس کی روشنی میں بھٹو کے اس جلسے کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پنجاب کے دور دراز کے علاقوں سے عوام جلوسوں کی صورت میں اس جلسے میں شریک ہوئے۔ اس روز لاہور کا ہر راستہ برکی کو جا رہا تھا۔ ستمبر کے دوسرے ہفتے کا آغاز سوات اور مالاکنڈ ڈویژن کے دورے سے کیا اور اس علاقے کے عوام جن تک کوئی قابل ذکر سیاسی رہنما نہیں پہنچا تھا۔ بھٹو سے براہِ راست ملے

www.bhutto.org

اس سرسری جائزے سے آپ اندازہ کر چکے ہوں گے کہ بھٹو کس طوفانی رفتار کے ساتھ پورے ملک میں عوام سے براہ راست مل رہے تھے۔ دوسری سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کو اپنے حلقہ ہائے انتخابات ہی سے مہلت نہیں مل رہی تھی۔ لیکن ان کے برعکس بھٹو پورے مغربی پاکستان میں ہر حلقے کو اپنا حلقہ تصوّر کر کے ایک سی اہمیت دے رہے تھے۔ انہی دنوں میں مارشل لاء کے تحت گرفتار ہو کے جیل جا چکا تھا۔ ان کے دوسرے کئی ساتھیوں کو بھی بعد میں گرفتار کر لیا گیا اور اس طرح عین نقطۂ عروج پر انتخابی مہم کی تمام تر ذمہ داری تنہا ان کے کاندھوں پر آ پڑی۔ ورنہ اس سے قبل میں اپنے طور پر انتخابی مہم میں حسب استطاعت ان کا ہاتھ بٹاتا رہا تھا۔ بھٹو اپنے انتخابی حلقے کا مختصر سا دورہ کر کے حیدر آباد تشریف لے گئے اور 22 ستمبر کو انہوں نے لیاقت آباد کراچی میں محنت کش عوام کے عظیم اجتماع سے خطاب کیا۔ ان کا یہ جلسہ بھی بہت کامیاب رہا۔

اگلے ہی روز وہ ملتان کے عوام میں آ چکے تھے۔ پنجاب کے اس دورے میں بھی ان کی طوفان رفتاری مزید تیز ہو گئی۔ میاں چنوں، چنیوٹ اور راولپنڈی تو صرف اہم مقامات کے نام ہیں اصل میں وہ ان تمام شہروں اور خطوّں کے درمیان واقع تمام آبادی سے ایک ایک انچ پر ملاقات کر رہے تھے۔ کوئی دوسرا سیاسی رہنما اس توانائی اور ان تھک محنت کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔ یہ بھٹو ہی کا دم تھا کہ وہ موسمی اثرات، سفر کی تکلیفات، دن رات کی تھکن ایسی تمام چیزوں کو خاطر میں لائے بغیر ہر دم رواں دواں رہے، ان کی اس جدوجہد کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ عوام کی تائید محض اخباری بیانوں یا نظریات کی تشہیر سے نہیں ملتی۔ بلکہ ٹھوس نظریات کے ساتھ ساتھ قیادت کی بے پناہ صلاحیتوں اور اس انتھک محنت سے حاصل ہوتی ہے، جس کا مظاہرہ جناب بھٹو نے اپنی سیاسی جدوجہد میں کیا۔

ستمبر کے اواخر میں انہوں نے لیاقت باغ راولپنڈی کے عظیم اجتماع سے خطاب کیا۔ اس وقت تک ان کے بہت سے نمایاں ساتھی گرفتار کر لئے گئے تھے۔ لیکن اس کمی کو بھی بھٹو نے اپنی توانائیوں سے بھرپور ذات کی وجہ سے کسی کو محسوس نہ ہونے دیا اور اپنی انقلابی انتخابی مہم کو تیز سے تیز کرتے چلے گئے۔ جس کی وجہ سے رجعت پسند پارٹیوں اور ان کی سرپرست حکومت کو شدید پریشانی لاحق ہو رہی تھی اور اس تجویز پر غور کیا جا رہا تھا کہ بھٹو کے اس روز بروز بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کیلئے خود ان کی گرفتاری کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہ گیا۔ ان تجویزوں پر بھٹو نے اس جلسے میں حکومت کو خبردار کیا۔

"اگر میری گرفتاری عمل میں لائی گئی تو عوام اسے بالکل برداشت نہیں کریں گے اور پھر ملک میں جو خون خرابہ ہو گا اس کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہو گی"

یہیں انہوں نے مارشل لاء حکومت سے سوال کیا کہ:۔

"کیا تمہاری غیرت کو ژنیازی ہی کی تحریروں سے جوش میں آتی ہے؟ اور تم اسے

www.bhutto.org

گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیتے ہو؟ "چٹان" اور "زندگی" ہمارے خلاف کچھ بھی لکھیں تمہاری غیرت جوش میں نہیں آتی' کیا یہی غیر جانبداری ہے؟"

ان کی یہ تقریر تقریباً تمام قومی اور خارجی مسائل کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ وہ پھر پشاور کے دورے پر گئے تو اس بار پورا شہر ان کے استقبال کے لئے ایئرپورٹ پر امڈ آیا تھا۔ ہجوم کی کثرت اور لوگوں کی بے تابی کے سبب نظم و نسق انتظامیہ کے کنٹرول سے باہر ہو گیا اور جناب بھٹو کو کافی آگے جا کر رن وے سے منی بس کے ذریعے باہر لایا گیا۔ جہاں سے وہ ایک مجاہدانہ جلوس کی قیادت کرتے ہوئے شہر گئے۔ ایئرپورٹ سے جناح پارک تک کا فاصلہ تین گھنٹے میں طے ہو سکا۔ یہاں انہوں نے عظیم الشان اجتماع سے خطاب فرمایا اور یحییٰ خاں کے متوقع امریکی دورے کی مخالفت کی' ان کی رائے تھی کہ ایک فوجی حکمران جس کی عوام میں کوئی جڑیں نہ ہوں بڑی طاقت کے دباؤ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پشاور ہی میں پریس کانفرنس کے دوران انہوں نے انکشاف کیا کہ اب تک پیپلز پارٹی کے ڈیڑھ سو سرگرم کارکن گرفتار کئے جا چکے ہیں۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ پیپلز پارٹی انتخابات میں حصہ نہ لے سکے۔ درحقیقت اس طرح کی حرکتوں سے حکومت بھٹو کو مجبور کر رہی تھی کہ وہ کسی طرح اشتعال میں آ کر انتخابات کا بائیکاٹ کر دیں۔ لیکن ان فوجی سیاست دانوں کو معلوم نہیں تھا کہ پیپلز پارٹی صرف چند جیل جانے والے لیڈروں کا نام نہیں بلکہ کروڑوں عوام کے جوش و جذبے اور عزم کا نام ہے جو بھٹو کی ذات واحد میں مجسم ہو کر طوفان کی شکل اختیار کر گیا۔ لہٰذا اس بات کا سوال ہی نہیں تھا کہ بھٹو جیسا سیاستدان فوجی سیاستدانوں کی ان اناڑی چالوں میں آ جاتا۔ جب بھٹو نے کھل کر اعلان کر دیا کہ ان کی پارٹی انتخاب میں حصہ لینے کے لئے پوری طرح تیار ہے تو یہ لوگ پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور منصوبہ بنا لیا گیا کہ لاہور میں بھٹو کو گرفتار کر لیا جائے۔

بھٹو کو اس منصوبے کا علم ہو گیا۔ انہوں نے فوری طور پر گول باغ لاہور میں جلسہ عام طلب کر لیا۔ اس جلسے سے قبل اس جگہ کا نام گول باغ تھا۔ لیکن جلسہ ختم ہونے پر عوام کے دلوں کے "حکمران نے اس کا نام "باغ ناصر" رکھ دیا اور عوام نے دل و جان سے ان کا یہ فیصلہ قبول کر کے' کسی سرکاری اعلان کے بغیر اس مقام کے نئے نام کو رائج کر دیا۔ کئی لاکھ افراد کے اس عظیم اجتماع میں جب بھٹو نے اپنے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ شاید آج ہی رات انہیں گرفتار کر لیا جائے گا تو عوام کا غیظ و غضب دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا' عوام نے بے تاب ہو کر دس منٹ تک مارشل لاء حکومت اور اس کی پٹھو جماعتوں کی منظم انداز میں مذمت کی اور اس عزم کا اظہار کیا کہ اگر حکومت نے یہ جسارت کی تو عوام اپنی جانوں پر کھیل جائیں گے۔ یحییٰ خاں کے مخبروں نے اسے اطلاع دی کہ عوام کس حد تک اشتعال میں تھے تو اسے اپنے ارادے کو ترک کرنا پڑا۔ وہ اور اس کے فوجی مشیر محسوس کر چکے تھے کہ اگر بھٹو کو ہاتھ لگایا گیا تو مغربی پاکستان کے عوام خون کی ندیاں بہا دیں گے۔ مجبوراً بھٹو کو گرفتار کرنے کا ارادہ بدلنا پڑا۔ اس

www.bhutto.org

کے بعد بھی بھٹو کے دورے طوفان رواں کے مانند جاری رہے۔ چونکہ مقامات کے نام اور جلسے جلوسوں کی تفصیل کے باعث یکساں قسم کے واقعات کی تکرار ناگوار سی معلوم ہوگی۔ آپ سابقہ سرگرمیوں کی روشنی میں یہ قیاس فرمالیں کہ بھٹو اس تیزی اور سرگرمی کے ساتھ رجعت پسندوں سے چومکھی لڑتے' فوجی حکمرانوں اور دوسری سیاسی پارٹیوں کے باہمی گٹھ جوڑ کو ناکام بناتے ایک سی برق رفتاری کے ساتھ سرگرم رہے' اس عرصے کے دوران انہیں پارٹی کے انتخابی ٹکٹوں کی تقسیم کے کٹھن مرحلے سے بھی گذرنا پڑا۔ پیپلز پارٹی کے امیدوار زیادہ تر نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنے انتخابی اخراجات برداشت کرنے کے بھی اہل نہ تھے۔ بیشتر امیدوار ٹکٹ لینے کے بغیر بھی اپنے رہنما کے پاس آتے اور انتخابی اخراجات کے لئے ان سے مدد طلب کرتے لیکن ان کا جواب ہوتا

"نہ میرے ساتھ سرمایہ دار ہیں اور نہ جاگیردار' روپیہ کہاں سے آئے"

اور طنزاً کہتے:۔

"چین والے روپیہ نہیں دیا کرتے۔ جاؤ عوام پر بھروسہ کرو"

ایسے امیدواروں کو مدد دینے کے لئے "بھٹو کو ووٹ دو.....نوٹ دو" کی مہم چلائی گئی ہزاروں غریب مزدوروں اور کسانوں نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اس میں عطیات جمع کرائے۔ لیکن لوگوں کے جذبے اور لگن کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ یہ احتیاط بھی فضول تھی۔ پیپلز پارٹی کے امیدواروں کو خود کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی' ان کے قائد نے عوام کے دلوں کو اس قدر گرما دیا تھا کہ بیشتر حلقوں میں امیدوار ست تھے اور ووٹر چست' بعض ایسے واقعات بھی ہوئے کہ اپنی پسند کے حلقے میں ٹکٹ نہ ملنے پر بعض امیدواروں نے ناراض ہوکر اپنی انتخابی مہم بھی نہ چلائی اور مایوس ہوکر گھر بیٹھ گئے۔ لیکن جب انتخابی نتائج سامنے آئے تو وہ بھاری اکثریت سے کامیاب تھے۔ بھٹو نے ان انتخابات میں تمام سابقہ روایتیں توڑ دیں۔ پرانے سیاست دانوں کی اکثریت ان کے گمنام امیدواروں کے مقابلے میں ہار گئی جاگیردار' گدی نشین اور وڈیرے جو ہمیشہ سے اپنی گھریلو نشستوں کو جدی ملکیت تصور کرتے تھے عوام کے فیصلے کے ایک ہی ریلے میں بہہ گئے۔ قومی اسمبلی کے انتخابات میں پیپلز پارٹی نے' اپنی حمایت کے ساتھ کامیاب کرائے ہوئے آزاد امیدواروں کو چھوڑ کر 88 نشستیں حاصل کیں اور ان میں چار نشستیں صرف بھٹو نے تنہا جیتی تھیں۔ اس طرح وہ مغربی پاکستان کے واحد منتخب عوامی نمائندے کے طور پر سامنے آئے' یہ نتائج یحییٰ خاں کے فوجی حکمران ٹولے اور رجعت پسندوں کے لئے حیران کن تھے۔ یحییٰ خاں جو اپنے سیاسی مشیروں کے اعداد و شمار کے گورکھ دھندوں میں پھنس کے یقین کئے بیٹھے تھے کہ کوئی بھی پارٹی انتخابات میں فیصلہ کن اکثریت حاصل نہیں کر سکے گی' ان کے خوابوں کے تمام محل مسمار ہوگئے۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ واحد نمائندہ جماعت کے طور پر ابھری۔ یہی حال صوبائی اسمبلیوں کے عام

www.bhutto.org

انتخابات میں ہوا۔ پیپلز پارٹی نے یہاں کے چار صوبوں میں سے بڑے صوبوں یعنی سندھ اور پنجاب میں قطعی اکثریت حاصل کرلی اور صوبہ سرحد میں کوئی بھی پارٹی فیصلہ کن اکثریت حاصل نہ کر سکی۔ وہاں سب سے زیادہ نشستیں حاصل کرنے والی جماعت نیپ اور پیپلز پارٹی کے حق میں جانے والے کل ووٹوں میں صرف چار فیصد کا فرق تھا۔ اس طرح صوبہ سرحد میں بھی پیپلز پارٹی نے نیپ کے بعد سب سے زیادہ ووٹ حاصل کئے۔ صرف بلوچستان میں کم ووٹ حاصل کئے' جہاں سرداری نظام کے باعث صرف سردار ہی انتخابات لڑتے تھے اور پیپلز پارٹی میں کوئی سردار شامل نہیں تھا۔ لیکن وہاں کے باشعور ووٹروں کی اکثریت نے بھی پیپلز پارٹی ہی کو ووٹ دیئے۔

مشرقی اور مغربی پاکستان کے انتخابات میں ایک بنیادی فرق یہ تھا کہ اس طرف تمام سیاسی پارٹیاں' بیوروکریسی اور حکومت کی مشینری پیپلز پارٹی کے خلاف سرگرم عمل تھی اور ان تمام مخالفتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اس نے یہ فیصلہ کن اکثریت حاصل کرلی تھی۔ اس کے برعکس مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے اپنے مسلح کارکنوں اور تنظیموں کے بل پر دہشت گردی کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ ایک کروڑ کے قریب ہندو ووٹروں نے منظم انداز میں عوامی لیگ کو ووٹ بھگتائے۔ انتخابات میں بھاشانی کی عدم دلچسپی کی وجہ سے قابل ذکر اپوزیشن بالکل ہی ختم ہوگئی تھی۔ بنگالی سرکاری ملازموں نے اپنے محکموں کے تمام وسائل اور اثرورسوخ عوامی لیگ کے لئے وقف کر دیئے تھے۔

چند ہفتے پہلے آنے والے تباہ کن طوفان کے انسانی مسئلے کو انتخابی مہم کا ہتھیار بنا کے جذبات بھڑکائے گئے تھے۔ ان تمام سہولتوں کے باوجود' اگر ہندو ووٹ نکال دیئے جائیں تو عوامی لیگ کے ووٹوں کا گراف کافی نیچے آجاتا تھا' حالات خواہ کچھ بھی رہے ہوں' عوامی لیگ بہرحال مشرقی پاکستان کی واحد نمائندہ جماعت بن کر سامنے آئی اور اب پاکستان کے مستقبل کا فیصلہ ان ہی دو منتخب رہنماؤں کے باہمی مذاکرات اور فیصلوں پر منحصر تھا۔ جناب بھٹو نے کامیابی کے بعد ووٹروں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ایک بار پھر عوامی مہم چلائی اور اس کے بعد مذاکرات کے لئے تیاریاں کرنے لگے۔

www.bhutto.org

بارہواں باب

مشرقی پاکستان کی علیحدگی

انتخابات کے نتائج نے جہاں مغربی پاکستان کے رجعت پسندوں اور فوجی حکمرانوں کو مایوس کیا تھا۔ وہاں عوامی لیگ کے شیخ مجیب الرحمان بھی خوش نہ تھے' ان کا اندازہ تھا کہ اس حصۂ ملک میں مختلف پارٹیاں تھوڑی تھوڑی نشستیں حاصل کر کے سامنے آئیں گی اور ان کے تمام رہنماؤں کو وہ جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان لوگوں کو وہ بڑے آرام سے شیشے میں اتار سکتے ہیں' انہیں ڈر صرف مسٹر بھٹو کا تھا وہ جانتے تھے کہ بھٹو پاکستان کے مفاد کے خلاف کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ عوامی لیگ کی اس پریشانی کا اظہار انتخابات کے فوراً ہی بعد ہو گیا' جب پاکستان پیپلز پارٹی نے عوامی لیگ کو وہاں کے عوام کی نمائندہ جماعت تسلیم کیا لیکن تاج الدین احمد نے 21 دسمبر کو ہی اپنے بیان میں یہ پرزور اعلان کیا کہ ہماری جماعت واحد اکثریتی جماعت ہے اور ہم مرکز میں حکومت بنانے کا حق رکھتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے یہاں کی شکست خوردہ جماعت کو بھی اشارہ تھا کہ اگر وہ بھٹو سے عدم تعاون کی راہ پر چلیں تو انہیں اقتدار میں حصہ دیا جا سکتا ہے۔ معاملہ اگر صرف اقتدار تک محدود ہوتا تو صورت حال مختلف ہوتی' لیکن اصل مسئلہ تو حکومت سے پہلے دستور بنانے کا تھا اور تمام صوبوں کی رضا حاصل کئے بغیر' صرف ایک صوبے کی منتخب جماعت' خواہ وہ اکثریتی صوبہ ہی کیوں نہ ہو' اپنا دستور نافذ کرنے کا حق نہیں رکھتی تھی اور پھر عوامی لیگ کے چھ نکات ملک کی سالمیت پر بھی اثرانداز ہونے والے تھے لہٰذا ان کے بارے میں کسی مفاہمت پر پہنچنا لازمی تھا۔ 3 جنوری کو شیخ مجیب نے چھ نکات کا حوالہ دیئے بغیر تمام منتخب ارکان سے بڑے جلسے میں وفاداری کے حلف اٹھوائے تھے۔ چھ نکات کے بارے میں یحییٰ خاں بھٹو کو انتخابات سے قبل یقین دلا چکے تھے کہ:۔

www.bhutto.org

"مجیب انتخابات کے بعد چھ نکات سے نیچے اترنے کو تیار ہو جائے گا۔ اس نے مجھے اس کی یقین دہانی کرا دی ہے"

لیکن جب یحییٰ خاں جنوری میں شیخ مجیب سے ملاقات کے بعد اپنی ٹیم کے ساتھ لاڑکانہ پہنچے تو ان کے تیور بدلے ہوئے تھے' وہ انتخابی دور میں کی گئی زیادتیوں پر شرمندہ دکھائی دے رہے تھے اور خلاف معمول بھٹو سے حد درجہ خلوص و یگانگت کے ساتھ مل رہے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ بھٹو سابقہ تلخیوں کو بھلا دیں اور اب ان کے ساتھ تعاون کریں۔ بھٹو نے یحییٰ خاں کو بتایا کہ مسئلہ صرف تعاون کا نہیں اصل مسئلہ یہ ہے کہ

"چھ نکات پر کس قسم کا آئین بنے گا؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستان کی سالمیت و یکجہتی کی ضمانت حاصل کی جائے"

لیکن یحییٰ خاں مجیب سے متاثر ہو کر آئے تھے۔ انہوں نے بھٹو سے پوچھا کہ آخر چھ نکات میں برائی ہی کیا ہے؟ بھٹو نے جرنیل پر واضح کیا کہ چھ نکات کا مطلب صرف مشرقی پاکستان کی خود مختاری نہیں بلکہ اس کے نتیجے میں مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو بھی وہی کچھ دے دیا جائے گا اور اس صورت میں جو کچھ سامنے آئے گا وہ ایک پاکستان نہیں بلکہ پانچ خود مختار ریاستیں ہوں گی۔ یحییٰ خاں کی سمجھ میں یہ آئینی باریکیاں تو نہ آ سکیں اس نے جواب دیا

"میں صرف ایک سپاہی ہوں' فیڈریشن اور کنفیڈریشن کے جھگڑوں کو تم طے کرو۔ میں تو ہر قیمت پر ملک کو متحد رکھوں گا"

ایسے نازک سیاسی مرحلے پر اس قسم کے شخص کا سربراہ مملکت ہونا ملک کی بدنصیبی ہی تھی۔

ہر چند عوامی لیگ نے انتخابات کے فوراً بعد جو رویہ اختیار کیا تھا' وہ باہمی مذاکرات کے لئے سود مند نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود ملک کی سالمیت اور پاکستان کے مفاد کی خاطر بھٹو خود پیش عملی کر کے 27 جنوری کو ڈھاکہ گئے۔ مگر ان مذاکرات کا نتیجہ وہی نکلا جس کا اندازہ تاج الدین کے بیانات سے پیدا کردہ ماحول کو دیکھ کر کیا جا سکتا تھا۔ مجیب الرحمٰن نے چھ نکات کو من و عن قبول کرنے پر اصرار کیا اور مذاکرات میں مزید الجھاؤ پیدا کرنے کے لئے ایسے مطالبات سامنے رکھ دیئے' جن کے مطابق تقریباً تمام کا تمام بیرونی قرضہ مغربی پاکستان کے ذمے ڈال دیا گیا۔ اس قسم کا مطالبہ اندرونی قرضوں کے بارے میں بھی تھا۔ ذمہ داریوں سے اس فرار کے ساتھ' وفاقی اخراجات کے لئے 74 فیصد کا بوجھ مغربی پاکستان پر ڈالا گیا تھا' یہی نہیں بلکہ مرکز میں بلا شرکت غیرے حکمرانی کی خواہشمند عوامی لیگ وفاقی اخراجات میں 56 فیصد آبادی والے صوبے کی طرف سے 24 فیصد کی ذمہ داری قبول کر رہی تھی' بلکہ وہ ان اخراجات کو بھی اس ہر جانے میں وضع کرنا چاہتے تھے' جو انہوں نے اپنے اعداد و شمار کی روشنی میں مغربی پاکستان کے ذمہ ڈال

www.bhutto.org

رکھا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ تمام وفاقی اخراجات مغربی پاکستان کے غریب عوام پر ڈال رہے تھے۔ مغربی پاکستان پر یہ تمام بوجھ آئینی ذمہ داری بن کر پڑنے والا تھا۔ جس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا کہ ہم 24 سال کے تمام قرضے ادا کرنے اور ایک بے اختیار مرکز کے تمام اخراجات پورے کرنے میں لگ جاتے' یہاں کے تمام ترقیاتی کام رُک جاتے اور جب ان چاروں صوبوں کا خون نچڑ جاتا تو مرکز میں حکمران جماعت اطمینان سے ہاتھ جھاڑ کے الگ ہو جاتی اور باقی پس ماندہ صوبوں کو بکھرنے کے لئے چھوڑ جاتی۔ یہ تھا وہ منصوبہ جو پاکستان کے مستقبل کے لئے عوامی لیگ کے رہنما نے مرتب کر رکھا تھا۔

بھٹو نے اس ہٹ دھرمی کو دیکھ کر تجویز پیش کی کہ آئندہ ہونے والے اجلاس کو چند ہفتوں کے لئے ملتوی کر دیا جائے تاکہ میں مغربی پاکستان کے عوام کو چھ نکات کی معقول حدیں قبول کرنے پر آمادہ کر سکوں اور ادھر تم لوگ مفاہمت کے لئے مزید سوچ بچار کر لو۔ لیکن یہ التوا مجیب الرحمٰن کے مقاصد کی تکمیل میں رکاوٹ بنتا تھا۔ وہ جلد سے جلد اپنا تیار شدہ آئین نافذ کر کے علیحدگی کو قانونی شکل دینا چاہتا تھا۔ بیرونی طاقتوں کی مدد اسے حاصل تھی۔ اس لئے وہ صرف اس امر کا خواہش مند تھا کہ ایک مرتبہ وہ آئینی پوزیشن حاصل کر لے۔ اس کے بعد اپنے سرپرستوں کی فوجی مدد کے ذریعے بھی وہ پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرا سکتا ہے' بھٹو نے مغربی پاکستان واپس آ کر یہاں کے تمام اقلیتی لیڈروں سے خود جا کر ملاقات کی' مجیب سے اپنے مذاکرات کی روشنی میں انہیں آنے والے خطرات سے آگاہ کیا' حالانکہ یہ لوگ نمائندگی کا حق نہیں رکھتے تھے۔ لیکن چونکہ ان کا تعلق بھی مغربی پاکستان سے تھا لہٰذا بھٹو نے انہیں ان عزائم سے آگاہ کیا جو مجیب مغربی پاکستان کے عوام بے پناہ اقتصادی بوجھ ڈالنے کے سلسلے میں رکھتے تھے۔ لیکن یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس طرف کے قابل ذکر رہنما شیخ مجیب سے رابطہ قائم کر کے ان کی حمایت کا فیصلہ کر چکے تھے۔

مغربی پاکستان کی رجعت پسند جماعتیں حکمران فوجی جرنیل اور شیخ مجیب سب کے سب پاکستان کے تحفظ و سالمیّت کی ضمانت چاہنے والے بھٹو کے خلاف سرگرم تھے۔ بھٹو ایک پاکستان کی حد میں رہ کر آئین سازی میں تعاون کرنے کو تیار تھے۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر مجیب الرحمان ذاتی طور پر بھی چھ نکات میں ترمیم کا وعدہ کر لیں تو وہ اجلاس میں شریک ہونے کے لئے تیار ہیں اُدھر وہ شیخ مجیب کو ہٹ دھرمی چھوڑنے پر مائل کر رہے تھے اور اِدھر مغربی پاکستان کے عوام کو ممکنہ حد تک چھ نکات تسلیم کرنے پر آمادہ کر رہے تھے۔

اب یہ بات کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ 3 مارچ کے ڈھاکہ سیشن میں عوامی لیگ کا مرتب کردہ چھ نکات پر مبنی آئین سادہ اکثریت کے بَل پر فوری طور پر منظور کر لیا جائے گا۔ اس کا طریق کار یہ مرتب کیا گیا تھا کہ مغربی پاکستان کے نمائندوں کا گھیراؤ کر لیا جائے اور انہیں اس وقت تک نہ چھوڑا جائے جب

www.bhutto.org

تک وہ عوامی لیگ کے یکطرفہ آئین پر انگوٹھا نہ لگادیں' دوسری جماعتیں' قیوم لیگ کے علاوہ' اس سازش میں شریک ہو جائیں اور یوں مشرقی پاکستان ہی میں نہیں بلکہ پانچوں صوبوں کی علیحدگی کو آئینی حیثیت دے دی جائے۔ آخر 28 فروری کو مینار پاکستان کے سائے میں دس لاکھ شہریوں کے عظیم الشان اجتماع میں خطاب کرتے ہوئے بھٹو نے تین متبادل تجاویز پیش کر دیں۔

(1) عوامی لیگ کی طرف سے چھ نکات پر مفاہمت کی کوئی یقین دہانی۔

(2) آئین سازی کے لئے 120 دنوں کی پابندی ختم کر دی جائے۔ یا

(3) آئین ساز اسمبلی کا اجلاس چند دنوں کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔

ان تینوں تجاویز میں سے کسی ایک کے تسلیم نہ ہونے کی صورت میں انہوں نے پیپلز پارٹی کی طرف سے اجلاس میں شریک نہ ہونے کا اعلان کر دیا' اس تقریر میں انہوں نے "مستقبل کے وزیر اعظم" کو دعوت دی کہ وہ اپنے اس حصہ ملک کو دیکھنے کے لئے بھی تشریف لائیں جہاں کے وہ حکمران بننے والے ہیں۔ اس نازک قومی مرحلے پر مغربی پاکستان کی اقلیتی پارٹیوں کا فرض تو یہ تھا کہ وہ بھٹو کی ان کوششوں کی تائید کرتیں جو وہ پاکستان کی سالمیت و بقا کے لئے کر رہے تھے' لیکن اس کے برعکس وہ اس آئین پر انگوٹھا لگانے کے لئے ڈھاکہ کی نشستیں بک کرانے لگے' جو درحقیقت پاکستان کی شہ رگ پر رکھا جانے والا انگوٹھا ثابت ہوتا۔ چھ نکات کو محتاط انداز میں تسلیم کرتے ہوئے' درحقیقت بھٹو شیخ مجیب کے چہرے پر پڑا وہ رسمی نقاب اتارنا چاہتے تھے' جو بار بار خود کو علیحدگی پسند قرار نہ دے کر وہ عوام کے سامنے ڈالے ہوئے تھے۔ اس وقت تک وہ مشرقی پاکستان میں بھی کھل کر علیحدگی کی کا نعرہ نہیں لگا سکتے تھے اور انہوں نے وہاں کے عوام کو صرف چھ نکات کے اقتصادی فوائد گنوا کر اپنی حمایت میں لے لیا تھا۔ یحییٰ خاں اس موقع پر بھی آڑے آئے۔ انہیں اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر مزید مہلت دی گئی تو بھٹو یا تو مجیب کو کارنر کر کے ان کے علیحدگی پسندی کے چہرے کو بے نقاب کر دیں گے اور یا پھر مجیب عوام کے خوف سے بھٹو کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھامنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ کیونکہ جہاں تک مشرقی پاکستان کے عوام کے صوبائی حقوق اور ان کے مفادات کا تعلق تھا' بھٹو ان سے متعلقہ چھ نکاتی حصے کو قبول کر چکے تھے۔ اب صرف وہ حصہ رہ گیا تھا جس کا تعلق دوسرے صوبوں پر مرکز کی اثر اندازی سے تھا۔ لہٰذا لازمی طور پر مجیب کی اپنی پارٹی کے وہ لوگ جو پاکستان کے حق میں تھے' اپنے مفادات محفوظ ہو جانے کی صورت میں مجیب پر یہ دباؤ ڈالتے اور کوئی بہتر صورت حال پیدا ہو جاتی۔ لیکن یحییٰ خاں جو اپنے اقتدار کے تحفظ کی فکر میں لگ گئے تھے۔ ان دونوں لیڈروں کے مابین ہر ممکنہ مفاہمت کو اپنے لئے خطرہ تصوّر کرنے لگے۔ انہوں نے بھٹو کے 28 فروری کے مطالبات کی آڑ لے کر اسمبلی کے اجلاس کو غیر معین مدت کے لئے ملتوی کرنے کا اشتعال انگیز فیصلہ کر دیا۔ جس کے باعث عوامی لیگ کو شدید بحران پیدا کرنے میں مدد ملی۔ بعد میں

www.bhutto.org

رجعت پسندوں اور عوامی لیگ نے دستوریہ کے اجلاس کے غیر معینہ التوا کا الزام جناب بھٹو کے سر منڈھا۔ لیکن وہ یہ بھول گئے کہ بھٹو نے اس قسم کا کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ ان کا پہلا مطالبہ عوامی لیگ کی طرف سے متحدہ پاکستان کی یقین دہانی تھا اور دوسرا 120 دن کی مقررہ حد ختم کرنے کا تھا۔ لیکن یہ مہلت جیسا کہ عرض کیا گیا یحییٰ خاں کو مختلف اندیشوں میں مبتلا کر رہی تھی' اسی طرح ان کا تیسرا مطالبہ غیر معینہ عرصے تک التوا کا نہیں صرف تین ہفتے کے التوا کا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ التوا کے اعلان کے ساتھ ہی آئندہ اجلاس کی تاریخ کا اعلان بھی کر دیا جائے۔ لیکن یحییٰ خاں نے جان بوجھ کر غیر معینہ مدت کا التوا کر کے شیخ مجیب کو عوام کے جذبات بھڑکانے کا موقع دے دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ جب بھٹو کو یہ معلوم ہوا کہ ان کے مطالبے کو بنیاد بنا کر غیر معینہ عرصے کے لئے' اجلاس ملتوی کیا گیا ہے تو انہوں نے یحییٰ خاں سے شدید احتجاج کیا۔ وہ اس سازشی اعلان کا مقصد بھانپ چکے تھے۔ یحییٰ خاں نے اس طرح مجیب الرحمٰن کو بھٹو کی طرف سے بدظن کر کے' ان میں مفاہمت کے امکان کو بھی ختم کر دیا تھا اور مشرقی پاکستان میں بلاوجہ ایک احتجاجی فضا بھی پیدا کر دی تھی۔ اس طرح بھٹو جذبات کے بھڑکتے شعلوں پر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے جس احتیاط کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے پاکستان کی بقا کی ضمانت حاصل کرنا چاہتے تھے' یحییٰ خاں کے اس اعلان نے' اس پر پانی پھیر دیا۔ بھٹو کو معلوم تھا کہ مجیب کے پیچھے کون کون سی قوتیں اپنا کھیل کھیل رہی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بے حد احتیاط سے کام لے کر' حتیٰ کہ آئین سازی کے بعد اپوزیشن لیڈر کا رول ادا کرنے پر آمادہ ہو کے' صرف یہ چاہ رہے تھے کہ آئین سازی میں ایک مرتبہ مجیب کو قابلِ عمل مرکز کی ضمانت دینے پر آمادہ کیا جائے۔ ایک مرتبہ بیرونی مداخلت کا اندیشہ ختم ہو گیا تو اس کے بعد ایک پاکستان کے اندر باہمی طور پر تمام معاملات طے کئے جا سکتے ہیں لیکن یحییٰ خاں کو صورت حال کی اس نزاکت کا کوئی احساس نہیں تھا۔

اب یہ بحث اٹھانے کا کوئی محل نہیں رہ گیا کہ تاریخ اس کے کافی شواہد بہم پہنچا چکی ہے کہ وہ ہر قیمت پر پاکستان کو تقسیم کرنے پر تلا ہوا تھا۔ لہٰذا میں اس کے عزائم کے بارے میں کوئی دلیل نہیں دوں گا۔ انتخابات کے نتائج کے بعد اصل میں تین فریق' تین مختلف مقاصد کے ساتھ برسرِ پیکار تھے۔

1 یحییٰ کا فوجی جنتا..... مغربی پاکستان کے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے تحفظ' اپنے اقتدار اور بھٹو کی انقلابی معاشی اصلاحات کے نفاذ کو روکنے کی غرض سے۔

2 شیخ مجیب الرحمٰن ہر قیمت پر علیحدگی کے لئے

3 بھٹو پاکستان کے اتحاد و سالمیت کے لئے

بعد میں جو بھی سیاسی حکمت عملیاں اختیار کی گئیں' وہ دراصل ان تین مختلف مقاصد کی تکمیل کی بدلتی ہوئی شکلیں تھیں۔ مقاصد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو پہلے دو فریقوں کے تضادات اتنے ناقابلِ حل

www.bhutto.org

نہ تھے۔ جتنے کہ تیسرے فریق کے ساتھ پہلے دونوں کے مشترکہ تضادات اور پھر الگ الگ ان کے تضادات..... آیئے پہلے فریق نمبر ایک کی کوششوں کی روشنی میں اس کے مقاصد کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

پہلے مرحلے پر اس نے انتخابات کے بعد مجیب کے ساتھ پہلی ملاقات ختم کرتے ہی اسے پاکستان کے مستقبل کا وزیراعظم قرار دے دیا تھا اور واپس لاڑکانہ آکر بھٹو کو چھ نکات کے تحت آئین سازی پر اپنی رضامندی سے آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن جواب میں بھٹو نے اپنے مؤقف کے تحت جب اس کی تائید کرنے سے انکار کیا تو اس نے اپنی حکمت عملی بدل لی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر بھٹو کی مرضی کے خلاف میں نے ایسا انتظام کیا تو وہ نہ صرف مغربی پاکستان کے عوام بلکہ 'فوج کو بھی اس سازش کے خلاف منظم کر دیں گے۔ چنانچہ اس نے دونوں کو مذاکرات کا مشورہ دے کر 'مغربی پاکستان کی شکست خوردہ پارٹیوں کو اشارہ کیا کہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے طور پر شیخ مجیب کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کر لیں' اس کے ساتھ ہی یحییٰ خاں نے درپردہ یہ کوشش بھی شروع کر دی کہ خود پیپلز پارٹی کے بعض ارکان کو ترغیب و تحریص کے ذریعے توڑا جائے۔ جس کا جواب ہمارے ساتھیوں نے کراچی میں قرآن پاک پر حلف اُٹھا کر دیا۔ مذاکرات کے دوران مغربی پاکستان کے شکست خوردہ لیڈروں سے عوامی لیگ کے چھ نکات کے حق میں بیانات دلوائے گئے اور شیخ مجیب کو فوراً اقتدار دینے کے مطالبے کرائے گئے' تاکہ وہ مذاکرات میں اپنے موقف پر سختی سے قائم رہے۔ آخر میں اس نے دونوں حصوں کی علیحدہ علیحدہ آئینی کمیٹیاں بنا کر صوبوں میں اقتدار منتقل کرنے کی تجویز قبول کی 'ان تمام اقدامات کو اگر یحییٰ کے بیان کردہ مقصد کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس حکمت عملی کا پتہ چل جاتا ہے۔ وہ ہر قیمت پر یہ چاہتا تھا کہ اگر مجیب کو علیحدہ ہونا ہی ہے تو کم از کم وہ مغربی پاکستان میں بھٹو کو ختم کرنے کے لئے ان کی مدد کر جائے تاکہ یہاں اس کا اقتدار اور سرمایہ داروں کے مفادات محفوظ رہ سکیں۔

دوسری طرف وقت مجیب کے خلاف جا رہا تھا۔ فروری کے آخر تک تو وہ یحییٰ خاں کی مدد کرنے کے لئے تیار تھا۔ لیکن مارچ میں جب قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہونے پر اسے سول نافرمانی کی کال دینی پڑی 'تو اپنے صوبے کی صورت حال اس کی گرفت سے نکل گئی۔ یحییٰ جو اپنی دانست میں اس اعلان کے ذریعے انتقال اقتدار میں بھٹو کو 'رکاوٹ ثابت کر کے' بعد میں خود مجیب اور مغربی پاکستان کے شکست خوردہ عناصر کے ساتھ مل کر اقتدار کی بندر بانٹ کے خواب دیکھ رہا تھا' اسے مجیب کی اپنی مجبوریوں کا اندازہ نہ تھا۔ لہٰذا اس کے اس اقدام نے بجائے بھٹو کے 'خود اس کے اپنے عہدے کی پوزیشن نازک کر دی۔ بائیں بازو کے منتشر عناصر جو انتخابی سیاست میں مجیب کا مقابلہ نہیں کر سکے تھے اب اس کے پھیلائے ہوئے دام کو 'الٹا کر اس پر پھینکنے کے لئے 'میدان میں نکل آئے۔ سول نافرمانی کی تحریک تیزی کے ساتھ '

www.bhutto.org

مسلح عوامی جدوجہد کی راہیں تلاش کرنے لگی۔ مجیب کو صاف دکھائی دینے لگا تھا کہ بازی اس کے ہاتھ سے نکل رہی ہے۔ اب اس کے پاس وقت نہیں رہ گیا تھا کہ وہ مغربی پاکستان کے سرپرستوں کی مدد کے لئے' اپنی سیاسی بازی بھی ہار جائے۔ اس صورت حال نے بھارت اور اس کے دوسرے سامراجی سرپرستوں کو بھی پریشان کر دیا تھا۔ بھارت کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنی سرحدوں پر مسلح عوامی جدوجہد کو تقویت حاصل کرتے دیکھے۔ اس طرح انقلاب کی لہر اس کے اپنے دروازوں پر دستک دینے لگی۔ چنانچہ ایک طرف سے اس پر بھارت دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ آئینی علیحدگی کے طویل راستے کو چھوڑ کر یکطرفہ طور پر اعلان آزادی کر کے' اس سے فوجی مدد طلب کر لے' تاکہ بائیں بازو کی اُبھرتی تحریک کو جلد از جلد کچل دیا جائے اور یا پھر فوجی حکمران ٹولے کے ساتھ کوئی ایسا سودا کر لے کہ' اس کی قوت استعمال کر کے' اُبھرتی ہوئی عوامی تحریک کچل دی جائے۔ مجیب نے پہلے دوسرے راستے کو چُنا۔ یحییٰ خاں بھی اس سودے پر آمادہ ہو گیا۔ سودا یہ تھا کہ یحییٰ خاں مشرقی پاکستان میں اقتدار مجیب کے سپرد کر کے' اسے فوجی طاقت بہم پہنچائے گا اور مجیب قومی اسمبلی کا اجلاس بلوانے کا مطالبہ چھوڑ کے' دو دستوری کمیٹیوں کی تجویز مان جائے گا اور اس طرح یحییٰ مرکز میں با اختیار رہ کے مغربی پاکستان میں بھٹو کی طاقت کو ختم کرنے کے لئے' شکست خوردہ عناصر کے تعاون کے ساتھ مغربی پاکستان کے استحصالی طبقوں کو' انقلابی اصلاحات سے محفوظ رکھے گا۔ یہ کہنا سراسر غلط ہو گا کہ مشرقی پاکستان میں فوجی طاقت کا ارتکاز' مجیب کی لاعلمی میں ہو رہا تھا۔ یحییٰ مجیب کی اس سودے بازی کی روشنی میں دیکھا جائے تو اندازہ ہو گا کہ وہاں فوجوں کا ارتکاز اس کی مرضی و منشا کے عین مطابق ہو رہا تھا۔

یہ تھی وہ سودے بازی جس میں شریک کرنے کے لئے آخری مرحلے پر بھٹو کو ڈھاکہ بُلوایا گیا۔ لیکن بھٹو اس سازش کو بھانپ گئے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ یحییٰ خاں خود بھی پاکستان کو دو ٹکڑے کرنے کی سازش میں شریک ہو چکا ہے اور اب اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ مغربی پاکستان کے عوام کی قوت کو کچلنے کے لئے' اسے مہلت مل جائے۔ اگر خدانخواستہ بھٹو اس تجویز کو مان لیتے تو میرا گمان غلط نہیں کہ پھر 25 مارچ کو فوجی کارروائی کا حکم یحییٰ خاں نہیں' شیخ مجیب الرحمٰن دیتے۔ ڈھاکہ کے ایوانِ صدر میں شیخ مجیب نے بھٹو سے علیحدگی میں ملاقات کرتے ہوئے' بظاہر جو بات یحییٰ خاں کی لاعلمی میں کی تھی' درحقیقت یحییٰ خاں کے ایماء پر کی گئی تھی' جس میں بھٹو کو فوجی طاقت کے ہاتھوں کچلے جانے کا خوف دلایا گیا تھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ بھٹو' یحییٰ مجیب کی مفاہمت میں پارٹی بن جائیں۔ اس پورے منصوبے میں بھٹو کو اصل صورت حال سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ لیکن وہ اپنی سیاسی بصیرت سے' اس منصوبے کی تہہ میں چھپی ہوئی پاکستان کی تقسیم کو دیکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ حالات اس نہج پر جا رہے تھے کہ اچانک چٹاگانگ میں بائیں بازو کے انقلابیوں نے بندرگاہ پر مسلح ہلّہ بول دیا اس سے یحییٰ اور مجیب دونوں اپنے اپنے طور پر بوکھلا

www.bhutto.org

گئے۔ ایک تو دونوں باہمی سازش میں شریک ہونے کے باوجود 'ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کر رہے تھے۔ دوسرے خارجی حالات لحہ بہ لحہ ان کے کنٹرول سے نکلتے جا رہے تھے۔ لہٰذا مجیب نے اپنے طور پر منصوبہ بنالیا کہ وہ 26 مارچ کو یک طرفہ اعلانِ آزادی کر کے 'بیرونی فوجی مدد طلب کر لے اور یحییٰ خاں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ آگے بڑھ کر بائیں بازو کی قوتوں اور انتہا پسند شاونسٹوں کو خود کچل دے اور احتیاطاً مجیب الرحمٰن کو بڑے محفوظ طریقے سے مغربی پاکستان لے آئے کہ' بعد میں بوقتِ ضرورت اس مہرے کو استعمال کر سکے۔

لیکن حالات اتنے سادہ نہیں تھے' جتنے یحییٰ خاں تصوّر کر رہا تھا۔ بھارت 65ء کی جنگ کے بعد ہی سے مشرقی پاکستان کو اپنی توجہ کا مرکز بنا چکا تھا۔ 70ء کے انتخابات کے بعد بھارتی حکومت گہری دلچسپی کے ساتھ صورتِ حال کا مطالعہ کر رہی تھی اور ہمارے داخلی معاملات میں تمام عالمی سیاسی آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے' کھلم کھلا مداخلت کر رہی تھی اور اب جبکہ مشرقی پاکستان کے حالات اس کی خواہش کے مطابق ہو چکے تھے وہ کیسے خاموش رہتی؟ اس کے بہت سے کمانڈوز مارچ کے بحران میں مشرقی پاکستان میں داخل ہو چکے تھے۔ ادھر عالمی طاقتوں کے باہمی مفادات بھی بھارت کی نظر میں تھے۔ امریکہ اور چین کے مابین تعلقات کا نیا دور شروع ہو رہا تھا۔ مشرق اوسط کی صورت حال کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کب ایسا رُخ اختیار کر لے' جب بڑی طاقتوں کو اس طرف اپنی توجہ مبذول کرنی پڑے۔ اس وقت روس پوری طرح بھارت کی پشت پناہی کر رہا تھا اور امریکہ نے گومگو کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ برطانیہ' مغربی جرمنی اور فرانس' اپنے مفادات کے تحت پاکستان کے مخالف نہ تھے' تو حق میں بھی نہیں تھے۔ یہ آئیڈیل صورت حال بار بار پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ یحییٰ خاں کی فوجی حکومت ایک اور ایسا فیکٹر تھی' جس کی جامد اور فہم و فراست سے عاری پالیسیاں اس کی مددگار ثابت ہو رہی تھیں۔ لہٰذا اس نے ایک لحہ ضائع کئے بغیر صورتِ حال کو اپنے حق میں بدلنے کی ٹھان لی۔

فوجی کارروائی سے پہلے ہی اس کے کمانڈوز' عوامی لیگ کے بھارت نواز لیڈروں کو بحفاظت نکال کر لے گئے۔ مارچ کی سول نافرمانی کے دوران جو لاکھوں بھارتی ہندو' واپس مشرقی پاکستان آئے تھے' فوجی کارروائی سے گھبرا کے سرحد پار کر گئے۔ مشرقی پاکستان کے ہندو بھی نکلے' انہی لوگوں کو بھارت نے کیمپوں میں رکھ کر عالمی مہم چلا دی۔ مکتی باہنی کا نام دے کر بنگلہ دیش کی مسلّح فورس مرتب کی جانے لگی۔ دہلی اور ماسکو کے درمیان اعلیٰ افسروں کی آمد و رفت تیز ہو گئی۔ اس کی طرف ہم بعد میں آئیں گے۔ آیئے پہلے 25 مارچ سے قبل دیکھیں کہ ڈھاکہ میں کیا واقعات رونما ہوئے؟

یحییٰ خاں فوجی کارروائی کا حکم دے کر مجرمانہ طور پر' خود واپس مغربی پاکستان چلا آیا تھا۔ بھٹو کو اس کی واپسی کی اطلاع عوامی لیگی حلقوں کی طرف سے ملی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ بھٹو اپنی آنکھوں سے فوجی

www.bhutto.org

قوّت کا نظارا کریں۔ تاکہ ان پر یحییٰ خاں کی دہشت طاری ہوجائے۔ لیکن بھٹو نے جنھوں نے انقلابات عالم کا گہرا تجزیہ کیا ہوا تھا۔ وہ اس قسم کے ظلم وتشدّد سے خوب واقف تھے اور یہی چیز تھی جس سے بچنے کے لئے بھٹو نے آخر کار مجیب اور یحییٰ کے دو کمیٹیوں والے منصوبے کو مان لیا تھا اور صرف یہ شرط رکھی کہ قومی اسمبلی آئینی طور پر' اسے تسلیم کرلے' تاکہ طاقت کا خلا پیدا نہ ہو۔ 23 مارچ کو مجیب نے یہ شرط تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اب وہ ایک پاکستان کی علامت ظاہر کرنے والی کوئی بھی تجویز تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ 24 مارچ کو یحییٰ خاں کا موڈ بھی بدل گیا تھا۔ اب دراصل دونوں جُداگانہ طور پر اپنا اپنا لائحۂ عمل طے کر چکے تھے۔ بھٹو نے اندازہ کر لیا تھا کہ یحییٰ کے عزائم کیا ہیں؟ انہوں نے عوامی لیگ کے مجوزہ اعلان آزادی سے قبل مفاہمت کی ایک کوشش پر زور دیا اور یحییٰ خاں کو بتایا کہ فوجی کارروائی اس کے بس کا روگ نہیں' اب اس کا وقت نکل چکا ہے۔ یحییٰ خاں نے غور وخوض کی مہلت مانگ کر اگلے روز جواب دینے کے لئے کہا۔ اگلے روز جواب دینے کے بجائے وہ ہوائی جہاز میں بیٹھ گیا۔ بھٹو اپنے وطن کو آتش و آہن میں لرزتے دیکھ کر واپس کراچی آرہے تھے تو' اس فلائٹ میں یحییٰ خاں کا ایک دست راست جرنیل بھی آرہا تھا۔ اس کا رویہ بھی کافی بدلا ہوا تھا۔ اس کے ذریعے بھٹو نے جنرل یحییٰ کو خبردار کیا کہ "اگر تم یہ سوچتے ہو کہ مجیب کے بعد مغربی پاکستان میں بھی یہی کچھ کر کے مجھ پر قابو پالو گے' اس فیصلے پر تمہیں پچھتانے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا"

یحییٰ خاں فوجی کارروائی کے فوری نتائج کو دیکھ کر اپنے طور پر مطمئن ہوگیا اور ملک سے باہر ہونے والی سازشوں کے جال کا اسے کوئی اندازہ نہ رہا۔ اب وہ مغربی پاکستان میں بھٹو اور ان کی پارٹی سے نبٹنے کے منصوبے تیار کرنے لگا۔ اس کے حواری جنرل پنڈی کلب کی بار میں اپنے دوستوں کو یہ نوید سنانے لگے کہ "اب دیکھنا بھٹو کا علاج کیسے ہوتا ہے۔" اپریل 1971ء تک' یحییٰ اور بھٹو کے درمیان کوئی رابطہ نہ رہا۔ اس دوران بھارت کی فوجی مداخلت زور پکڑنے لگی اور اس کی فوج کے کمانڈوز' مکتی باہنی کی وردیوں میں تخریبی کارروائیاں کرنے لگے۔ وطن پرست بھٹو نے محسوس کیا کہ احمقوں کی جنت میں بسنے والے ان چند جرنیلوں کو صورت حال کی نزاکت کا احساس دلایا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ اصل چیز اقتدار نہیں' وطن کی آزادی ہے' وہ یحییٰ خاں کے ان منصوبوں سے واقف تھے جو انہیں ختم کرنے کے لئے بنائے جارہے تھے۔ لیکن یہ موقع ذاتی عناد کا نہ تھا۔ چنانچہ وہ پیش عملی کر کے' یحییٰ خاں سے ملاقات کرنے لگے۔ اس سے قبل وہ اپنی تقریروں میں عوام کو بھی پیش آمدہ خطرے کی نشاندہی کر کے' تیار کر رہے تھے اور ساتھ ہی فوجی حکمرانوں سے کہہ رہے تھے کہ اقتدار میں مغربی پاکستان کے عوامی نمائندوں کو شامل کرلو۔ تم اکیلے حالات کو نہیں سنبھال سکو گے۔ روسی حکومت نے سفارتی سطح پر مداخلت شروع کر دی تھی لیکن یہ دیکھ کر بھٹو کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ یحییٰ خاں اپنی جگہ بالکل مطمئن بیٹھا تھا۔ انہوں نے اس عیش پسند

www.bhutto.org

کو حالات کی نزاکت کا احساس دلایا اور کہا

"اس طرح مطمئن نہ رہو' حالات تمہاری گرفت سے نکلتے جا رہے ہیں۔ ذرائع مواصلات گوریلا کارروائیوں سے تباہ ہو رہے ہیں۔ پناہ گزینوں کا مسئلہ بیرونی دنیا میں پاکستان کی ساکھ تباہ کر رہا ہے۔ آگے چل کر برسات کا موسم آ جائے گا تو ہماری فوج کو بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

بھٹو کے ان دردمندانہ اور قوم پرستانہ خیالات کے جواب میں یحییٰ خاں نے کہا..... "فوجی معاملات کو میں تم سے بہتر جانتا ہوں۔ ہاں تم یہ اقتدار میں شرکت کی کیا بات کرتے ہو؟ دوست بن کر رہو تو بہتر ہے۔ ورنہ تمہارا بھی وہی حشر کیا جا سکتا ہے جو مجیب کا ہوا۔" بھٹو نے عقل و خرد اور جذبۂ وطن پرستی سے محروم جرنیل سے مزید بات کرنا فضول جانا اور اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں قومی مفاد کے جذبے سے آیا تھا۔ تمہاری دھمکیاں سننے نہیں۔"

اور یہ کہہ کر وہ غصے میں بھرے ہوئے باہر نکل آئے۔ وہ کسی ذاتی بات پر جھگڑ کے نہیں آئے تھے۔ ان کے سامنے اس وقت قوم کے مستقبل کا سوال تھا۔

فوج میں اکثریت بھٹو کی قوم پرستی کی مدّاح تھی بھٹو کے خلاف کوئی اقدام کرنے سے قبل' فوج کی حمایت حاصل کرنا لازمی تھی۔ لہٰذا نوجوان افسروں کے اجتماعات میں باقاعدہ بھٹو کے خلاف تقریروں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا لیکن یہ تقریریں کوئی اثر نہ کر سکیں۔ کیونکہ باہر بھٹو برملا اعلان کر رہے تھے کہ ملک کے دفاع کے لئے خواہ مولانا مودودی کی حکومت سے تعاون کرنا پڑے' ہم اپنے وطن کے لئے ہر قربانی دیں گے۔ ظاہر ہے ایسے میں نوجوان افسروں پر جاہ پسند جرنیلوں کی مہم کا کیا اثر ہوتا؟

ادھر بھٹو نے اپنی تقریروں اور بیانات میں فوجی حکومت کی نا اہلی پر کھلم کھلا تنقید شروع کر دی اور شدت کے ساتھ مطالبہ کرنے لگے کہ اقتدار عوامی نمائندوں کے سپرد کر کے جلد سے جلد سیاسی عمل شروع کیا جائے۔ تاکہ بھارت کی براہ راست فوجی مداخلت کا جواز باقی نہ رہ جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد عوام کے نمائندوں کو اختیار دے کر وطن کی سالمیت کے تحفظ کا موقع دیا جائے تاکہ ایک طرف تو عوامی لیگ کے' ان نمائندگان سے رابطہ پیدا کیا جائے جو علیحدگی کے خواہش مند نہیں تھے۔ دوسری طرف بائیں بازو کے حلقوں سے رابطہ ہو اور پھر ان سب کے تعاون سے فوراً ایسی معاشی اصلاحات نافذ کی جائیں جو مشرقی پاکستان کے عام محنت کشوں کے کامل مفاد میں ہوں جو آبادی کی غالب اکثریت ہیں۔ اس طرح حالات پر قابو پانے اور بھارت میں چلے جانے والے پناہ گزینوں کی واپسی کا مسئلہ حل کرنے کے بعد پاکستان کو جنگ کے خطرے سے نکال لیا جائے۔ لیکن بدمست یحییٰ خاں اقتدار سے اس بُری طرح چپک گیا تھا کہ اسے ہر معقول بات' اپنی ذات کے لئے خطرہ محسوس ہوتی تھی۔ ادھر اس کے حواری جرنیل اور

www.bhutto.org

نوکر شاہی کے اراکین اسے یقین دلا رہے تھے کہ وہ بھٹو کے بغیر ہی حالات کو سنبھال سکتا ہے۔

ادھر جنرل ٹکا خاں نے یحییٰ خاں کے مقابلے میں بہتر صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ بھٹو نے کالعدم عوامی لیگی ارکان کے لئے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ان میں جو لوگ ایک پاکستان پر یقین رکھتے ہیں ان کی اسمبلیوں کی رکنیت برقرار رہنے کا اعلان کر دیا جائے۔ جنرل ٹکا خاں نے ایسے افراد کو تلاش کر کے' ان کا خوف و ہراس دور کیا۔ اس وقت بھی اگر مغربی پاکستان کی منتخب قیادت کو ان نمائندوں سے تعاون کر کے حکومت قائم کرنے کا موقع دیا جاتا تو' پاکستان بچ سکتا تھا۔ ایک دو مرحلوں پر یحییٰ خاں نے صورت حال سے مایوس ہو کر اقتدار عوامی قیادت کے سپرد کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ لیکن مغربی پاکستان کے سرمایہ دار اور ان کے ایجنٹ سیاست دان' درمیان میں کود پڑے۔ یہ لوگ اپنے مفادات پر پاکستان کو قربان کر رہے تھے اور یحییٰ خاں کو مشورے دے رہے تھے کہ وہ عوامی لیگ کے ان نمائندوں کو اپنے ساتھ ملا لے اور باقی حلقے خالی قرار دے کر' ان جماعتوں کے نمائندے نامزد کر دے' اس طرح وہ بھٹو کے بغیر سول حکومت قائم کر لے گا۔

یہ لوگ بھول رہے تھے کہ بدلے ہوئے حالات میں امریکہ جس سیاسی مفاہمت پر زور ڈال رہا تھا وہ شکست خوردہ اور عوام سے کٹے ہوئے لوگوں کے ذریعے نہیں حقیقی عوامی نمائندوں کے مابین تھی۔ چین کی طرف سے بھی سیاسی حل کی تجویز کا مطلب یہی تھا کہ جلد از جلد اعتماد کی حامل قیادت کو صورت حال سنبھالنے کا موقع دیا جائے۔ لیکن یہ رجعت پسند پاکستان کو بچانے کی اس آخری کوشش کو بھی خاک میں ملانے پر تلے ہوئے تھے۔ انہیں اپنی حیثیت' خارجی صورت حال' بھارت کی تیاریوں اور روس کے عزائم کا قطعاً خیال نہیں تھا۔

آخر کار یحییٰ خاں کی ان حرکات نے امریکہ اور چین کو بھی مایوس کر دیا۔ وہ جس راہ پر چل رہا تھا' اس کا انجام سوائے بھارتی فوجی جارحیت کے کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس صورت حال پر 31 جولائی کو امریکہ کے مشہور جریدے "کرسچین سائنس مانیٹر" نے اپنے خاص انداز میں لکھا۔

"ہمیں شدید افسوس کے ساتھ اس امکان کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ مفاہمت میں بہت تاخیر ہو چکی ہے۔"

خود امریکی حکومت بھی اس بدمست حکمران کی حماقتوں سے تنگ آ گئی اور چین نے بھی مایوس ہو کر بھارتی مداخلت کے خلاف اپنے بیانات کی شدّت کو کم کر دیا۔ جب کسی قوم کے حکمران خود ہی تباہی کے گڑھے میں گرنے پر تلے ہوں تو دوست اور خیر خواہ کہاں تک اس کا ساتھ دے سکتے ہیں؟ پاکستان کے گرد دشمنوں کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ بھٹو تڑپ رہے تھے کہ لحہ بہ لحہ ہماری گرفت سے نکلتے وقت کو اب بھی کسی طرح اہل ہاتھوں کے ذریعے سنبھال لیا جائے گویا بھٹو اقتدار نہیں' اپنا ڈوبتا ہوا پاکستان

www.bhutto.org

مانگ رہے تھے جسے وہ اب بھی بچا سکتے تھے۔ دشمن آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ دنیا ہمارے خلاف تھی' دوست مایوس ہو کر کنارہ کشی کر رہے تھے۔ کنسورشیم نے امداد بند کر دی تھی۔ امریکہ نے دفاعی سامان کی ترسیل روک دی تھی اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہو رہا تھا کہ وہ فوجی حکومت کی بدمستیوں کا مزید ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ ان حالات کو سنبھالنے کے لئے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر عوام کے منتخب سیاست دانوں کے میدان عمل میں آنے کی ضرورت تھی۔ اس وقت اقتدار لینا' جب کہ دنیا کو پاکستان ڈوبتا ہوا دکھائی دے رہا تھا کوئی پھولوں کی سیج نہ تھی۔ کوئی دوسرا سیاست دان ہوتا جو حالات سے بھٹو جتنا باخبر ہوتا تو وہ مایوسی کے اس مرحلے پر کبھی سامنے نہ آتا اور پاکستان کی صاف نظر آنے والی شکست کا الزام اپنے سر لینے سے گریز کرتا لیکن بھٹو نے قوم پرستی میں ان سب خطرات کو بالائے طاق رکھ کر 'اپنے آپ کو آگے کر دیا تھا۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ مخالفین نے ان کی اس جرأت رندانہ کی قدر کرنے کی بجائے' اس وقت بھی انہیں "اقتدار کے بھوکے" کا طعنہ دیا۔ قوموں نے شاید ہی اس طرح اپنے محسنوں کے ساتھ دل آزار برتاؤ کیا ہو گا۔

9 اگست کو بھارت نے روس کے ساتھ فوجی معاہدہ کر لیا۔ یہ ہماری امیدوں کے تابوت میں ایک اور کیل تھی۔ اب بھارت علیحدگی پسندوں کو یہ موقع دینے کے لئے بھی تیار نہیں تھا کہ وہ گوریلا جنگ کو طول دے کر 'اس کی حدوں پر دوسرا ویت نام بنا دیں۔ اب اس نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ یحییٰ خاں خواہ مشرقی پاکستان کے چند لوگ ڈھونڈ کے' سول حکومت ہی کیوں نہ بنا لے' وہ جلد فوجی غلبہ حاصل کر کے' مشرقی پاکستان کے کسانوں سے ہتھیار رکھا لے گا۔ مسز اندرا گاندھی نے اب سیاسی مفاہمت کی بات چھوڑ کر "آزاد بنگلہ دیش" کا سخت مؤقف اختیار کر لیا۔ یحییٰ خاں نے جواب میں مکمل جنگ کی دھمکی دی۔ اس پر بھٹو نے اس کی تردید کر دی۔ یحییٰ خاں نے اس کی وجہ پوچھی تو بھٹو نے جل کر جواب دیا۔

"اس لئے کہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم جنگ کے لئے تیار نہیں ہو۔"

ادھر تباہی اپنے پر پھیلائے قدم بہ قدم آگے بڑھ رہی تھی اور ادھر یحییٰ خاں ایک اور قدم اٹھا کے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دنیا کی آنکھیں تو کیا متاثر ہوتیں پاکستان تباہی کی طرف اور چند قدم آگے بڑھ گیا۔ اس نے ڈاکٹر مالک کو گورنر بنا کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ سول حکومت قائم ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ مشرقی پاکستان کے وہ لوگ نتھی کر دیئے جو عوام کی نفرت و حقارت کا شکار تھے۔ یہاں پھر بھٹو نے وارننگ دی۔

"فوجی حکومت نے مشرقی پاکستان میں جن اٹھاسی ارکان قومی اسمبلی کو جائز رکن قرار دیا ہے انہیں آگے لا کر حکومت سونپی جائے اور انہیں حق دیا جائے کہ وہ وزارت بنائیں اور اپنی نگرانی میں ناجائز قرار دیئے جانے والے ارکان کی نشستوں کے لئے ضمنی

www.bhutto.org

بھٹو اور افغانستان کے صدر محمد ظاہر شاہ کابل ایئرپورٹ پر گفتگو کرتے ہوئے باہر آ رہے ہیں

www.bhutto.org

انتخابات کرائیں۔"

یہ ایک پاکستان پرست کی حد درجہ مجبور آواز تھی۔ اب تو وہ اپنے لئے حکومت نہیں مانگ رہے تھے۔ اب تو وہ صرف یہ کہہ رہے تھے کہ "اب بھی ملک کو بچالو۔" لیکن اربابِ اقتدار نے یہ موقع بھی کھو دیا اور 88 ارکان اسمبلی جو پاکستان کو بچانے کے لئے تیار تھے' یحییٰ خاں کے اس اقدام سے وہ بھی مایوس ہوگئے۔ اب انہیں صاف نظر آرہا تھا کہ بنگلہ دیش بننے والا ہے اور اب ان کا مستقبل ان کی جماعت کے بھارت نواز ساتھیوں کے رحم وکرم کا محتاج ہونے والا ہے۔ ہاری ہوئی سیاسی جماعتیں تباہ ہوتے ہوئے ملک میں بھی اقتدار کا کھیل کھیل رہی تھیں. انہیں اس کے مستقبل سے کوئی واسطہ نہ تھا اور الزام بھٹو پر لگایا جارہا تھا کہ وہ اقتدار کے بھوکے ہیں۔ اقتدار کے بھوکے وہ تھے جو چند روزہ صوبائی وزارتوں کے لئے ملک کو تباہی کے دہانے کی طرف لئے جارہے تھے۔

اب پانی تیزی کے ساتھ سر سے گذر رہا تھا۔ بھارت نے براہ راست جھڑپوں کا آغاز کر دیا۔ دونوں حصوں میں عوام کے منتخب نمائندوں کی حکومت قائم ہونے کا کوئی امکان نہ رہا تھا۔ بھٹو کی ان تھک دردمندانہ اور قوم پرستانہ کوششیں رائیگاں جارہی تھیں۔ دوست مکمل طور پر مایوس ہوچکے تھے۔ تاریکی بڑھتی چلی جارہی تھی۔ اب یحییٰ خاں نے مایوسی کے عالم میں بھٹو کو یاد کیا۔ عین بستر مرگ پر پہنچنے کے بعد اسے مسیحا کی یاد آئی۔ بھٹو نے یہاں بھی قومی مفاد کو اوّلیت دی۔ یحییٰ خاں نے یقین دلایا کہ اگر وہ اب بھی کچھ بیرونی دوستوں کی سرد مہری کو گرمجوشی میں بدل سکیں تو اقتدار ان کے سپرد کر دیا جائے گا۔ اس یقین دہانی کی ضرورت اس لئے تھی کہ کوئی بھی طاقت ایسی ظالم' جابر' قاتل اور غیر قانونی آمرانہ حکومت کا ساتھ دے کر' اپنی پوزیشن ختم کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ چنانچہ بھٹو مصر' لیبیا اور فرانس کے دورے پر گئے۔ انہوں نے صدر انور السادات کو روس اور امریکہ کے ساتھ' پاکستان میں عوامی حکومت کے قیام کے بعد' کی صورت حال میں از سرنو کوئی مناسب راستہ تلاش کرنے کے امکان پر بات چیت کے لئے کہا..... یہی وہ وقت تھا جب باقاعدہ حملے سے پہلے مسز اندرا گاندھی عالمی رائے عامہ کو ہموار کرنے نکلی تھیں۔ اس وقت کے بھارت' مصر تعلقات کی روشنی میں' صدر سادات سے ملاقات کی اہمیت مزید واضح ہوجاتی ہے۔ فرانس جاکر انہوں نے پاکستان کے مؤقف کے لئے ہمدردیاں حاصل کیں۔

اس سفر سے واپسی کے بعد وہ ایک اعلیٰ اختیارات کا فوجی وفد ساتھ لے کر چین گئے یہاں انہوں نے اس مفروضے کی روشنی میں مذاکرات کئے کہ اگر پاکستان میں نمائندہ حکومت ہو اور وہ مشرقی پاکستان کے ساتھ باہمی مفاہمت کی کوشش کر رہی ہو تو اس صورت حال میں بھارتی حملے کے نتائج کا کس طرح سامنا کیا جاسکتا ہے؟ قیاس ہے کہ دونوں ملکوں کے رہنماؤں نے' حالات کے اس نازک ترین مرحلے پر بھی ایک مثبت قسم کے پروگرام پر اتفاق کر لیا تھا۔ بھٹو کو دورے پر یونہی نہیں بھیج دیا گیا تھا۔ اس سے قبل یحییٰ خاں

www.bhutto.org

اپنی سی ہر کوشش کر چکا تھا کہ وہ بھٹو کے بغیر' اقتدار باقی رکھ سکے۔ یہاں تک کہ اس نے بھارتی وزیر اعظم کو یہ پیشکش بھی کر دی کہ وہ پانچ سال کے اندر اندر مشرقی پاکستان میں علیحدگی کے سوال پر ریفرنڈم کرانے کو تیار ہے۔ جواب میں مسز گاندھی نے کسی حوصلہ افزا ردِّعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ غرض اپنی جانب سے اس نے ہر کوشش کر دیکھی تھی تب جا کر مجبوراً بھٹو کی مدد کی ضرورت پڑی تھی۔

چین میں بھٹو کافی کامیاب رہے اور واپسی پر انہوں نے مغربی پاکستان کا دورہ کر کے مضطرب اور پریشان عوام کے حوصلے بڑھانے کی کوشش کی۔

بھٹو کے دورۂ چین کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ سامراجی ملکوں کا ایک حلقہ بھی خائف ہو گیا۔ انہیں اندیشہ یہ تھا کہ اگر بھٹو نے چین کی مدد سے پاکستان کو بچا لیا تو اس خطے میں اس کا اثر و نفوذ اتنا بڑھ جائے گا کہ اس کے بعد یہاں ان کے سامراجی مفادات محفوظ نہیں رہیں گے۔ یہی فکر ملک کے اندر سرمایہ داروں کو پڑ گئی۔

اس نئے عنصر نے بھی یحییٰ خاں کو انتقالِ اقتدار کا قدم اٹھانے سے روکا' نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے آخری کوشش کے طور پر بھٹو کو راستے سے ہٹانے کی سازش بھی کی تاکہ بعد میں ان جیسی کوئی توانا سیاسی شخصیت باقی رہے اور نہ فوجی حکمرانوں کو تشویش لاحق ہو! میرا اشارہ 13 نومبر کو گلبرگ کے ڈینٹل کلینک کے پاس جناب بھٹو پر کئے جانے والے قاتلانہ حملے کی طرف ہے۔ لیکن پاکستانی عوام کی خوش نصیبی ہے کہ وہ اس حملے سے بچ نکلے۔

چین سے بھٹو کی واپسی کے بعد بھی یحییٰ خاں نمائندہ حکومت قائم نہ کر سکا اور نومبر کے آخری ہفتے میں بھٹو کو اطلاع دی گئی کہ اپوزیشن کے متحدہ محاذ کے قائد کی سربراہی میں وہ نائب وزیر اعظم بننے پر آمادہ ہو جائیں۔ انہوں نے جواب میں اختیارات کے بارے میں اپنی شرائط پر مشتمل خط یحییٰ خاں کو لکھا۔ لیکن 3 دسمبر کو بھارت کے ساتھ جنگ چھڑ گئی اور بھٹو سب کچھ بھول کر بری طرح مصیبت میں گھرے ہوئے وطن کی خدمت کے جذبے کے ساتھ یحییٰ خاں کو ملے اور 7 دسمبر کو انہوں نے نائب وزیر اعظم اور وزیر خارجہ کے عہدے کا حلف اٹھا کے اگلے ہی روز اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کے لئے رختِ سفر باندھ لیا۔

جنگ چھڑ چکی تھی مگر یہاں کا حکمران گروہ نہ تو داخلی طور پر تیار تھا اور نہ ہی اس نے عالمی محاذ پر اس بحران میں' دنیا کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کی تھی' وہ جنگ کس طرح لڑ رہے تھے؟ اور اس پورے عرصے کے دوران بھٹو اقتدار میں عوامی نمائندوں کی شمولیت پر شدّت کے ساتھ اصرار کیوں کرتے رہے؟ جب یحییٰ خاں نے بھارت کو مکمل جنگ کی دھمکی دی تو بھٹو نے اسے کیوں کہا تھا کہ "تم جنگ کے لئے تیار نہیں ہو۔" اس کی پوری تفصیل تو میجر جنرل (ریٹائرڈ) فضل مقیم کی کتاب "پاکستان میں قیادت کا بحران"

www.bhutto.org

میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ہم یہاں محض اس کے ایک اجمالی تذکرہ پر ہی اکتفا کریں گے'

مشرقی پاکستان میں فوجی اقدام کے بعد بھی حکمران فوجی گروہ نے اصل بحران کی نوعیت کو نظرانداز کرتے ہوئے' مرکزی ہائی کمان کے لئے کوئی واضح لائحۂ عمل مرتب نہیں کیا تھا' ان کی کارکردگی کا یہ عالم تھا کہ یحییٰ خاں کی ایک خصوصی محفل میں رات کو حکومت کی طرف سے دیئے جانے والے تمغوں کا ڈیزائن زیر بحث تھا اور غور اس بات پر کیا جارہا تھا کہ ڈیزائن اس طرح بنایا جائے کہ جب تمغہ یافتہ افسر رقص کررہا ہو تو تمغہ اس کی ہم رقص کے سینے پر نہ چبھے۔ جی ایچ کیو میں حالات کا جائزہ لینے کے لئے چیف آف سٹاف عبدالحمید خاں کی صدارت میں جو روزانہ میٹنگ ہوتی تھی اس میں امور خارجہ' اطلاعات اور دفاع کے سیکرٹری' ڈائریکٹر جنرل انٹر سروسز انٹیلی جنس اور ڈائریکٹر آف انٹیلی جنس بیورو شریک ہوتے۔ اس میں نیوی اور ایئرفورس کے سربراہوں کی شرکت لازمی نہ تھی۔ وہ راولپنڈی میں ہوتے تو شامل ہوجاتے۔ ان شرکاء کی فہرست ہی سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ حکومت اس بحران کو کیا اہمیت دے رہی تھی اور ان کے زیر بحث مسائل میں بھی بحران کے سیاسی حل' بھارت کی تیاریوں اور داخلی خطرات کے بجائے زیادہ تر روزمرہ کے امور پر غور کیا جاتا۔ مثلاً خوراک کی فراہمی' ٹرانسپورٹ' افسروں کے تبادلے' پریس سنسرشپ' یہی گروہ سیاست کرتا' یہی گروہ خارجہ امور کا ذمہ دار تھا اور یہی گروہ داخلی بحران کا' یحییٰ خاں ہفتے میں دوبار آتے۔ لیکن ان پر کوئی پابندی نہ تھی اور گروہ کے پاس کوئی واضح پالیسی نہ تھی کہ جس کو بنیاد بنا کر یا جسے مرکزی پالیسی تصوّر کر کے' اس کی اساس پر دوررس نتائج کے حامل فیصلے کئے جاتے۔ یہ لوگ مسائل کو یوں لے رہے تھے جیسے حالات بالکل نارمل ہیں۔ خود اس گروہ کے اجلاس کی صدارت کرنے والا جنرل حمید' با اختیار نہ تھا وہ کوئی بھی فیصلہ خود نہیں کرتا تھا۔ دوسرے روز اپنے "باس" سے مشورہ کر کے احکامات دیتا اور اگر یہ لوگ اپنے مصروف مشاغل میں متعلقہ مسئلے پر بات نہ کر سکتے تو فیصلہ کئی دنوں پر بھی ٹل جاتا تھا' نومبر تک حالات کو اسی نارمل انداز میں لیا گیا اور جب جنگ عین سر پر آگئی تو ایمرجنسی کمیٹی کے نام سے ایک اعلیٰ اختیاراتی ادارہ بنایا گیا' لیکن اس کی حدود کار بھی سول انتظامیہ کے مسائل تک محدود تھیں۔

دوسری طرف بھارت نے روس کے ساتھ اگست معاہدے کے بعد دنیا بھر کو اعتماد میں لینے کے لئے سفارتی سرگرمیاں تیز کردی تھیں۔ ایک ہی وقت میں بھارتی وزراء نے تمام قابل ذکر دارالحکومتوں کے دورے کئے۔ خود مسز گاندھی کئی ممالک کے دورے پر نکلیں لیکن ہماری طرف سے کسی قسم کی جوابی سرگرمی سامنے نہ آئی حتیٰ کہ وہ دوست ممالک جو ہماری تائید کررہے تھے' انہیں بھی یہ نہیں معلوم تھا کہ برّصغیر کے تازہ بحران میں ہماری پالیسی کیا ہے؟ ہمارے مقاصد کیا ہیں؟ اور یہاں اسلام آباد میں حکومت چلانے والوں کو خود اپنے مقاصد معلوم نہیں تھے۔ یحییٰ خاں بس ایک شام سے اگلی

www.bhutto.org

شام تک سوچ رہے تھے۔ سفارتی سطح پر یا عالمی پروپیگنڈے کے لئے کوئی منصوبہ نہ بنایا گیا۔ حالانکہ ہم جارحیت کا شکار ہو رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود' ہم یہی کوشش کر رہے تھے کہ صورت حال کو نارمل ظاہر کیا جائے۔ اس موقع پر بھی بھٹو اپنے بیانات میں بار بار خطرے کی نوعیت اور بھارتی جارحیت پر زور دے رہے تھے۔ لیکن سرکاری سطح پر ان کے بیانات سے بھی کوئی سبق نہیں لیا گیا عملاً یحییٰ خاں بھارتی کوششوں کا ساتھ دے رہا تھا اور دنیا کی نگاہیں بھارت کی جارحانہ سرگرمیوں سے ہٹ کر پناہ گزینوں کے مسئلے پر ہی مرکوز رہیں۔ بھارت نے اس کے برعکس پاکستانی فوجوں کی مداخلت کا پروپیگنڈہ شروع کر رکھا تھا۔ یحییٰ خاں اب بھی یہی تصوّر کر رہا تھا کہ بھارت جنگ نہیں کرے گا۔ حالانکہ جدید سیاسی اور جنگی فلسفے کی رو سے جنگ عملاً شروع ہو چکی تھی۔ مغربی پاکستان کے عوام کو شدید سنسر شپ کی وجہ سے بحران کی شدت کا اندازہ ہی نہیں ہونے دیا گیا۔ انہیں آخری وقت تک یہی تاثر دیا گیا کہ مشرقی پاکستان میں حالات کنٹرول میں ہیں اور صرف بھارت کی طرف سے چھوٹے پیمانے پر مداخلت ہو رہی ہے۔ جس کا مقابلہ کیا جا رہا ہے۔

اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کو بحران کے بارے میں کسی قسم کی ہدایات نہیں دی گئی تھیں' جب بھارتی حملے کی اطلاع نیویارک پہنچی تو جنرل اسمبلی کی تیسری کمیٹی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اس میں تمام اہم ممالک کے نمائندے اس خیال سے شریک ہوئے کہ پاکستان معاملہ یہاں پیش کرے گا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اب حالات یقیناً اتنے نازک ہو چکے ہیں کہ پاکستان سلامتی کونسل کا اجلاس طلب کرے گا۔ مگر پاکستانی وفد خاموش تھا۔ اسے اسلام آباد کی طرف سے حکم تھا کہ بغیر کسی ہدایت کے وہ نہ کوئی اجلاس طلب کریں اور نہ کوئی بیان دیں۔ اس موقع پر سلامتی کونسل کو بے خبر رکھ کے' پاکستان کے حق میں جو ضرر رساں صورت حال پیدا کی گئی اس کا تدارک آخری مرحلے تک نہ کیا جا سکا اور بعد میں جب مسئلہ زیر بحث آیا تو سابقہ بے حسی کے اثرات اپنا کام کر کے رہے' ہمیشہ جارحیت کے شکار ممالک پہلے اپنا معاملہ عالمی برادری میں لے کر جاتے ہیں' لیکن یہاں معاملہ برعکس تھا۔ ہم پر حملہ ہو چکا تھا' ہم نقصان اٹھا رہے تھے اور خود ہی اپنا معاملہ سلامتی کونسل میں اٹھانے سے گریز کر رہے تھے' دنیا نے ایسی مثال اس سے قبل کبھی نہ دیکھی تھی' جب جنگ چھڑ جانے کے بعد بھی کوئی ملک یو این میں جانے سے گریز کر رہا ہو تو تاثر یہی لیا جاتا ہے کہ وہ بہتر پوزیشن میں ہے اور اس کا فائدہ اٹھانے کے لئے' وہ خود گریز کر رہا ہے کہ اپنے اوپر عالمی برادری کی طرف سے کوئی پابندیاں نہ لگوائے اور آزادانہ طور پر دشمن پر برتری حاصل کر لے' بھارت اور اس کے حواری ممالک تو اصل حالات سے باخبر تھے' لہٰذا وہ پاکستان کی طرف سے اس بے عملی کو اپنے حق میں مفید جان کر خاموش تھے' مگر ہمارے ہمدرد ممالک الجھاؤ کا شکار تھے' وہ اپنے طور پر سوچ رہے تھے کہ شاید پاکستان کوئی بڑا حملہ کر کے' بہتر پوزیشن حاصل کرنے کے لئے یو این او میں آنے سے گریز کر رہا ہے' اس

www.bhutto.org

طرح اپنے ساتھ ہم نے اپنے دوستوں کو بھی سفارتی سرگرمیوں کا موقع نہ دیا کہ بھارت کی جارحیت کے خلاف عالمی رائے عامہ کو آگاہ کر سکیں' یہی سبب تھا کہ سلامتی کونسل کے اجلاس کے لئے کسی ممبر نے بھی درخواست نہ کی۔ روس اور بھارت کے ہمنوا تو چاہتے ہی تھے کہ وہ مسئلہ یہاں زیر بحث آنے سے قبل زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کر لیں اور ہمارے ہمدرد' ہماری اپنی طرف سے کسی درخواست یا تجویز کے انتظار ہی میں بیٹھے رہے' عالمی محاذ پر' بغیر کسی مقصد کے یہ مجرمانہ خاموشی ہمیں وہاں بھی پریشان کن صورت حال سے دوچار کر رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسئلہ سلامتی کونسل میں اٹھایا گیا تو اسے خاطر خواہ اہمیت نہ مل سکی تا آنکہ بھٹو نے وہاں جا کر مختصر سے وقت میں دنیا کو اصل صورت حال بتائی اور بھارت کو سوائے ایک گروپ کی مدد کے' بالکل تنہا کر دیا مگر اس وقت مشرقی پاکستان عملی طور پر ہمارے ہاتھ سے جا چکا تھا۔ اس دردناک صورت حال کا کرب بھٹو کی ان دو تقریروں میں نظر آتا ہے جو انہوں نے اقوام متحدہ میں کیں۔ لیکن اب بڑی طاقتوں کی سازش تکمیل پا چکی تھی' سلامتی کونسل کا اجلاس بلانے میں تاخیر کی جا رہی تھی۔ بھٹو کو دکھائی دے رہا تھا کہ اب یہاں ٹھہرنا بے سود ہے۔ عالمی رائے عامہ کو نظر انداز کرتے ہوئے روس کے مسلسل ویٹو اس کے عزائم کا پتہ دے رہے تھے ان دنوں بھٹو کی تقریریں ترقی پذیر ممالک کے خلاف عالمی طاقتوں کی سازشوں کو جس طرح بے نقاب کرتی ہیں' اس کی مثال اقوام متحدہ کی آج تک کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ انہوں نے نام لے کر نہ صرف ان طاقتوں کے تضادات کو نمایاں کیا بلکہ ان کے ظلم و ستم اور قول و فعل کے فرق کو بھی ننگا کر کے رکھ دیا۔ آج تک ترقی پذیر ملکوں سے تعلق رکھنے والے کسی رہنما نے اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم پر ایسی کھلی اور دلیرانہ تقریریں نہیں کی ہوں گی لیکن اب ان سے کیا حاصل تھا؟ یحییٰ خاں کا شرمناک کھیل ختم ہو چکا تھا۔

18 دسمبر کو اس نے جنگ بندی قبول کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ بھارت اس سے قبل ہی یک طرفہ طور پر جنگ بندی کا اعلان کر چکا تھا۔ یہ احمق اب بھی اپنا آئین نافذ کر کے بر سر اقتدار رہنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ لیکن باہر لوگوں کے ٹوٹے ہوئے دلوں کے ٹکڑے ان کی آنکھوں اور ہونٹوں سے شعلے بن کر نکل رہے تھے۔ پشاور میں اس کا گھر جلا دیا گیا تھا۔ راولپنڈی میں لوگ اس کا سر مانگ رہے تھے۔ ایوانِ صدر پر بڑھتی ہوئی یلغار اگر نہ روک لی جاتی تو اس کا حشر نوری السعید جیسا ہوتا۔ ان حالات میں بھٹو کو فوری طور پر واپس بلایا گیا۔ وہ 20 دسمبر کو واپس آئے تو ہزاروں عوام ایئرپورٹ سے انہیں جلوس کی شکل میں لے کر ایوان صدر پہنچے اب عوام سوائے بھٹو کے اور کسی پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اندر یحییٰ خاں درخواست کر رہا تھا کہ اسے اب بھی صدر رہنے دیا جائے۔ لیکن بھٹو نے کوئی شرط تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس طرح مجبوراً بعد از خرابیٔ بسیار اور ملک کا نصف سے زائد حصہ گنوانے کے بعد عوام کا حق عوام کو واپس مل گیا۔

www.bhutto.org

تیرہواں باب

گرداب ہی کنارہ

یہ اقتدار کیا تھا؟ جو جناب بھٹو کو دیا گیا ایک فریب زدہ، شکست خوردہ اور حوصلوں سے محروم قوم جو ملک کا نصف حصہ ہاتھ سے نکل جانے کے بعد احساس منزل تک سے محروم ہو چکی تھی، قومیں بڑے سے بڑے بحرانوں سے نکل آتی ہیں، لیکن نشان منزل دھندلا جائے تو انہیں بھٹکنے سے کوئی نہیں روک سکتا لیکن جب اس کے ساتھ فوجی شکست، اقتصادی تباہی، نوّے ہزار افراد کی دشمن کے کیمپوں میں نظر بندی، اپنے وسیع علاقوں سے محرومی کے مادی حقائق بھی منسلک ہوں تو یہ امید اور بھی معدوم ہو جاتی ہے۔ بھٹو کو یہی کام کرنا تھا نہ صرف قوم کے حوصلے بڑھانے تھے بلکہ اسے کھوئی ہوئی منزل بھی یاد دلانی تھی اور مادی تباہیوں کی تلافی کر کے دشمن کے ہاتھ میں گئے فوائد کو بھی باوقار انداز میں ختم کرنا تھا اور اقتدار حاصل کرنے کے بعد یہی وہ کارنامہ تھا جس کی انجام دہی ان کے سوا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔

زر مبادلہ کے ذخائر بالکل خالی تھے اور پامال شدہ دفاع کو ان کی شدید ضرورت تھی، قومی خزانے میں روزمرّہ کے اخراجات برداشت کرنے کی طاقت نہ تھی بھارتی فوج پاکستان کے اہم حصوں پر قابض تھی اور اس کا مزید آگے بڑھنا ہمیں مکمل تباہی سے ہمکنار کر سکتا تھا افواج اور عوام حیرت زدہ تھے کہ اب کیا ہو گا؟ عقل و شعور کام نہیں کر رہے تھے۔ بس دلوں میں یہی دعا نکلتی تھی کہ

"کاش کوئی نجات دہندہ آئے اور ہمیں اس عظیم بحران سے نکال لے"

اس نازک گھڑی میں بھٹو "مردے از غیب بدوں آید و کارے بکند" کے مصداق نجات دہندہ بن کر نمودار ہوئے تھے، جیسے کہہ رہے ہوں

"مجھے دیر ضرور ہو گئی۔ لیکن دیکھ لو میں آ گیا"

www.bhutto.org

بھٹو ہم سب سے زیادہ جانتے تھے کہ اس وقت پاکستان کی قسمت ایک نازک کچے دھاگے سے بندھی ہے وہ جانتے تھے کہ یحییٰ خان نے انہیں اقتدار نہیں بلکہ وہ ندامت منتقل کرنے کی کوشش کی ہے جو اس کی حماقتوں کے باعث بھارتی افواج کے مغربی پاکستان پر فاتحانہ انداز میں چڑھ دوڑنے اور مشرقی پاکستان پر قبضہ کرنے سے بچنا چاہتا تھا لیکن یہ بھٹو کا حوصلہ تھا کہ انہوں نے اس چیلنج کو بھی قبول کیا اور اس ندامت کو چند روز کے اندر وقار میں بدل دیا وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر بھارت نے اس موقع کو غنیمت جان کر پاکستان کے وجود پر ضرب کاری لگانے کا ارادہ کر لیا تو نہ پاکستان میں اس کی جارحیت کا مقابلہ کرنے کی تاب باقی ہے اور نہ ہی بیرونی دنیا میں کوئی ایسا ہمدرد موجود ہے جو اس آڑے وقت میں خطرہ مول لے کر ہماری مدد کو آئے صرف ایک طاقت پاکستان کو بچا سکتی تھی وہ تھے پاکستان کے غریب عوام لیکن انہیں سوائے بھٹو کے اب کسی کی ذات پر بھروسہ نہیں رہا تھا وہ کسی پر اعتبار نہیں کر سکتے تھے اپنی اس طاقت کے بل پر انہوں نے یہ ذمہ داریاں قبول کی تھیں انہیں اپنی سیاسی فراست پر بھروسہ تھا کہ وہ اس غیر منظم اور حوصلوں سے محروم قوم کو اس طرح قیادت فراہم کر سکتے ہیں کہ دشمن کی چالوں کو ناکام بنا دیں ان کے پیشرو بھارت کا مقابلہ اس لئے نہیں کر پائے تھے کہ وہ نہ تو سیاست دان تھے اور نہ ہی انہیں عوام کی تائید حاصل تھی وہ صرف اس مفروضے پر چل رہے تھے کہ ہر قسم کے فیصلے فوجوں اور اسلحہ کے ساتھ ہوتے ہیں اور میدان جنگ کی شکست بس آخری شکست ہوتی ہے جب انہیں یہ شکست ہوئی تو وہ حوصلہ ہار گئے اور اپنے ساتھ قوم کو بھی مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا مگر بھٹو اقوام کے عروج و زوال کا فیصلہ کرنے والے اٹل تاریخی قوانین کو جانتے تھے وہ عالمی امور میں وسیع تجربہ اور جدید جنگوں میں فیصلہ کن کردار ادا کرنے والے عوامل کا گہرا شعور رکھتے تھے انہیں خبر تھی کہ انسان کا جذبہ آزادی دنیا کے ہر جدید ہتھیار اور فوجی قوت سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے مادی ذرائع و وسائل کسی قوم کو غلام یا مطیع بنانے پر قادر نہیں ان کی قوم پر جو مایوسی طاری ہے وہ فوجی حکمرانوں کے طویل دور کی منطقی پیداوار ہے۔ انہوں نے چند فوجی جرنیلوں کی شکست کو عوام کی شکست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اسے ایک ایسے سماجی اور سیاسی نظام کی شکست قرار دیا جس کی بنیاد ناانصافی' بدعنوانیوں اور عوام کے استحصال پر رکھی گئی تھی انہوں نے یہ اعلان کر کے قوم کا احساس کمتری دور کیا کہ

" پاکستان کے عوام کا' اس ظالمانہ نظام حکومت کی شکست سے کوئی تعلق نہیں جس کا وجود وہ خود مٹاتے آئے ہیں "۔

ساتھ ہی انہوں نے پے در پے اصلاحات کے ذریعے اس نظام کی بیخ کنی شروع کر دی پاکستانی عوام کو اخلاقی اور نفسیاتی طور پر احساس شکست سے نکالنے کے بعد انہوں نے بھارت کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کو نئے خارجی حالات میں باوقار انداز کے ساتھ استوار کرنے کے لئے مختلف نوعیت کے بعض

www.bhutto.org

خاص بین الاقوامی رشتوں کو حرکت میں لانے کی کوشش بھی شروع کر دی تاکہ 1971ء کے گہرے زخموں کو مندمل کیا جاسکے۔

سب سے پہلے انہوں نے مسلم دنیا کے ساتھ اپنے رشتوں کو کھنگالا جنوبی ایشیا میں پاکستان کی جغرافیائی اہمیت کو نئی سیاسی جہت عطا کی اور ایک نئی توانائی کے احساس کے ساتھ ماسکو کے دورے پر گئے روس اور پاکستان کے تعلقات کافی بری طرح متاثر ہو چکے تھے لیکن بہرحال ان میں بہتری کا امکان تلاش کرنے کے لئے پاکستان کو اتنا کچھ گنوانا نہیں پڑا تھا نئی دہلی کے ساتھ مذاکرات میں یہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ نئی دہلی کے حکمران ماسکو کے رہنماؤں کی رائے کو نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے وہ تاریخ کا ایک نیا باب کھولنے کا عزم لے کر ماسکو گئے اور وہاں کے رہنماؤں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ ماضی کو تاریخی قومی امنگوں پر اثر انداز ہوئے بغیر فراموش کیا جاسکتا ہے اور ہم بھارت اور سوویت یونین کے ساتھ صاف دلی سے انصاف و برابری کی بنیادوں پر تعلقات استوار کرنے کے لئے تیار ہیں۔ بشرطیکہ بھارتی وزیر اعظم بھی اس نئی صورت حال کی شدّت کو محسوس کریں اس لئے کہ اس احساس پر ہی برّصغیر میں مستقبل کے امن کا دارومدار ہے اور ناکامی کی صورت میں کشیدگی اور محاذ آرائی ایسا رخ اختیار کر سکتی ہے جو پھیل کر بڑی طاقتوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے۔ سوویت رہنما بھارت کو اپنے اثر ورسوخ کے ذریعے اس بات پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ وہ مسلسل کشیدگی اور محاذ آرائی پر امن کو ترجیح دے یہ دونوں ملک دنیا کے غریب ترین ملک ہیں ان کے وسائل محدود ہیں اگر یہ اپنے وسائل اپنے غریب عوام کی فلاح و بہبود پر صرف کریں تو ان کے اپنے مفاد میں ہے اس کے برعکس مزید کشیدگی مزید تنگ و افلاس ہی کو پیدا کرے گی اور اصل مسائل حل کرنے کے سلسلے میں روسی اسلحہ کی بھاری امداد بھی ممد و معاون ثابت نہ ہو سکے گی بعد میں شملہ معاہدہ کے دوران پاکستان نے جو روّیہ اختیار کیا اس سے اس امر کی واضح نشاندہی ہوتی ہے کہ جناب بھٹو کا دورہ ماسکو ان دونوں ممالک کے رہنماؤں کے درمیان مثبت مفاہمت کا حامل تھا۔

وسط 1973ء میں طے پانے والا شملہ معاہدہ جس پر جناب بھٹو نے برسر اقتدار آنے کے صرف چھ ماہ بعد دستخط کئے برصغیر ہی نہیں جدید تاریخ عالم کا ایک اہم واقعہ ہے عالمی طور پر آج کے دور میں مذاکرات کی میز پر کھوئے ہوئے علاقے واپس لینے کی کوئی مثال نہیں ملتی مصر کو اپنے وسیع علاقوں میں سے تھوڑا سا علاقہ واپس لینے کے لئے ہولناک جنگ لڑنی پڑتی تھی اور اب بھی اس کے وسیع علاقے دشمن کے قبضے میں ہیں امریکہ کو اپنے جنگی قیدی واپس لینے کے لئے شمالی ویت نام جیسے چھوٹے ملک کے ساتھ اہم سودے بازی کرنی پڑی تھی برّصغیر کی تاریخ میں بھی یہ معاہدہ اپنی مثال آپ تھا اس سے قبل بھارت اور پاکستان کے مابین اہم مسائل پر دو طرفہ مذاکرات میں ایسے دور رس نتائج کی حامل مفاہمت نہیں ہوئی تھی۔ یاد رہے کہ ماضی میں جب پاکستان اور بھارت میں اثاثوں کی تقسیم کا مسئلہ پیدا ہوا تھا تو اس وقت گاندھی جی

www.bhutto.org

کو مداخلت کرنی پڑی تھی دونوں ملکوں میں نہری پانی کا تنازعہ اس وقت تک طے نہیں ہوا تھا جب تک عالمی بنک نے درمیان میں آکر مداخلت نہ کی اور متبادل انتظامات کے لئے بھاری رقوم کی امداد کا وعدہ نہ کیا۔ 1965ء کی تباہ کن جنگ کے بعد معاہدہ تاشقند ہوا لیکن یہ بھی اس وقت تک طے نہیں پایا تھا جب تک سوویت روس نے مصالحت کنندہ کا کردار ادا نہیں کیا۔ کشمیر کا تنازعہ آج تک حل طلب ہے حالانکہ 28 سال قبل دونوں ممالک اور اقوام متحدہ کے مابین استصواب رائے کے ذریعے اس مسئلے کو حل کرنے کا سمجھوتہ طے پا گیا تھا۔

دونوں ممالک کے درمیان تنازعات کے حل کے اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب دو طرفہ مذاکرات کے دوران پانچ ہزار میل مقبوضہ علاقے کی واپسی کو دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ جدید دور میں اس قسم کی کامیابی کی نظیر پوری دنیا میں نہیں ملتی جو جناب بھٹو نے شملہ میں حاصل کی تاریخ عالم میں اس سے قبل فوجی حیثیت سے کمزور اور میدان جنگ میں ہاری ہوئی کسی قوم کے رہنما نے اپنے سے بڑے اور فوجی لحاظ سے کامیاب ملک کے لیڈروں سے گفت وشنید کی میز پر وہ کچھ حاصل نہیں کیا جو بھٹو شملہ سے لے کر آئے وہ بھی اس صورت میں کہ بھارت اپنی شرائط بالجبر اور فوراً منوانے کا خواہشمند تھا یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ مسز گاندھی کو مذاکرات کے دوران جناب بھٹو کی فراست اور سیاسی ترغیب کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا جب کہ ان کے اردگرد کے تمام مشیروں نے متفقہ طور پر اپنی شرائط منوائے بغیر جناب بھٹو کو کچھ واپس دینے کی شدید مخالفت کی۔ یہ بھارتی ماہرین کی پوری ٹیم پر جناب بھٹو کی انفرادی سیاسی عظمت کی برتری تھی کہ انہیں اپنی ان تمام توقعات سے ہاتھ دھونے پڑے جو انہوں نے پاکستان کے فوجی حکمران گروہ کو شکست دے کر باندھ رکھی تھی اور جن کی خود مسز گاندھی بھی چھ ماہ تک اسیر رہی تھیں۔ جناب بھٹو نے اپنی سیاسی حکمت عملی سے اور پُراثر شخصیت کے بل پر بھارت کے رجعت پسندوں اور انتہاپسندوں کو ان کی سرزمین پر، پہلی ہی مذاکراتی صف آرائی میں شکست دے دی۔

بھارتی وزیراعظم مسز گاندھی کے ان سیاسی ماہرین نے جناب بھٹو کی سیاسی مہارت اور مدبّرانہ صلاحیتوں کے خلاف پوری قوت کے ساتھ مزاحمت کر کے جب ان کے طرز استدلال کو مجبوراً تسلیم کیا تو انہیں توقعات تھیں کہ جناب بھٹو نے ان کے ملک سے جو یک طرفہ "مراعات" چھین لی ہیں ان کی وجہ سے آگے چل کر دونوں ملکوں کے مابین جن دو طرفہ تعلقات کا آغاز ہوگا ان کے تحت پاکستان مجبوراً برّصغیر میں بھارت کے ایک چھوٹے شریک کار یا ثانوی ملک کی حیثیت اختیار کر لے گا جو اپنے خارجہ تعلقات میں محدود انتخاب کا حق ہی رکھ سکے گا اس توقع کا اظہار اس وقت کے بھارتی وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ کے اس بیان سے بھی ہوتا تھا جو انہوں نے لوک سبھا میں دیا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ

"شملہ معاہدہ ایک ایسا چوکھٹا فراہم کرتا ہے جس پر اگر صحیح طور پر عمل درآمد کیا جائے تو

www.bhutto.org

اس سے بھارت اور پاکستان کے مابین یکسر نئے تعلقات قائم ہوں گے"۔

اس بیان میں دراصل یہ توقع مضمر تھی کہ پاکستان سے اس کے مشرقی بازو کی علیحدگی کے بعد بھارت کے ساتھ مساوی حیثیت میں امور طے کرنے کے لئے اس کا استحقاق قریباً ختم کر دیا گیا ہے اور شملہ میں دی گئی مراعات ایک طرح سے ناراض فریق کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ ہے جو فرمانبرداری قبول کرنے پر مجبور ہو۔ لیکن جناب بھٹو بھارتیوں کی طرف سے پیش کردہ دوطرفہ تعلقات کی اس تفسیر و تعبیر کے پابند نہیں ہو سکتے تھے انہوں نے اپنے قومی مفادات کی روشنی میں بھارت کے اس نقطۂ نظر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ پاکستان کی طرف سے بنگلہ دیش تسلیم کرنا' شملہ معاہدہ کی کوئی غیر تحریر کردہ شرط ہے ساتھ ہی انہوں نے یہ مؤقف بھی اختیار کیا کہ بنگلہ دیش کو اس وقت تک اقوام متحدہ کی رکنیت کا اہل قرار نہ دیا جائے جب تک وہ ہمارے جنگی قیدیوں کے انسانی مسئلے کے بارے میں بین الاقوامی قوانین کے تحت معقول رویہ اختیار نہیں کر لیتا پاکستان کے ساتھ چین نے بھی جناب بھٹو کے اس مؤقف کو تسلیم کیا اس کے علاوہ انہوں نے جنگی قیدیوں کے مسئلے پر دوطرفہ تعلقات کی بھارتی تشریح کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے جنگی قیدیوں کے مسئلے کو عالمی عدالت میں بھی پیش کیا اور اس انسانی مسئلے پر عالمی رائے عامہ کو اس کا فرض یاد دلانے کے لئے کئی وفود بیرونی دوروں پر بھیجے۔

اس سے قبل برّ صغیر کے ایک خاندان ہونے کے بھارتی تصور کو رّد کرتے ہوئے جناب بھٹو ایران کے ساتھ دفاعی تعاون کا بندوبست کر چکے تھے۔ ان اقدامات سے صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنے اس وعدے کو پورا کرنے کے لئے بھرپور کوششیں کیں جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ 71 کی جنگ کے نتائج کو ختم کرنے کے لئے وہ اپنے ملک کی بالادستی کو رہن نہیں رکھیں گے انہوں نے انتہائی نامساعد حالات اور داخلی طور پر از حد کٹھن مسائل کا مقابلہ کرنے کے باوجود اپنا یہ وعدہ حیرت انگیز طور پر پورا کر دکھایا۔

بھارت کی طرف سے الزام عائد کیا جاتا ہے کہ جناب بھٹو اپنے ان اقدامات کے ذریعے بیرونی اثرات کو برّ صغیر کی سیاست میں اہم کردار ادا کرنے کی اجازت دے رہے ہیں اور یوں دوطرفہ تعلقات کے اصول کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے ہیں یہ بھارت کی دیرینہ چال رہی ہے کہ پاکستان کے ساتھ تنازعات کو حل کرنے کی راہ کو کچھ اس طرح مسدود کیا جائے کہ بالآخر پاکستان خسارے میں رہے اس چال کے تحت کوشش یہ کی جاتی ہے کہ دوطرفہ تعلقات کو واحد طریقِ کار تسلیم کرایا جائے اور جب اس کے تحت مذاکرات ہوں تو کوئی منصفانہ حل قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے آج تک پاکستان کے کسی مدبّر نے بھارت کے اس استدلال کا مسکت جواب نہیں دیا تھا۔ جناب بھٹو نے بھارتیوں کو بتا دیا کہ معقولیت پسند افراد کے نزدیک دوطرفہ تعلقات کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ بھارتی اخبار نویس خشونت سنگھ کی طرف سے جنگی قیدیوں کے مسئلے کو عالمی عدالت میں لے جانے کے سوال پر ان کے اس اعتراض کے

www.bhutto.org

جواب میں کہ

"کیا اس سے دوطرفہ تعلقات کے اصول کی خلاف ورزی نہیں ہوتی؟"

جناب بھٹو نے کہا تھا۔

"دوطرفہ خارجہ پالیسی کے یہ معنی نہیں کہ اس سے بین الاقوامی تنازعات طے کرنے کے دوسرے طریقے مستقلاً اور ہمیشہ کے لئے نظر انداز کر دیئے جائیں پہلے تو ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے جھگڑوں کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر اس میں ہمیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مسئلہ ختم ہو چکا ہے اور اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر باہمی گفتگو میں ہم ناکام ہو جائیں تو پھر اور مقامات ہیں' مثلاً اقوام متحدہ جہاں ہم اپنے مسائل حل کر سکتے ہیں ہم نے یہ تو نہیں کہا کہ ہم اس کی رکنیت چھوڑ چکے ہیں۔ آئی سی اے او ہے' اور ہم نے یہ بھی نہیں کہا کہ ہم اس کی بھی رکنیت چھوڑ چکے ہیں۔ بھارت دوطرفہ تعلقات کے لغوی معنی پر بہت زور دے رہا ہے کیوں کہ اس کا یہ خیال ہے کہ دوطرفہ بات چیت کے ساتھ چپک کر رہ جانے سے ہم بقیہ سب اطراف سے آنکھیں بند کر چکے ہیں جب پاکستان نے باہمی تعاون کے معاہدے کے تحت امریکہ سے اسلحہ درآمد کیا تو پنڈت نہرو نے کشمیر کے مسئلے پر بات چیت کا دروازہ بند کر دیا کیونکہ ان کا یہ خیال تھا کہ پاکستان امریکہ سے تعلقات استوار کرنے کے بعد بھارت سے اپنے تعلقات کو الوداع کہہ چکا ہے اس ربع صدی کے دوران پاکستان نے جائز طور پر بیرونی امداد (بشمول اقوام متحدہ) حاصل کرنے کے سلسلے میں اپنا آزادانہ حق استعمال کرنے کی جو کوشش کی اس پر بھارت نے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا"۔

بھارت کی دوطرفہ تعلقات کی تشریح کو مدلل انداز میں رد کرتے ہوئے جناب بھٹو ہی نے پہلی مرتبہ یہ مؤقف اختیار کیا کہ جہاں ہم کسی بھی پڑوسی ملک کے ساتھ دوطرفہ تعلقات کی بات کرتے ہیں وہاں ہم اپنے ان حقوق کو ترک نہیں کرتے جو اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق ہمیں حاصل ہیں اور نہ ہی ہم ان عالمی اداروں کی طرف سے حاصل ہونے والے ان حقوق کو چھوڑ دیتے ہیں جو ان اداروں کے ضوابط کے تحت ہر قوم کو حاصل ہیں۔ دوطرفہ تعلقات کی یہ مدبرانہ تشریح بھارت کے مقابلے میں عالمی رائے کو بہتر انداز میں متاثر کرتی ہے چنانچہ نہ صرف ہم بھارت اور بنگلہ دیش کی تمام شرائط کو رد کرنے کے باوجود چین اور عالمی رائے عامہ کے بھرپور تعاون کے باعث جنگی قیدیوں کو واپس لانے میں کامیاب ہوئے بلکہ آگے چل کر آبرومندانہ طریقے پر بھارت کے ساتھ مسئلہ کشمیر پر اپنے مؤقف پر پوری طرح قائم رہتے ہوئے بہتر

www.bhutto.org

تعلقات کی طرف بھی گامزن رہے۔

ابھی شملہ معاہدے کی روشنائی بھی خشک نہ ہو پائی تھی کہ بھارتیوں نے بھٹو کے خلاف یہ مہم شروع کر دی کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے' وہ بنگلہ دیش تسلیم نہ کر کے شملہ معاہدے کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ ٹھیک اسی وقت ملک کے اندر مخالفین نے اس مہم کا آغاز کر دیا کہ شملہ مذاکرات کے دوران بھٹو نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا عہد کر کے پاکستانی عوام کے ساتھ مبینہ غدّاری کی ہے یہ دونوں مہمات اپنے کھلے تضادات کی روشنی میں حد درجہ ظالمانہ تھیں واقعہ صرف اتنا تھا کہ جناب بھٹو نے شملہ میں ایک ڈنر کے دوران بنگلہ دیش کے مسئلہ پر ایک غیر رسمی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میرا ذہن اس پر مائل ہو رہا ہے کہ اس مسئلے کو مستقبل قریب میں قومی اسمبلی میں اٹھایا جائے۔" اس فقرے میں نہ تو وعدہ تھا اور نہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی ذمہ داری لیکن مخالفین کیسی خام بنیادوں پر اعتراضات کے محل استوار کرتے اور پھر خود ہی ان پر پتھر پھینکتے ہیں اس کا اندازہ اس چھوٹی سی مثال سے کیا جا سکتا ہے۔

شملہ معاہدے کے نتیجے میں مغربی پاکستان کا مقبوضہ علاقہ خالی ہو گیا لیکن ابھی جنگی قیدیوں کا مسئلہ باقی تھا بھارتی یہ چاہتے تھے کہ پاکستان پہلے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لے تاکہ ڈھاکہ کی سابقہ حکومت کے حکام کو ان پر جنگی جرائم کے تحت مقدمات قائم کر کے انتقامی کارروائیاں کرنے کا حق مل جائے اور کشمیر میں پاکستان اپنے مفادات سے دستبردار ہو جائے مگر بھٹو سخت محنت' ڈپلومیسی اور سیاسی مہارت سے کام لے کر بھارت کو یہ ترغیب دینے میں کامیاب ہو گئے کہ جنگی قیدیوں کی واپسی کے مسئلے کو بنگلہ دیش کے تسلیم کرنے سے الگ تھلگ رکھا جائے اس کے علاوہ انہوں نے بھارت کو یہ مؤقف بدلنے پر بھی مجبور کر لیا کہ وہ 195 جنگی قیدیوں کو جنگی جرائم کے الزام میں مقدمات چلانے کے لئے بنگلہ دیش کے حوالے کر دے گا یہ ایک کارنامہ تھا کہ پاکستان کے تمام جنگی قیدی بھی واپس آ گئے اور بھٹو نے ان کے عوض بھارت کی کوئی شرط بھی قبول نہ کی۔

پاک بھارت تعلقات کے اس پس منظر میں یہاں جناب بھٹو کی شخصیت کے ایک مدبّرانہ رخ کی طرف اشارہ کرنا غیر موزوں نہ ہو گا ان کے بیشتر سوانح نگاروں نے برّصغیر کے معاملات پر مختلف ادوار کی پالیسوں کے باب میں اکثر یہی کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ "وہ خارجی حالات کے تحت کام کرتے تھے۔" لیکن یہ رائے پوری حقیقت نہیں بلکہ حقیقت کا جزوی حصّہ ہے۔ درحقیقت بھٹو ایسی عہد ساز اور عملی سیاست میں قائدانہ کردار ادا کرنے والی شخصیت کو پرکھنے کے لئے جدید سیاسی سائنس کا اطلاق مہارت کے ساتھ کرنا ضروری ہے۔ مدبر سیاستدان (اسٹیٹسمین) اپنے سیاسی عمل کو تین حصّوں میں تقسیم کر لیا کرتے ہیں۔ (1) مقاصد (2) حکمت عملی اور (3) روزمرّہ کے حربے۔ مقاصد جو اقوام کی تاریخی اور تہذیبی امنگوں اور مستقبل کے خوابوں سے مل کر ترتیب پاتے ہیں وہ ناقابل تغیّر ہوتے ہیں جس کی سادہ سی مثال

www.bhutto.org

روس کے زار حکمرانوں سے لے کر آج کے ترقی پسند حکمرانوں تک' زمانہ اور قیادت بدل جانے کے باوجود اس کے قومی خوابوں کی یکسانیت میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ حکمتِ عملی ان خوابوں کی تعبیر کا وہ سیاسی تصوّر ہوتا ہے جو خارجی حالات کے تحت اپنے اندر لچک' جُھکاؤ اور پھیلاؤ پیدا کرنے کا اہل ہو اور روزمرہ کے حربے کشمکش کے دوران اچانک ہونے والے داؤ کے جواب میں یا خود داؤ لگانے کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں۔ سیاسی عمل کے ان تین مختلف درجہ وار اعمال کو ایک دوسرے کی جگہ رکھ کر دیکھنے سے یا انہیں آپس میں گڈمڈ کر کے پرکھنے سے کسی بڑے سیاستدان کے اقدامات کا محاکمہ نہیں کیا جاسکتا۔ بھٹو کی سیاست کو سمجھنے کے لئے اس سائنسی انداز کا تجزیہ ہی رہنمائی کر سکتا ہے جب یہ کہا جاتا ہے کہ "بھٹو خارجی حالات کے تابع رہ کر کام کرتے تھے" تو دراصل ہم کہہ رہے ہوتے ہیں کہ وہ خارجی حالات کے تحت اپنی حکمت عملی اور حربے بدل لیا کرتے تھے جو جہد للبقار کے اصول کے تحت لازمی ہے لیکن یہ کہتے وقت ہمارا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ وہ خارجی حالات کے تحت مقاصد کو بھی بدل لیتے تھے اس روشنی میں آپ ان کی سیاسی زندگی کا مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ زمانہ طالب علمی سے لے کر تادمِ مرگ ان کے مقاصد میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ البتہ حکمت عملی اور حربوں کی لچک میں وہ اتنے تیز اور برق رفتار تھے کہ بعض اوقات وقت کی رفتار کا ساتھ نہ دے سکنے والے اچھے بھلے دانشور ان پر پہلو بدلنے' یا خیالات بدل جانے کا الزام عائد کر دیتے ہیں' لیکن ظاہر ہے ریل گاڑی کے زمانے کے سیاسی معیاروں کے تحت سیاست کرنے والے لوگوں کے بے معنی اطمینان کی خاطر سپرسانک کے زمانے کا یہ سیاستدان اپنی رفتار کو کم کر کے بھاگتے لمحوں کی باگیں اپنے ہاتھ سے کیوں چھوڑتا؟۔

اس وضاحتی اشارے کے بعد ہم پھر اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔ 1947ء میں آزادی کے بعد پاکستان کا سب سے اہم اور سرفہرست مسئلہ یہ رہا ہے کہ وہ اپنے تحفظ و دفاع کا کم از کم اتنا انتظام ضرور کر سکے جس کے تحت ہندو قوم اپنی دیرینہ تمناؤں کے مطابق اس خطّے کو بزورِ شمشیر مہابھارت کا حصّہ نہ بنا سکے۔ مشرقی پاکستان پر جارحیت کر کے پاکستان کو دولخت کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ اسے فوجی دباؤ کے خلاف اپنے آپ کو برقرار رکھنے کا عزم پورا نہ کر سکے۔ بھارت کے اس اقدام میں یہ خواہش بھی مضمر تھی کہ ہم برِ صغیر کے خاندان کے ایک رکن کی حیثیت حاصل کر لیں اور ہمیشہ اپنی پوزیشن کی کمزوری کا احساس کر کے بھارت سے شفقت کے طلب گار رہیں لیکن جناب بھٹو نے پاکستان کو جغرافیائی محدودیت کے احساس میں مبتلا کرنے کے خواہش مند بھارتی لیڈروں کو یہ ثابت کر کے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا کہ بھارت کو پاکستان کے پچھواڑے کا درجہ حاصل ہے انہوں نے بھارتی تصوّرات کے پیچھے پوشیدہ زہرناکی کو محسوس کر کے ابتدا ہی میں اپنا رخ مشرق اوسط کی تیل پیدا کرنے والی مالدار اور عالمی اہمیت کی حامل مسلم ریاستوں کی طرف کر لیا تاکہ مشترکہ تحفظ اور اقتصادی تعاون میں اضافے کے لئے ان سے قریبی تعلقات استوار کئے

www.bhutto.org

جاسکیں اِس طرح انہوں نے ثابت کر دیا کہ بھٹو کا نیا پاکستان وہ نہیں جس کی امید بھارتی لیڈر اس کا ایک بازو کاٹنے کے بعد لگائے بیٹھے تھے۔

اس پیش رفت نے بھارتی لیڈروں میں شدید بے چینی پیدا کر دی اِس لئے کہ انہوں نے مشرقی پاکستان میں اپنے بھوکے عوام کے مسائل نظرانداز کر کے جو انتہائی گراں قیمت معرکہ انجام دیا تھا وہ بے سود اور بے نتیجہ ثابت ہوا اس طرح بھٹو نے بھارتی رہنماؤں کو شدید دھچکا پہنچایا جنہیں فرمانبرداری اور اطاعت شعاری کی توقعات میں سخت مایوسی ہوئی۔ ادھر پاکستان کی جغرافیائی حیثیت بھارت اور شرق اوسط کے درمیان ایک وسیع "بفر" کی سی تھی اس حیثیت میں اسے یہ حق انتخاب حاصل تھا کہ وہ جس رُخ چاہے اپنا وزن ڈال دے۔ یہ جناب بھٹو کی عظیم سیاسی فراست اور تدبّر کا شاہکار ہے کہ انہوں نے بھارت کی طرف سے کوئی مزید مخاصمت مول لئے بغیر پاکستان کے شرق اوسط کے ساتھ قدیم و فطری لیکن ناپختہ روابط اور رشتوں کو پختہ استوار کر لیا اس طرح انہوں نے اپنی جغرافیائی قوتوں سے بے خبر پاکستان کو ایک ایسی دیو پیکر طاقت میں تبدیل کر دیا جو شرق اوسط کے تحفظ کا ضامن ہے اس سے پہلے ہم میں خود اعتمادی اور اپنے وسائل کو روبہ عمل لانے میں تخلیقی صلاحیتوں کا فقدان تھا جس کی وجہ سے ہمارا ملک مختلف بیرونی طاقتوں کی للچاتی ہوئی نگاہوں کے لئے لقمۂ تر ثابت ہو رہا تھا لیکن جناب بھٹو نے اپنے طریق عمل سے تاریخ کے دھارے کو نیا رخ دے دیا۔

جو شخص بھی جناب بھٹو کے افکار، خارجہ پالیسی اور اس کے نتائج کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے بجا طور پر یہ مقولہ یاد آتا ہے کہ

> "اگر چھوٹی اقوام کے معاملات کو صحیح طور پر طے کیا جائے تو وہ طاقت کا سرچشمہ ثابت ہو سکتی ہیں اور ایسی صورت میں بڑی طاقتیں نہ تو انہیں اپنا غلام و محکوم بنا سکتی ہیں اور نہ انہیں اپنے احاطہ اثر میں شامل کر سکتی ہیں۔"

اس مقولے کی واضح تصویر جناب بھٹو کا پاکستان کی خارجہ پالیسی کو مہارت اور چابک دستی سے نئے حالات کے تحت چلانا ہے اِن کے پیش رو اپنے مذاکرات و معاملات میں اس لئے ناکام رہے کہ وہ پاکستان کی کمزوری کے احساس و واہمے میں مبتلا رہتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ "یہ کمزوری" پاکستان کی جغرافیائی پوزیشن اور اس کی داخلی ہچکچاہٹ میں مضمر ہے ان کے پیش رو قومی تحفظ کی مقصدی ضروریات کو شاید اچھی طرح سمجھتے ہوں لیکن وہ تاریخ کے دھاروں کی جدّلیاتی قوت محرّکہ اور اس کی پیش بینی کے فقدان کے باعث جاندار اور متحرک حکمت عملی مرتب کرنے سے قاصر تھے وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کے ملک کے تحفظ کی ضروریات اس کے جغرافیائی محل وقوع اور داخلی ساخت کے متضاد تھیں۔ اس لئے وہ ناکافی مادی وسائل کے احساس میں مبتلا ہو کر، جمود کا شکار ہو جاتے اور یہ سوچ کر مایوس ہو جاتے کہ پاکستان کو معقول و

www.bhutto.org

مناسب دفاعی ضروریات فراہم کرنے میں کامیابی ممکن نہیں اور پھر اپنی سوچوں کی فراہم کردہ اس مایوس کن صورتحال پر راضی بہ رضا ہو جاتے یا پھر خوفناک حد تک غیر متوقع نتائج کی حامل مہمات میں اُلجھ جاتے۔ جناب بھٹو نے تاریخی محرکات اور جدید ڈپلومیسی کا پوری چھان بین اور دقتِ نظر سے تجزیہ کیا وہ اس واضح نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ نئے پاکستان کی تعمیر کے لئے سیاست کاری کے فرسودہ 'پیش پا افتادہ اور ناقابلِ عمل طریقِ کار سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے انہوں نے مشرقی بازو کی علیحدگی کے بعد یہ معلوم کیا کہ اب پاکستان کو صرف ایک سے نہیں بلکہ تین علاقوں سے تعلق رکھنا ہے حالانکہ ماضی میں اس وسیع علاقے کی قوتِ امتیاز کے احساس سے محروم سیاستدان اسے صرف ایک علاقہ قرار دے کر اس تنگ نظر کے مطابق معاملات کو دیکھتے رہے اس میں ایک خطہ تو بھارت 'بنگلہ دیش اور ان کی سرحدوں پر واقع چھوٹی اقوام پر مشتمل تھا دوسرا شرقِ اوسط کا مشرقی علاقہ یا خلیج فارس کا خطہ اور تیسرا عرب سوشلسٹ ریاستوں پر مشتمل تھا جو نہر سویز کے دونوں اطراف میں واقع تھیں ان علاقوں کے افریشیائی مسائل 'عرب اسرائیل تنازعے اور بین العلاقائی تعاون کے بارے میں مختلف درجات مگر ایک ہی نوعیت کا تاثر تھا۔ (سارے علاقے کو ایک واحدہ تصور کرتے ہوئے) مگر ذاتی تحفظ اور بڑی طاقتوں کے باہمی مفادات کے تصادم کے بارے میں ان میں وسیع پیمانے پر اختلاف تھا۔

جناب بھٹو نے یہ بھی محسوس کیا کہ شرقِ اوسط کے غیر عرب ملک اپنی اپنی سیاسی تاریخ' معاشرتی ڈھانچے اور جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے ان تمام مسائل کے بارے میں مختلف نظریہ اور نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں کسی بھی مدبر سیاست دان کی پہچان یہ ہے کہ وہ قوتوں کے صحیح تضادات اور ان کے تعلق کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور پھر ان تضادات و تعلقات کی باہمی آویزشوں اور آمیزشوں کو اپنے حق میں حل کرتے ہوئے اپنے مقاصد کی تکمیل کرے۔ بحیرۂ روم سے خلیج بنگال تک پھیلے ہوئے اس وسیع علاقے میں واقع ممالک کے نقطہ ہائے نظر اور مفادات کے بارے میں جناب بھٹو کے مطالعہ و تجزیۂ تاریخ نے انہیں اپنی مدبرانہ صلاحیتوں کے ماہرانہ مظاہرے کی اہلیت بخشی اور انہوں نے دور تک پھیلے ہوئے ٹکڑوں کو چن چن کر ایک نیا پیکر تراشنا شروع کر دیا اس طرح مختلف جہتوں میں اپنی پے در پے مساعی کے باعث انہوں نے بھارت کی طرف سے پاکستان کے لئے تیار کئے جانے والے گرداب کو کمال چابکدستی سے کنارے میں بدل دیا۔

www.bhutto.org

چودھواں باب

داخلی محاذ

انگریزی کے مشہور نثر نگار ویریئر ایلون Verrier Elvin کی تحریر سے بھوک کی شدّت کا اظہار کرنے والا ایک اقتباس جو بھٹو نے اوائل عمر میں پڑھا تھا۔ آج تک ان کے ذہن پر نقش ہے۔ گو انہوں نے خود بھوک کبھی نہیں دیکھی۔ لیکن ایک حساس اور دردمند انسان کے لئے کسی چیز کا ذاتی تجربہ ہی لازمی نہیں ہوتا۔ اس کا دل تو پوری انسانیت کے سینے میں دھڑکتا ہے اور جہاں بھی انسانیت کو کوئی دکھ پہنچے تو وہ تڑپ اٹھتا ہے۔ یہی کرب بھٹو کی سیاست کی بنیاد تھا۔ وہ محض اقتدار کا لطف اٹھانے کے لئے سیاست میں نہیں آئے تھے ان کے سامنے ایک عظیم مشن تھا۔ دُکھی اور زخموں سے سسکتی انسانیت کو راحت اور سکون پہنچانے کا مشن ہی انہیں دن رات متحرک اور سرگرم رکھتا تھا۔ وہ پاکستان کے گوشے گوشے میں گھومے' انہوں نے اپنے محنت کش عوام کے امیدوں بھرے زرد چہروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کے دکھ درد کو ان کی صفوں میں بیٹھ کر محسوس کیا۔ وہ ہمیشہ ان امیدوں اور توقعات کو یاد کرتے جو لوگوں نے انہیں ووٹ دیتے وقت باندھی تھیں۔ یہ امیدیں خود بھٹو نے پیدا کی تھیں' ان کے مایوس دلوں میں زندگی کی اُمنگ بھٹو نے روشن کی تھی' وہ اپنا پیغام خود لے کر ان کے دروازوں تک پہنچے تھے اور یہی وجہ ہے کہ غریب عوام ان پر بھروسہ کرتے تھے ان کے دور اقتدار میں انہیں کسی بحران کا سامنا کرنا پڑا' تو انہی غریب اور مفلس لوگوں نے ان کو تقویت پہنچائی۔ وہ بہتر مستقبل کی خواہش مند نسل کا آئیڈیل تھے۔ ان کے وجود میں اسے جرأت اور انتھک محنت کی وہ جھلک نظر آئی جو ان کی عمر کا خاصہ ہے۔ وہ پرانی نسل کے بھی ہیرو تھے' جو اپنے عظیم ماضی سے گہری وابستگی رکھتی ہے۔ اپنے دور اقتدار میں انہوں نے اسلام کی بے مثال خدمت کر کے پرانی نسل اور خواتین سے ایک ایمان افروز اور کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ

www.bhutto.org

استوار کر لیا تھا' انہوں نے جدید تصوّرات اور اسلام کی انقلابی روح کو ہم آہنگ کر کے' اپنے آپ کو ایسی حیثیت دے لی تھی کہ وہ جانے والے دور اور آنے والے زمانے کے مابین ایک پل کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ ایسا پل جس پر گزر کے غریب اور پس ماندہ قوم ترقی و خوشحالی کی نئی منزل تک پہنچ سکے اور اس منزل کی طرف اپنے سفر کا آغاز بھٹو نے اقتدار سنبھالتے ہی شروع کر دیا تھا۔

میں ان اقتصادی اور سماجی اصلاحات کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا جو انہوں نے حیرت انگیز برق رفتاری کے ساتھ نافذ کیں' ان کی تفصیلات آپ اس دور کے اخبارات کے ایڈیشنوں میں پڑھتے رہے ہیں' ان کے اثرات آپ روز مرّہ کی زندگی میں محسوس کرتے رہے ہیں میں ان نتائج کی طرف اشارہ کروں گا جو ان اصلاحات کی وجہ سے سامنے آئے۔ ہر چند بین الاقوامی کساد بازاری تباہ کن سیلابوں' زلزلوں اور حادثوں نے ان اصلاحات کا پھل پوری طرح عوام تک نہیں پہنچنے دیا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کے عوام ان مشکلات کے باوجود بھٹو کے دور میں برّصغیر کے دوسرے ملکوں کے عوام کے مقابلے میں بہتر زندگی گزارتے رہے۔ تاریخ کے غیر محسوس دھارے کو شعور کی آنکھ سے دیکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ انقلاب راتوں رات برپا نہیں ہوتا۔ انقلاب کسی معاشرے کے نچلی حالت سے بلند حالت کی طرف سفر کے آغاز کا نام ہے۔ یہ سفر بڑا طویل اور کٹھن سفر ہوتا ہے۔ بھٹو نے پاکستان میں اس سفر کا آغاز کر دیا تھا اور اس معاشرے میں انقلابی سفر کی نیو رکھ دی تھی' جس کی خارجہ حالت ابھی اس کے لئے تیار نہ تھی' یہ نہ بھولنا چاہئے کہ رہنما کے رول کا انحصار عوام کی سرگرمی پر ہوتا ہے۔ عوام جتنے سرگرم ہوں گے رہنما اسی تناسب سے انقلاب کے عمل' یعنی نچلی حالت سے بلند حالت کی طرف سفر کے عمل کو تیز کر دے گا۔ اگر یہ تناسب ٹوٹ جائے تو انقلاب ناکام ہو جاتا ہے۔ رہنما عوام کی سرگرمی کی "کمیّت" سے آگے بڑھ کر قدم اٹھائے گا تو یہ مہم جوئی کا راستہ بن جائے گا اور پھر لاطینی امریکہ کی طرح وہ ایک دردناک انجام پر منتج ہو گا۔ اس کے برعکس اگر صحیح انقلابی قیادت کے بغیر عوام زیادہ سرگرم ہو جائیں تو' انہیں مشرقی پاکستان کے عوام کی طرح انقلاب کی راہ سے گمراہ کر کے تباہی کی طرف لے جایا جا سکتا ہے۔

حاصل بحث یہ ہے کہ انقلاب کی خارجی حالت' یعنی عوام کی مشکلات اور انہیں حل کرنے کی خواہش میں سرگرمی اور داخلی حالت یعنی قیادت کی اس خارجی حالت کو صحیح طور پر سمجھتے ہوئے تخلیقی اقدام میں ہم آہنگی اور توازن ضروری ہے' پاکستان کے حالات میں انقلابی تبدیلی کا عمل ان کے دور میں شروع ہی ہوا تھا' ضرورت اس بات کی تھی کہ آگے بڑھنے سے قبل پچھلی تبدیلیوں کو مستحکم کیا جاتا مگر ان کے استحکام کے لئے اجتماعی شعور اور کوشش کی ضرورت ہے۔ میری کتاب "اندازِ بیان" کے دیباچہ میں بھٹو نے پہلا فقرہ یہ لکھا تھا۔

"پاکستان انفرادیت پسندوں کی قوم ہے۔"

www.bhutto.org

اس فقرے میں قوم کی صحیح حالت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی اجتماعی شعور کے لحاظ سے جتنا کم ترقی یافتہ ہوتا ہے' وہ اتنا ہی فرد ہوتا ہے' شخصیت نہیں ہوتا۔ ہر چند کہ شخصیت بھی ایک واحد انسانی ہستی ہے۔ لیکن ہر آدمی شخصیت نہیں کہلا سکتا۔ فرد اتنی ہی شخصیت بنتا ہے' جس قدر وہ معاشرے کے اجتماعی شعور کے ثمرات اور سائنس و فنون کی فضیلتوں کو اپنے وجود میں جذب کرتا ہے اور سرگرمی کا بیل بننے کے بجائے سرگرمی کا باشعور خالق بن جاتا ہے اور اپنے افعال کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو بھی مجموعی طور پر ہماری قوم افراد کی قوم ہے' شخصیات کی قوم نہیں اور افراد کی قوم میں اجتماعی فلاح کے کام کرنے کے لئے زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ فرد ہر تبدیلی کو اپنی "جسمانی ذات" کے حوالے سے دیکھ کر اس کی افادیت کا تعین کرتا ہے اور شخصیت اپنی معاشرتی ذات کے حوالے سے دیکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بھٹو دور کی لیبر پالیسی تعلیمی پالیسی یا صنعتوں کو قومیانے کی پالیسیوں کا صحیح فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ہر چند ان پالیسیوں نے طبقاتی استحصال کے بالائی ڈھانچے کو شکست و ریخت سے دوچار کیا۔ لیکن مزدوروں کے بیشتر رہنما ان تبدیلیوں کو اجتماعی مفاد کے حوالے سے دیکھ کر' انہیں مستحکم کرنے میں وہ عملی مظاہرہ نہ کر سکے جو انقلاب کو تیز رفتاری سے آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتا۔ لیکن اس میں ان کا قصور بھی نہیں۔ وہ اپنے طبقاتی عمل اور انفرادی خواہشوں کے درمیان ابھی وہ توازن پیدا نہیں کر سکے' جس کی ضرورت ہے۔ حالات کی بتدریج تبدیلی انہیں ضرورت کا احساس دلا دے گی' اور جب وہ اجتماعی طور پر اس کی ضرورت کا احساس کر کے اپنے افعال کی قومی ذمہ داریاں قبول کریں گے تو مزید بہتر انقلابی حالت پیدا ہو گی۔

جاگیردار طبقے سے بلا معاوضہ زمینیں حاصل کر کے بے زمین کسانوں میں تقسیم کی گئیں' یہ پہلا موقع ہے کہ کسی غیر کمیونسٹ ملک میں جائیداد کو بلا معاوضہ حاصل کیا گیا۔ نوکر شاہی کی قدیم ظالمانہ گرفت کو کافی حد تک کمزور کر دیا گیا۔ بلوچستان میں سرداری نظام ختم کر کے وہاں کے مظلوم عوام کو پاکستان کی تاریخ میں اپنا فعال کردار ادا کرنے کا موقع دے دیا گیا۔ غرض آپ جس شعبے پر بھی نظر ڈالیں آپ کو یہ محسوس ہو گا کہ بھٹو نے ہمہ جہتی اصلاحات کے لئے ہر طرف انقلاب کے انجکشن لگا دیئے؟ اب یہ قوم کی بدنی حالت پر منحصر تھا کہ وہ کتنی جلدی اسے اپنے وجود میں تحلیل کر کے ترقی کی طرف اگلا قدم بڑھانے کے لئے تیار ہوتی۔

یہی نہیں کہ بھٹو نے اس تیاری کا کام صرف قوم پر چھوڑ دیا۔ وہ قوم کو اس تیاری کی طرف بڑھانے کے لئے خارجی حالات بھی پیدا کرتے رہے۔ انہوں نے صنعتکاروں اور سرمایہ داروں کی ریاست اور معاشرے پر گرفت کو کمزور کر دیا۔ بنکوں کو قومی ملکیت میں لے کر سرمائے کو چند ہاتھوں سے چھین لیا۔ نئی نئی قانونی اور زرعی اصلاحات کے ذریعے' ایک طرف صدیوں کے پسے ہوئے کسان کو اٹھانا شروع

www.bhutto.org

کیاتو دوسری طرف جاگیرداری کے کس بل نکالنے کے لئے مسلسل اقدامات کئے۔ پاکستانی قوم کا مستقبل تیسری دنیا کے مظلوم عوام سے وابستہ کر کے' سامراج کے ساتھ اس کے تضاد کو نمایاں کیا۔ ان تمام حالات نے غریب عوام کو منظم اور اجتماعی جدوجہد کے شعور کی طرف لے جانے میں کافی مدد دی ہے۔ انہیں رجعت پسندوں کی مخالفت ہی نہیں بلکہ بائیں بازو کے انتہاپسندوں کی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔ لیکن وہ تمام مخالفتوں کا دلیرانہ مقابلہ کرتے ہوئے بھوک' جہالت اور بیماریوں کے خلاف اپنا جہاد جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہی ان کی جمہوریت ہے اور یہی ان کی سیاست۔

سرمایہ داری یا نیم جاگیرداری ملکوں کی جمہوریت در حقیقت "اقلیّت" کی اکثریت پر حکمرانی کی جمہوریت کا نام ہے۔ جس میں دولت اپنا اقتدار چلاتی ہے۔ اس جمہوریت میں پارلیمینٹ کے آقا صنعتکار' جاگیردار بنکوں کے مالک اور ان کے پٹھو ہوتے ہیں۔ یہ جمہوریت در حقیقت جمہور یعنی عوام کے استحصال کا ایک ہتھیار ہے۔ بھٹو پر غیر جمہوری ہونے کا الزام یہی محروم اقتدار مفاد پرست عائد کرتے ہیں۔ ان کے اصل چہرے پہچاننے ہوں تو ان کے ماضی پر نظر ڈال کر دیکھ لیں۔ جب انہیں اپنا طبقاتی مفاد پورا ہوتا دکھائی دیتا ہے تو یہ اپنے آزادی و جمہوریت کے تمام نعرے بدل کر یحییٰ خاں جیسے آمر سے نہ صرف وزارتیں حاصل کر لیتے ہیں بلکہ عوام کے خون اور ہڈیوں سے مرتب کی گئی اسمبلیوں کی نمائندگیاں بھی قبول کر لیتے ہیں۔ ان کا یہ عمل ہی اس بات کا شاہد ہے کہ انہیں جمہوریت سے کوئی دلچسپی نہیں' بلکہ ان کا مقصد لوٹ کھسوٹ کے نظام کو برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ اگر کوئی جمہوریت ان کے ظالمانہ مقاصد پورے نہ کرے تو یہ اسے ختم کر کے ننگی اور برہنہ آمریت قائم کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

ان اصلاحات کو ناکام بنانے کے لئے با اثر طبقات نے بڑی منظم مخالفت جاری رکھی' مگر بھٹو کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جب تک عوام کی طاقت ان کے ساتھ ہے یہ رجعت پسند اور مفاد پرست ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ بھٹو کبھی خوفزدہ ہو کر ان کے آلۂ کار نہیں بنے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ طبقے ان پر اعتبار کر ہی نہیں سکتے۔ بھٹو کو اپنی طاقت کا راز معلوم تھا۔ یہاں ان کے فلسفۂ طاقت پر روشنی ڈالنے کے لئے ان کی ایک کمیاب تقریر کا حوالہ دینا مناسب رہے گا۔ یہ تقریر انہوں نے اگست سنہ 1970ء میں لاہور کے دانشوروں سے خطاب کرتے ہوئے کی تھی' جس میں انہوں نے صدر ناصر کی طرف سے راجرز پلان قبول کرنے کے فیصلے پر تنقید کرتے ہوئے انہیں یاد دلایا تھا۔

> "امریکہ اور اسرائیل ایک مدت سے چاہتے تھے کہ کسی طرح صدر ناصر کو اپنی راہ سے ہٹائیں کیونکہ وہی ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ جون سنہ 67ء کی جنگ کا بڑا مقصد بھی یہی تھا۔ مگر اس میں صدر ناصر بچ نکلے۔ کیا صدر ناصر کو یاد نہیں کہ انہیں بچانے والا کون تھا؟ انہیں بچانے والے وہ غریب مزدور تھے جن کی حالت ناصر

www.bhutto.org

کی وجہ سے سدھری تھی۔ وہ طالب علم تھے جنہیں ناصر کی وجہ سے مفت تعلیم ملی تھی۔ وُہ کسان تھے جو زمین کے مالک بن گئے تھے۔ وہ چھوٹے تاجر تھے جنہیں ناصر نے خوش معاش بنادیا تھا۔ یہی گلیوں اور بازاروں میں نکلے اور انہوں نے کہا .....
"ٹھیک ہے کہ ہم جنگ میں تباہ ہوئے مگر ناصر کے خلوص پر ہم شبہ نہیں کرتے۔ تم نے ہماری خدمت کی ہے۔ ہم تمہیں نہیں جانے دیں گے" .....اور یوں عوام کی قوت نے' غریب عوام کی قوت نے' مزدوروں، کسانوں' طالب علموں اور دانشوروں نے ناصر کو بچالیا۔ امریکہ کی سازش ناکام ہوگئی۔ یہودی ناکام ہوگئے مگر اس تجربے کے بعد امریکہ نے محسوس کر لیا تھا کہ جب تک ناصر کو عوام کی حمائت حاصل ہے اس کو ہٹانا مشکل ہوگا۔ اس کے بعد امریکہ کی ساری کوشش یہ تھی کہ ناصر کو کسی طرح عوام کی نظروں سے گرادیا جائے ناصر سے اس کی اصل طاقت یعنی عوام کی محبت چھین لی جائے۔ میں صدر ناصر کو بڑے دکھ کے ساتھ کہوں گا کہ راجرز منصوبہ اس سازش کا حصّہ ہے" آگے چل کر کہا ..... اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ ناصر کا ساتھ آج ملک کے اندر کون دے رہا ہے وہی رجعت پسند زمیندار اور سرمایہ دار جو ناصر کے دشمن ہیں۔ جنہیں ناصر نے غریب عوام کی ہمدردی میں نقصان پہنچایا ہے یہ لوگ تو ناصر سے انتقام لینے کے لئے بے چین ہیں۔"

جناب بھٹو نے صدر ناصر مرحوم کو مخاطب کرتے ہوئے' اپنے جس فلسفے کا اظہار کیا تھا اس کو سمجھ لینے کے بعد کیا کوئی یہ سوچ بھی سکتا ہے کہ بھٹو انقلاب کی راہ سے ہٹ سکتے تھے؟ وہ غریب عوام کا ساتھ چھوڑ سکتے تھے۔ بھٹو نے اپنے آپ کو انقلاب کا قائد بنا کر خود کو انقلاب کا قیدی بنالیا تھا۔ وہ تاریخی قوتوں کو حرکت دینے والے قوانین سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ تاریخ عوام ہی بناتے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ملک کے اندر ان کی اَصل اور حقیقی طاقت یہاں کے کسان' مزدور' طالب علم اور دانشور ہیں۔ وہ ہر قدم اس سمت میں اُٹھاتے چلے گئے جو ان کی اس قوت کو مضبوط کر سکے' وہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے عزائم سے بخوبی واقف تھے۔ انہیں ان کے باہمی تضادات اور ان کی کمزوریوں کا بھی علم تھا۔ اگر بھٹو چند سال اور بر سرِ اقتدار رہتے تو یہ لوگ ان کی انقلابی سیاست کے آگے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکتے۔

اقتصادیات کے بنیادی مسئلے کو حل کرنے کی طرف نتیجہ خیز اقدامات کے علاوہ جناب بھٹو نے وہ دیرینہ مسئلہ بھی حل کر دیا جو اس سے قبل 26 سال تک باعثِ نزاع بنا رہا اور جس کی وجہ سے ملک دو

www.bhutto.org

ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا' یعنی ایک ایسا آئین جو ملک کے تمام صوبوں کے عوام کے تعاون اور اتفاقِ رائے سے بنایا گیا ہو اور جس میں صوبائی خود مختاری کا ایسا تعین کیا گیا ہو' جس میں ایک طرف صوبے اپنے انتظامی امور میں زیادہ سے زیادہ با اختیار ہوں تو دوسری طرف وفاقی حکومت ملک کے استحکام و سالمیت کی ضمانت دینے کی اہل ہو۔ جناب بھٹو نے آئین سازی میں خالص جمہوری طرزِ عمل اختیار کیا ہر چند کہ ان کی پارٹی کو مرکز میں مکمل اور فیصلہ کن اکثریت حاصل تھی۔ بھٹو نے نہایت فراخ دلی سے ان لوگوں کی تجاویز کو سنا اور جو مناسب تھیں انہیں آئین میں جگہ دی صوبائی حقوق کا تعین پاکستان ہی نہیں پورے برِ صغیر میں ہمیشہ پیچیدگیاں پیدا کرنے کا باعث رہا ہے۔ لیکن یہ بھٹو کی پُر خلوص کوششوں کا نتیجہ تھا کہ وہ اس نازک اور دیرینہ مسئلے کو خوش اسلوبی سے حل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور تمام صوبوں کے نمائندوں نے بلا امتیاز جماعت پاکستان کے مستقل آئین کو منظور کر لیا۔ یہ ان کی ایسی کامیابی تھی جو آج تک پاکستان کے کسی رہنما کو نصیب نہ ہو سکی۔ انہوں نے پانچ سال کے اندر نہ صرف وہ تمام مسائل حل کر لئے جو ماضی میں بہترین حالات کے باوجود کوئی قیادت حل نہ کر سکی تھی۔ بلکہ انہوں نے جنگ کی تباہ کاریوں کا بھی ازالہ کر دیا اور پاکستانی قوم کو جنگ کے ہولناک نتائج سے باہر نکال کر ترقی و کامرانی کی شاہراہ پر گامزن کر دیا۔ آج میں جب ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ بھٹو کے دورِ اقتدار کے آغاز میں مغرب سے آنے والا ہر اخباری نمائندہ یہ سوال ضرور کیا کرتا تھا۔

..... "کیا باقی پاکستان بھی ٹکڑے ٹکڑے ہونے والا ہے؟"

..... "تمام کارڈ تو مسز گاندھی کے پاس ہیں۔ آپ کے پاس کچھ بھی نہیں۔ پھر آپ اپنی خود مختاری برقرار رکھتے ہوئے ان سے کس طرح سودے بازی کریں گے؟"

..... "آپ کہتے ہیں میں عوام کی حالت بھی سدھاروں گا اور افواج کو بھی مضبوط بناؤں گا۔ لیکن آپ کے خزانے تو خالی ہیں۔ اس کام کے لئے دولت کیا درختوں سے آئے گی؟"

ہاں دولت درختوں ہی سے آئی۔ وہ وقت آیا کہ پاکستان دفاعی طور پر ناقابلِ تسخیر بن گیا۔ بھارت سے تمام علاقہ اور جنگی قیدی بغیر اپنا مؤقف تبدیل کئے حاصل کر لئے گئے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے حوصلہ پا کر یہاں کے علیحدگی پسندوں نے جو سرگرمیاں شروع کر دی تھیں ان کی کمر توڑ دی گئی۔ انقلابی اصلاحات نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا میں دہشت' حیرت اور بے بسی کے اِن دنوں کو یاد کر کے سوچا کرتا ہوں کہ جو کام بھٹو نے تن تنہا تمام بیرونی و اندرونی سازشوں کا مقابلہ کرتے ہوئے کر دکھائے وہ .....ع

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کی بات نہیں

www.bhutto.org

پندرہواں باب

بھائیوں سے ملاپ

سنہ 71ء کے بحران میں جب بھارتی فوجوں نے ڈھاکہ کے دروازوں پر دستک دی تھی اور سحرزدہ بنگالی ان کا خیر مقدم کر رہے تھے تو 15 دسمبر کو بھٹو نے سلامتی کونسل میں کہا تھا

"وقت بتائے گا مسلم بنگال کو بھارت کچھ نہیں دے سکے گا اور کوئی بھلائی بھی اس کے حصّے میں نہیں آسکے گی"۔

اور وقت نے ان کی پیش گوئی کی تصدیق کر دی کچھ ہی عرصہ کے بعد اصل حقیقت مسلم بنگال کے عوام کے سامنے بے نقاب ہو گئی اور وہ بھارت کے اقدامات کے خلاف عوامی مارچ کرنے لگے' بھارت کے ساتھ بنگلہ دیش کے عوام کا تضاد ایک روز معاندانہ ہونا ہی تھا۔ لیکن پاکستان سے الگ ہوتے وقت بنگلہ دیش میں ہمارے خلاف نفرت و عناد کے جو جذبات اُبھار دیئے گئے تھے' انہیں ختم کرنے اور برادرانہ رشتے دوبارہ اُستوار کرنے کے لئے بہت سنبھل کر چلنے کی ضرورت تھی ہم تاریخ کے بے رحم فیصلوں کو اپنی خواہشات کے ذریعے نہیں بدل سکتے البتہ تاریخی دھاروں کے رُخ کا ساتھ دے کر آہستہ آہستہ دریا کے مانند ان کے بہاؤ کو بدل سکتے ہیں اس مسئلے پر بھی جناب بھٹو کے راستے میں قدم قدم پر بے رحمانہ انداز میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں پہلے ان پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے پولینڈ کی قرارداد مسترد کر کے پاکستان کو دو ٹکڑے کیا ہے لیکن پولینڈ کی قرارداد کے مقاصد کیا تھے؟ پہلے اس کی دو نمایاں شرائط ملاحظہ فرمالیں۔

(1) شیخ مجیب کو فوراً رہا کر کے اقتدار مکمل طور پر ان کے سپرد کر دیا جائے

(2) 72 گھنٹے کے اندر پہلے پاکستانی اور پھر بھارتی افواج وہاں سے نکل جائیں

www.bhutto.org

ان کوتاہ اندیشوں کو اس قرارداد میں ٹوٹتا ہوا پاکستان دکھائی نہیں دیا اسے منظور کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم یہ تسلیم کرلیں کہ ہمارا ملک بھارتی جارحیت سے نہیں' عوام کی مرضی ومنشا سے ٹوٹا ہے۔ ہم اس کی آزادی کو پہلے ہی روز سے تسلیم کرلیں اور شیخ مجیب کے ان مطالبات کو آئینی طور پر مان لیں جن کے تحت باقی پاکستان کے عوام آنے والے کئی عشروں تک اقتصادی ترقی سے محروم ہو کر بنگلہ دیش کو واجبات ادا کرتے رہیں اس کے عوض ہمیں ملنا کیا تھا؟ صرف فوجیوں کی واپسی' جو بہرحال بعد میں بھی ہو گئی لیکن ہمارا یہ آئینی اور تاریخی مؤقف اپنی جگہ قائم رہا کہ پاکستان کو جارحیت کے ذریعے توڑا گیا' یہ تاریخ بتائے گی کہ اس مؤقف کی وجہ سے آئندہ چل کر برِّصغیر کے مسلمانوں کو کیا کیا فوائد حاصل ہوں گے بہرحال کہاں تو یہ لوگ اس قرارداد کو منظور کر کے بنگلہ دیش کے قیام سے پہلے اسے منظور کر لینے پر مصر تھے۔ کہاں جب شملہ معاہدے کے بعد بھٹو نے برِّصغیر میں تعلقات کے نئے دور کو جنم دینے کی جدوجہد کا آغاز کیا تو رجعت پسندوں نے اسے "نامنظور" کرنے کے نعرے بلند کر دیئے اور دلیل یہ دی کہ اس طرح بھارت کی جارحیت کو قانونی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ گویا بھارتی فوج کی سنگینوں تلے خود بنگلہ باندھو بنگلہ دیش میں آزاد حکومت بنا دیتے تو بھارتی جارحیت غیر قانونی رہتی۔ بھٹو کی مخالفت میں یہ لوگ نہ صرف برِّصغیر کے مسلم عوام کے مستقبل سے کھیل رہے تھے بلکہ عالمی قوانین سے بھی آنکھیں بند کر چکے تھے بنگلہ دیش پاکستان کے عوام کا جذباتی مسئلہ تھا بھٹو یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ یہاں کوئی ایسی تحریک چلے جو پہلے ہی سے موجود نفرت وعناد میں مبتلا بنگلہ دیشی بھائیوں کے دلوں کو مزید مکدّر کر دے اور یہ بھی ان کی خواہش نہ تھی کہ پاکستان کے جنگی قیدیوں کا مسئلہ حل ہوئے بغیر کوئی ایسی صورتحال پیدا ہو' جس سے مجیب حکومت فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔ بنگلہ دیش کے مسئلے پر ان لوگوں نے اپنی سیاست چلانے کے لئے ان نوّے ہزار جنگی قیدیوں کا بھی خیال نہ کیا جن میں عورتیں بچے اور بوڑھے تک شامل تھے یہ بھٹو ہی کی حوصلہ مندی اور دانائی تھی کہ انہوں نے اس نازک انسانی مسئلے پر کوئی کمزوری ظاہر کئے بغیر' اپنے ملک کے مفادات کو بھی محفوظ رکھا اور ان قیدیوں کو بھی لے آئے ورنہ جس قسم کی صورتحال یہ لوگ پیدا کر رہے تھے اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ شیخ مجیب بھٹو پر مزید دباؤ ڈالنے کے لئے ہمارے بہت سے قیدیوں کو ڈھاکہ بلوا کر اذیتیں دیتا اور ان کے سروں پر مقدمات کی تلواریں لٹکا کر یہاں کے عوام کے صبر وسکون سے کھیلتا لیکن بھٹو نے ان کی تمام کوششوں کو ناکام کر کے بھارت اور مجیب کو یہ باور کرا دیا کہ وہ جنگی قیدیوں کے "لیور" کو کتنا ہی استعمال کریں بھٹو قومی مفاد کا سودا نہیں کریں گے ورنہ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے جب تک یہ لوگ بھارت کی قید میں رہے۔ بھٹو نے ایک دن سکون کا نہیں گذارا ان کا دل درد سے معمور تھا لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر انہوں نے اسے اپنی کمزوری بنا لیا تو دشمن نہ صرف ان قیدیوں پر مزید ستم ڈھائے گا بلکہ پاکستان کے چھ کروڑ آزاد عوام کے مستقبل کا سودا کرنے کی بھی کوشش کرے گا۔

www.bhutto.org

ڈاکٹر این میری شمل وزیر اعظم بھٹو کو خواجہ میر درد اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے بارے میں اپنی کتاب پیش کرتے ہوئے

www.bhutto.org

ادھر تو بھٹو اس نازک معاملے میں بھارت اور مجیب کی بلیک میلنگ کی کوششوں کو ناکام بنا رہے تھے ادھر یہ رجعت پسند گروہ یہ نعرے لگا رہا تھا "بنگلہ دیش۔ نامنظور" مجیب تقاضا کر رہا تھا کہ کسی قسم کے رابطے سے قبل، پہلے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا اعلان کرو۔ غرض عجیب پیچیدہ صورتحال پیدا ہو گئی، خارجی اور داخلی دونوں طرف کے دباؤ متضاد انداز میں کام کر رہے تھے، بھٹو کے سامنے پاکستان کے مفاد کا مسئلہ بھی تھا اور ان لاکھوں گھرانوں کے سکھ چین کا بھی، جن کے پیارے دشمن کی قید میں پڑے تھے۔ ساتھ ہی وہ مجیب کی ہٹ دھرمیوں کے باوجود اپنی طرف سے کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتے تھے، جس کی وجہ سے بنگلہ دیش کے مسلم عوام میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو۔ اس اعصاب شکن صورت حال میں بھی وہ صبر و سکون کے ساتھ مصروفِ عمل رہے متاثرہ خاندانوں کے مسئلے کی نزاکت کا احساس دلانے کے لئے انہوں نے پارٹی کے متعدد لیڈروں کو ان کے گھروں پر بھیجا۔ منظور نامنظور کے سلسلے میں کوئی دوٹوک مؤقف اختیار نہ کر کے انہوں نے داخلی تحریک اور مجیب دونوں کے لئے تحیّر کی صورت حال پیدا کر دی اور اس کے ساتھ ہی اناج کی قلت کے شکار بنگلہ دیش کو لاکھوں روپے کے چاول کا تحفہ دینے کا اعلان کیا جسے مجیب نے اقوام متحدہ کے توسط کے بغیر قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن بنگلہ دیش کے فاقہ زدہ عوام پر اس اعلان کا خاطر خواہ اثر ہوا۔

وہ پوری احتیاط کے ساتھ اس نازک راستے پر چلتے ہوئے اس منزل تک پہنچ گئے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا معاملہ برّصغیر کی سیاست سے باہر نکال کر مسلم دنیا میں لے آئے ورنہ اس سے قبل یہ بھارت کی شرائط کا حصّہ تھا۔ بھارت کی شرائط کے تحت بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا دوسری بات تھی اور مسلم ممالک کی برادری میں آ کر تسلیم کرنا بالکل مختلف معنی رکھتا تھا۔ چنانچہ جب اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر عوامی نمائندوں کے سامنے جناب بھٹو نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا تو پاکستان کے عوام ذہنی طور پر اس کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رجعت پسند جو اس مسئلے پر ہنگامے کھڑے کرنے کے منصوبے تیار کئے بیٹھے تھے انہیں منہ کی کھانی پڑی۔ اپریل سنہ 74ء میں جنگی قیدیوں کا آخری قافلہ بھی پاکستان واپس پہنچ گیا اور یوں جناب بھٹو نے یہ مسئلہ بھی پاکستان کے دُہرے مفاد کو پوری طرح محفوظ رکھتے ہوئے حل کر لیا یعنی جنگی قیدیوں کو واپس بھی لے آئے اور بنگلہ دیش کے عوام کے دلوں میں بد ظنی پیدا کرنے والا کوئی قدم اٹھانے سے بھی گریز کیا۔ ان کی اس دانشمندی کے عملی نتائج اس وقت سامنے آئے جب وہ پیش عملی کرتے ہوئے ڈھاکہ کے دورے پر تشریف لے گئے۔

اس دورے کا پس منظر بھی بڑا گھمبیر تھا۔

جناب بھٹو اور بنگلہ دیش کے عوام اپنے رشتوں کو استوار کرنے کے خواہش مند تھے لیکن بھارتی حکومت کی طرف سے مجیب الرحمان پر شدید دباؤ تھا کہ وہ سخت گیر رویہ اختیار کئے رکھے اس کے پیچھے

www.bhutto.org

مقصد یہ تھا کہ جب مجیب ناقابل عمل قسم کے مطالبے کرے گا تو بھارت کو دونوں کے درمیان ثالث بن کر 'اپنے مقاصد پورے کرنے کا موقع مل جائے گا اور وہ مجیب سے رعائتیں دلوانے کے عوض پاکستان کے ساتھ سودے بازی کرے گا لیکن ڈھاکہ کے عوام نے اس بازی کو پلٹ کے رکھ دیا جناب بھٹو کے دورے کے دوران مجیب حکومت نے پوری کوشش کی کہ ڈھاکہ کے عوام پاکستان کے حق میں اپنے جذبات کا اظہار نہ کر سکیں لیکن بھٹو کی عقابی نگاہوں نے ان کی آنکھیں پڑھ لیں اور دنیا نے بھی دیکھ لیا کہ وہاں کے لوگ جو گمراہ کن نعروں کے فریب میں آ گئے تھے اتنی تلخیوں کے بعد بھی پاکستان کے ساتھ اپنے رشتوں کو بھولے نہیں گو مجیب نے بھارتی دباؤ کے تحت ناقابل مفاہمت رویہ اختیار کیا لیکن بھٹو دیکھ چکے تھے کہ تاریخ کے عمل نے اپنا کام شروع کر دیا ہے وہ بغیر کوئی وعدہ کئے واپس چلے آئے اور پھر وہی ہوا جو تاریخی جبر کا لازمی حصہ ہوا کرتا ہے تاریخ یوں تو عروج و زوال کی بے شمار داستانوں سے بھری پڑی ہے لیکن جدید زمانے میں نہ تو ایسی مثال ملتی ہے کہ کسی لیڈر نے یوں چند برسوں کے اندر مقبولیت کی وہ انتہا دیکھی ہو جو مجیب کو نصیب ہوئی اور نہ ایسی کہ صرف چند ہی برسوں میں اس کا ایسا عبرت ناک انجام ہوا ہو' جو مجیب کا ہوا۔

بھٹو نے یہاں بھی بیدار مغزی کا مظاہرہ کیا ایک لمحہ ضائع کئے بغیر انہوں نے بنگلہ دیش کی نئی حکومت کو تسلیم کر لیا بھارت اور اس کے سرپرستوں پر بوکھلاہٹ طاری ہو گئی اس نے جوابی بغاوت کے ذریعے بنگلہ دیش کے انقلاب کو ناکام بنانے کی کوشش کی لیکن انقلابیوں نے جو قدم اٹھایا تھا اس میں انہیں اپنے عوام کی اکثریت کی تائید حاصل تھی لہٰذا بھارت نواز بغاوت کو چند گھنٹوں میں ختم کر دیا گیا اور اس بار عوامی لیگ کے وہ بھارت نواز لیڈر بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے جو ایک بار پھر اپنے عوام کے مقدّر کو بھارت کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا چاہتے تھے بھٹو بڑی احتیاط اور چابکدستی سے پاکستانی عوام کو اس مرحلے تک لائے کہ بنگلہ دیش کے ساتھ ہمارے نئے تعلقات کی خوشگوار ابتدا ہوئی دونوں طرف سفارت خانے کھُل گئے تجارتی وفود کا تبادلہ ہونے لگا بینکوں کی شاخیں کھُل گئیں گویا دِلوں کے دروازے جو پہلے ہی کھُل چکے تھے اب ان سے قافلوں نے بھی گذرنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف بنگلہ دیش کے مسلم عوام کا اصل دشمن بھارت اپنے بھیانک چہرے کے ساتھ ان پر پوری طرح بے نقاب ہو گیا کچھ ہی عرصے بعد اس نے اس مظلوم ملک کو بنجر کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد شروع کر دیا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ بنگلہ دیش کے جائز حقوق کے لئے عالمی سطح پر جدوجہد کرنے والوں میں ان کے اصل بھائی یعنی پاکستانی اور ان کا حقیقی دوست یعنی چین دونوں پیش پیش ہیں۔

یہ سوچنا تو غلط ہو گا کہ گھڑی کبھی پیچھے کی طرف بھی چل سکتی ہے۔ گذرا ہوا وقت لوٹ کر نہیں آئے گا اور وہ وقت تو کوئی زیادہ خوشگوار بھی نہ تھا جو اس کے لوٹنے کی تمنا کی جائے لیکن برِّصغیر کی تاریخ کا

www.bhutto.org

مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ بنگال کے مسلم عوام دو قومی نظریئے کے اتنے ہی قائل ہیں' جتنے کے ہم' انہوں نے عملی طور پر ہندو تسلط کا تجربہ پھر کر لیا ہے جو ابھی تازہ تازہ ہے گو وہ اپنے مسائل میں اُلجھے ہوئے ہیں گو دنیا کو آج ان کے ملک کی بقا تک مخدوش دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ہم اپنے ان بھائیوں کو اچھی طرح جانتے ہیں ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ اپنے ازلی دشمن کے حصار میں بُری طرح گھرے ہوئے ہیں ان کی عظیم تاریخ ہے۔ انہوں نے صدیوں تک سامراج اور استحصالی قوتوں کے خلاف مجاہدانہ جدوجہد کی ہے۔ انکی عظمت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی سرزمین پر فوجی قبضہ کرنے والی طاقت کے خلاف دو ہی سال بعد اپنی نفرت کا اظہار شروع کر دیا۔ وہ بنیادی طور پر انقلابی عوام ہیں وہ اسلام کے سچے پرستار ہیں انہیں برِّصغیر میں قائدانہ کردار ادا کرنا ہے۔ بھٹو بنگلہ دیش کے عظیم عوام کی ان خصوصیات کا دل سے احترام کرتے تھے۔ وہ اپنے ذاتی دوستوں میں بیٹھ کر بنگلہ دیش کے مسلم عوام کی صدیوں پر پھیلی ہوئی غربت اور افلاس پر گہرے دُکھ کا اظہار کرتے اور ماضی کے ان ظالم و جابر حکمرانوں کی اس حماقت پر کفِ افسوس ملتے جس کی وجہ سے وہاں کے عوام کو نہ صرف تکالیف کا سامنا کرنا پڑا بلکہ ان کی ترقی و خوشحالی کی منزل کی راہ طویل ہو گئی لیکن وہ پُر امید تھے کہ بنگلہ دیش کے مسلمان انقلابی عوام اپنی قوت سے ترقی و خوشحالی کی منزل تک پہنچ کر رہیں گے اور ان کے برادر ملک پاکستان کے وزیر اعظم کی حیثیت میں ان کی آزادی و خوشحالی کے تحفظ کے لئے وہ جو کچھ بھی کر پائے، کریں گے اور خدا موقع دیتا تو شاید وہ اپنی زندگی میں ہی اپنے ان بچھڑے ہوئے بھائیوں کے ساتھ اپنے قدیم' تاریخی' تہذیبی رشتوں کو' ایک کنفیڈریشن کی صورت میں دوبارہ اُستوار ہوتے ہوئے دیکھ لیتے۔

www.bhutto.org

سولھواں باب

عالم اسلام اور بھٹو

ابتدائی صفحات میں آپ دیکھ آئے ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو بچپن ہی سے ایک پُرجوش مسلمان انقلابی رہے اور اپنی عمر کے مطابق انہوں نے تحریک پاکستان کے لئے جو کام کیا اس پر قائداعظم نے ذاتی طور پر پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اپنی نوجوانی کی تقاریر میں بھی وہ مسلم دنیا کی اہمیت اور اس کے باہمی تعاون پر زور دیا کرتے تھے۔ برسراقتدار آکر بھی وہ مسلمانوں کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر کے انہیں دنیا کی عظیم طاقت بنانے کے خواہش مند رہے۔ وہ اسلام کی انقلابی روح سے پوری طرح آشنا تھے وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں نے اپنے عروج کے دور میں دنیا کے نصف پر حکومت کی، لیکن مکّہ میں کوئی ایسا عجائب گھر نہیں جہاں دوسرے ممالک سے لوٹا گیا سامان فخریہ سجایا گیا ہو۔ اس دور کی روایت کے مطابق جنگ کے فیصلے پر مال غنیمت ضرور حاصل کر لیا جاتا تھا، لیکن بعد میں جب حکومت قائم ہو جاتی تھی تو ہر قوم اپنے وسائل سے خود مستفید ہوا کرتی تھی۔ مسلمانوں نے یہ کبھی نہیں کیا کہ یورپی سامراجیوں کے مانند جہاں بھی حکومت قائم کی، وہیں کے لوگوں کے وسائل کو ظالمانہ انداز میں لوٹ کر اپنے ملک کی طرف لے جانا شروع کر دیا۔ مسلمان درحقیقت ایک انقلابی پیغام اور بہتر تہذیب لے کر جاتے تھے۔ اس کے برعکس یورپ کی اقوام نے جب ایشیا اور افریقہ کے ممالک پر یلغار کی تو ان کے بھیانک مقاصد کا عنوان ہی لوٹ مار ہوا کرتا تھا۔

اٹھارویں صدی میں برّصغیر پر انگریز نے غلبہ حاصل کرنا شروع کیا اور 1857ء میں اس کی تکمیل کر لی۔ اسی عرصے میں دوسری طرف اسلامی دنیا بھی یورپ کی جارحیت کے سامنے بے بس ہوتی چلی گئی۔ 1886ء تک روس ایران اور افغانستان تک آ پہنچا۔ اسی صدی کے اختتام تک ملایا بھی انگریز کی عملداری میں آ گیا۔ تقریباً اسی عرصے میں موجودہ انڈونیشیا کے جزیرے بھی فوجی کالونی بن گئے۔ اسلامی

www.bhutto.org

دنیا کے مغرب میں الجزائر' تیونس' مصر' سوڈان اور دوسرے مسلم ملک ایک ایک کر کے یورپ کے سامراجی ممالک کے زیر نگیں آتے چلے گئے۔ انیسویں صدی کے اختتام تک تقریباً تمام مسلم دنیا عملی طور پر یورپ کے سامراجی ملکوں کی لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بن چکی تھی۔ ان مسلم اقوام نے اس سے قبل بہت سی دوسری اقوام کی برتری کے ادوار دیکھے تھے' لیکن مہذب یورپ نے جس انداز میں بے رحمانہ لوٹ مار مچائی' اس کی مثال تک موجود نہ تھی۔ برّصغیر کے مسلمانوں پر بطور خاص انگریز حاکموں اور ہندو ساجھے داروں کا دوہرا ظلم ٹوٹا۔ لیکن اس کے باوجود بھٹو اپنی اس تاریخ پر فخر کرتے تھے کہ برّصغیر کے مسلمانوں نے اپنی تمام غربت اور بے بسی کے باوجود دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے جب بھی موقع آیا' سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر قربانیاں دیں۔ سلطان عبدالحمید نے دنیا میں ہر جگہ مسلمانوں سے رابطہ قائم کیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے نمائندے چین' جاوا اور الجزائر تک گئے تھے۔ لیکن دنیا میں کہیں بھی خلافت کے تحت مسلمانانِ عالم کے اتحاد کے اس پیغام کو اس گرمجوشی سے قبول نہ کیا گیا' جس کا اظہار برّصغیر کے مسلمانوں نے کیا۔ انہوں نے اسے اپنا مقصدِ حیات قرار دے لیا۔ انگریز حکمرانوں کو اپنا حاکم تسلیم کرنے سے انکار کر کے' انہوں نے ترک خلیفہ کا نام جمعہ کے خطبوں میں لینا شروع کر دیا۔

موجودہ صدی کی پہلی دہائی میں جب ایران پر روس نے' ترپولی پر اٹلی نے اور ترکی پر بلقان اتحادیوں نے یلغار کی تو وہ برّصغیر ہی کے مسلمان تھے جنہوں نے عوامی سطح پر زبردست مخالفانہ تحریکیں چلائیں۔ کونسل آف آل انڈیا مسلم لیگ نے اٹلی کی جارحیت کی مذّمت کی' مسلمان راہنماؤں نے اٹلی کی مصنوعات کے بائیکاٹ کی اپیلیں کیں۔ مولانا شبلی' علامہ اقبالؒ' مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان نے تحریروں' تقریروں اور نظموں کے ذریعے جارحیت کے شکار مسلمانوں کی مدد کے لئے مسلمانوں کو منظم کرنا شروع کیا۔ علی گڑھ مسلم کالج نے مصیبت زدگان کی امداد کے لئے ریلیف فنڈ قائم کیا' اور ایک طبّی وفد جنگِ بلقان میں زخمی ہونے والوں کی خدمت کے لئے ترکی بھیجا گیا۔

اسی طرح خلافت تحریک بھی مسلمانانِ برّصغیر کی عالمِ اسلام کے ساتھ بے پناہ محبت کی دلیل ہے۔ اس تحریک نے 1857ء کے بعد پہلی بار انگریز حکومت کی بنیادوں کو ہلایا۔ اس تحریک کے دوران جس طرح مسلمانوں نے منظم جدوجہد کی' اس کا تجربہ آگے چل کر' تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے میں مدد ثابت ہوا۔ ترکی کے کمال اتاترک کے ہاتھوں خلافت کے فاتح نے مسلمانانِ ہند کے جذبات کو شدید دھچکا لگایا اور انہیں حقائق کی دنیا میں آنے پر مجبور کر دیا اور وہ جدید سائنس اور علوم کی طرف متوجہ ہوئے' انہیں یہ احساس ہو گیا کہ جدید علوم کے بغیر مسلمانوں کی ترقی و استحکام ناممکن ہے۔ اس نئے خیال کا ایک عملی مظہر علی گڑھ کالج کا قیام تھا۔ اس زمانے میں سیّد امیر علی نے اپنی مشہور کتاب "دی سپرٹ آف اسلام" شائع کی' جس میں انہوں نے عہد جدید کے علوم کی روشنی میں اسلام کا مطالعہ کیا اور علامہ اقبالؒ نے اپنی

www.bhutto.org

شاعری' خطبات اور مضامین کے ذریعے اسلام کی انقلابی روح کو ایک نئے انداز میں پیش کیا۔ علامہ اقبالؒ کے افکار و خیالات نے بطور خاص پوری نسل کو متاثر کیا اور یہی چیز آگے چل کر قیام پاکستان کی بنیاد بنی۔ برّصغیر میں قیام پاکستان کے داخلی عوامل کے علاوہ اگر اس کے خارجی عوامل کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ ملک حاصل کرتے وقت مسلمانان برّصغیر کا ایک عظیم مقصد یہ بھی تھا کہ وہ انگریز یا ہندو کی غلامی میں رہ کر مسلم دنیا کی کوئی خدمت نہیں کر سکیں گے۔ لہٰذا وہ اپنا علیحدہ وطن حاصل کر کے ہی باقی دنیا کے مسلمانوں کے لئے کام کر سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے پاکستان کی بنیاد میں ہی مسلم دنیا کے ساتھ برادرانہ تعلقات کا مقصد پوشیدہ ہے اور یہ ہماری خارجہ پالیسی کا وہ بنیادی پتھر ہے' جسے ہٹانا ممکن ہی نہیں' یہی وجہ ہے کہ ماضی سے لے کر آج تک مسلم دنیا کے مسائل کے بارے میں پاکستان کی پالیسی ہمیشہ مفادات کے عالمی معیاروں سے بالاتر رہی ہے۔ مثلاً فلسطین میں یہودیوں کی آباد کاری کے مسئلے پر برّصغیر کے مسلمانوں نے ابتداء ہی میں اضطراب اور بے چینی کا اظہار کر دیا تھا۔ برطانوی سازش کے خلاف ہر طرف مظاہرے کئے گئے تھے اور سرزمینِ مقدس کو یہودیوں کے وطن میں بدلنے کی سازش کی شدید مذمت کی گئی تھی۔

جب ہٹلر جرمنی میں برسر اقتدار آیا اور اس کی پالیسیوں کے نتیجے میں یہودی کثرت کے ساتھ فلسطین میں آکر آباد ہونے لگے اور اس پر عربوں نے احتجاج کیا تو قائداعظم کی قیادت میں آل انڈیا مسلم لیگ نے ان یہودیوں کی منظم انداز میں فلسطین میں آباد کاری کی مذمت کی' اور مطالبہ کیا کہ مزید یہودی پناہ گزینوں کی آمد پر پابندی لگائی جائے اور مقامی عربوں کو ان کے سیاسی اور سماجی حقوق دیئے جائیں۔ یہ برّصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد کا ہی نتیجہ تھا کہ برطانوی حکومت نے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لئے ایک رائل کمیشن قائم کیا۔ لیکن دوسری جنگ عظیم شروع ہو جانے کے باعث اس کمیشن کی سفارشات پر غور کرنے کا موقع ہی نہ آسکا۔ 1947ء میں پاکستان قائم ہوا تو فلسطین میں یہودیوں کے قدم جم چکے تھے۔ وہ کل آبادی کا ایک تہائی حصّہ بن چکے تھے اور عربوں کی زمینیں اور جائیدادیں خرید کر انہیں اقتصادی طور پر کمزور کر چکے تھے۔ خود جدید ترین ہتھیاروں سے مسلّح ہو چکے تھے بیرونی طور پر وہ امریکہ اور یورپ کے با اثر یہودیوں کی مدد سے ان ملکوں کی بھرپور ہمدردیاں حاصل کر چکے تھے۔ گویا داخلی طور پر جنگ کے لئے پوری طرح تیار ہو کر اور طاقتور ممالک کی ہمدردیاں حاصل کر کے' وہ ایک خود مختار یہودی ریاست قائم کرنے کا منصوبہ مکمل کر چکے تھے۔ یہ پہلا خارجی مسئلہ تھا جس میں نو زائیدہ مملکت پاکستان کو بھرپور انداز میں اپنا کردار ادا کرنا پڑا' اور یہ کردار ظاہر ہے' دنیا بھر کی سامراجی طاقتوں کے مفادات کے خلاف تھا' جو مشترکہ طور پر یہودیوں کی پشت پناہی کر رہی تھیں۔ قائداعظمؒ کے چند ابتدائی کاموں میں سے ایک کام یہ تھا کہ انہوں نے اس مسئلہ پر امریکہ کے صدر ٹرومین کو ایک پُرزور خط لکھا اور اس میں مسلمانوں کے حقوق کی زبردست وکالت کی۔ جب یہ مسئلہ جنرل اسمبلی میں آیا تو قائداعظم کی ہدایت پر

www.bhutto.org

پاکستانی وفد نے فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کی شدید مخالفت کی اور تجویز پیش کی کہ ان بے گھر یہودیوں کو جن کی بے چارگی کا بہانہ بنا کر عربوں کی پیٹھ پر خنجر گھونپا جا رہا ہے' واپس ان یورپی ممالک میں جا کر آباد ہونا چاہئے جہاں سے وہ نکل کر آئے تھے' لیکن بڑی طاقتیں اپنی سازش مکمل کر چکی تھیں' انہوں نے چھوٹے ممالک پر دباؤ ڈال کر مطلوبہ اکثریت حاصل کر کے تقسیم فلسطین کی قرارداد منظور کرالی اور یوں نومبر 1947ء میں اسرائیل معرض وجود میں لایا گیا۔ مئی 1948ء میں جب اسرائیل کو باقاعدہ ریاست کا درجہ دیا گیا تو پاکستان نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور آج تک اپنے اس مؤقف پر قائم ہے اور ہمارے اس مؤقف میں اس دوران بھی ذرا تبدیلی نہ آئی تھی' جب بعض عرب ملکوں کے ساتھ وقتی طور پر ہمارے باہمی تعلقات میں سرد مہری آ گئی تھی' مفادات سے بالاتر ہو کر' مسلم دنیا کی حمایت کے اصول کی یہ ایک ایسی مثال ہے جو موجودہ دور کی سیاست میں کہیں اور مشکل ہی سے ملے گی۔ یہ اسلام ہی ہے جو سچائی اور اصولوں پر استقامت سے قائم رہنے کی قوت بخشتا ہے۔

اسلام نے ہمیشہ جبر' استبداد اور سامراجیت کی مخالفت کی ہے۔ مسلمان خود صدیوں تک بدترین قسم کے استحصال اور لوٹ مار کا شکار رہے ہیں' مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک' مسلم عوام یورپ کی ہر سامراجی طاقت کے ظلم کا نشانہ بنے ہیں۔ برطانیہ' جرمنی' فرانس' ڈچ اور پرتگال سب نے مسلم عوام کے استحصال میں' اپنا اپنا حصّہ حاصل کیا ہے۔

اسلام کا پیغام برابری' انصاف اور عدل کا پیغام ہے۔ دوسرے نظریات میں سامراجیت اور نو آبادکاری پر تنقید محض ایک علمی معاملہ ہے۔ لیکن اسلام میں یہ دین اور عقیدہ کا حصّہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہر جگہ مسلمان بنیادی طور پر استحصال اور سامراجیت کے خلاف ہیں۔ یہ ایک حقیقی انقلابی قوّت ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو اس قوت کو اچھی طرح پہچانتے تھے اور اس پورے پس منظر میں جب وہ اسلامی برادری کی بات کرتے تھے تو ان کا نعرہ رجعت پسندوں کا بے بنیاد جذباتی نعرہ نہیں ہوتا تھا' بلکہ اسلام کی انقلابی روح کا امین بن کر' ٹھوس حقائق پر مبنی ایک انقلابی نعرہ بن جاتا تھا۔ جو عالمی انقلاب میں اپنا ایک تاریخ ساز کردار رکھتا ہے۔

بھٹو ماضی میں پاکستان کے مسلم دنیا کے ساتھ رویے کا تجزیہ بھی اپنے اس فلسفے کی روشنی میں کرتے تھے۔ 1949ء میں جب جنرل اسمبلی میں اٹلی کی کالونیوں لیبیا' صومالی لینڈ اور اریٹریا کے مستقبل کا سوال اٹھا تو پاکستان نے ان ممالک کے عوام کی اُمنگوں کی ترجمانی کی۔ پاکستان نے متحدہ لیبیا کی آزادی کا مطالبہ کیا اور کہا کہ اگر فوری طور پر ایسا ممکن نہیں تو پھر اسے ٹرسٹی شپ کونسل کی براہ راست نگرانی میں دے دیا جائے جو کم از کم عرصے میں لیبیا کو خود مختار ملک بنانے کی کوشش کرے۔ جب اقوام متحدہ نے 1949ء میں لیبیا کی آزادی کا فیصلہ کیا تو پاکستان کی کوششیں اس میں شامل تھیں۔ 1952ء میں انتقالِ اقتدار مکمل

www.bhutto.org

شملہ کانفرنس 1972ء کی ایک یادگار تصویر

www.bhutto.org

کرانے کے لئے یو۔ این کی طرف سے جو کمیشن بنایا گیا' پاکستان اس کا ممبر تھا۔ بطور ممبر پاکستان نے لیبیا کو آزاد کرانے کے سلسلے میں بھرپور کردار ادا کیا اور 14 دسمبر 1955ء کو لیبیا آزاد ملک کے طور پر اقوام متحدہ کا ممبر بن گیا۔ اطالوی صومالی لینڈ کے مسئلے پر پاکستان نے جرأت مندانہ تجویز پیش کی' جس میں کہا گیا تھا کہ صومالیہ کے تمام حصّوں کو جو اٹلی' برطانیہ اور فرانس میں بٹے ہوئے ہیں یکجا کر کے عظیم صومالیہ کے طور پر آزاد کیا جائے۔ یہ تجویز مغربی ممالک کی اصل تجویز کے برعکس تھی۔ پاکستان کی جدوجہد کی وجہ سے جنرل اسمبلی نے طے کیا کہ صومالی لینڈ کی برطانوی اور اطالوی کالونیوں کو یو۔ این کی ٹرسٹی شپ میں دے دیا جائے اور دس برس کے اندر اسے آزاد اور خود مختار ملک بنا دیا جائے۔ 20 ستمبر 1960ء کو صومالیہ بطور ایک آزاد ملک کے یو این کا ممبر بن گیا۔ شمالی افریقہ کے مسلم ممالک کی جدوجہد آزادی میں بھی پاکستان نے نمایاں کردار ادا کیا۔ تیونس' مراکو اور الجزائر کے مسائل پر پاکستان ان کا سرگرم ترجمان تھا۔

اپریل 1953ء کو جب تیونس کی حکومت نے فرانسیسی پالیسیوں کے نتیجے میں نازک صورت حال پیدا ہونے کی شکایت کی' تو پاکستان سلامتی کونسل کا ممبر تھا اور اس کے نمائندے پروفیسر پطرس بخاری مرحوم اس ماہ کے صدر تھے۔ اس شکایت کو ایجنڈے میں شامل کرنے کی فرانس نے شدید مخالفت کی' اس کا مؤقف تھا کہ تیونس ایک معاہدے کے تحت اس کی تحویل میں ہے اور اس نے آرٹیکل 2 پیراگراف 7 کا حوالہ دے کر کہا کہ اقوام متحدہ اس مسئلے پر بحث کی مجاز نہیں۔ اس پر پاکستانی نمائندے نے شدید ریمارکس دیئے' پھر پاکستان نے تیونس میں عوام کے حقِ خود اختیاری کی حمایت میں قرارداد پیش کی۔ اس طرح مراکو کے مسئلے پر اقوام متحدہ میں پاکستان نے جرأت مندانہ موقف اختیار کیا اور 1956ء میں اس کی آزادی تک' وہاں کے عوام کے حقوق کی بحالی کے لئے جدوجہد کرتا رہا۔

1954ء میں الجزائر کے عظیم مسلمان عوام نے فرانس کے خلاف مجاہدانہ جدوجہد شروع کی تو پاکستان نے روزِ اوّل ہی سے ان کی آزادی و خود مختاری کا مطالبہ شروع کر دیا اور اس مسئلے کو اقوام متحدہ میں اٹھانے کے لئے کوشش کی۔ فرانس نے پھر اسے داخلی مسئلہ قرار دے کر اقوام متحدہ کو بحث کے لئے غیر مجاز قرار دیا۔ اس پر مرحوم محمد علی بوگرا نے فرانس پر شدید تنقید کی۔ بعد میں پاکستان اس قرارداد کے محرکین میں تھا جس میں الجزائری عوام کے حق خود اختیاری کو تسلیم کرنے کے لئے فرانس اور الجزائری نمائندوں کے درمیان مذاکرات کے لئے کہا گیا تھا۔ لیکن یہ قرارداد پاس نہ ہو سکی۔ بعد میں ذوالفقار علی بھٹو خود پاکستان کی نمائندگی کرنے لگے تو انہوں نے اپنے روائتی انقلابی انداز میں الجزائری عوام کی جدوجہد آزادی کا ساتھ دیا۔ بھٹو کی پُرخلوص محنت' انقلابی شخصیت اور بھرپور جذبۂ اسلامی کو دیکھتے ہوئے اقوام متحدہ میں افریقی ایشیائی گروپ نے مشترکہ طور پر ان سے درخواست کی کہ وہ ان ممالک کی مشترکہ قرارداد کو

www.bhutto.org

پیش کرنے کی ذمہ داری قبول کریں۔ جس میں الجزائری عوام کی خود مختاری اور آزادی کو تسلیم کرتے ہوئے فرانس سے کہا گیا تھا کہ وہ ایف ایل این کے نمائندوں کے ساتھ اقوام متحدہ کے چارٹر کے اصولوں کے تحت مذاکرات کرے۔ 1960ء میں جناب بھٹو نے جنرل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے الجزائری عوام کی مجاہدانہ جدوجہد اور ان کی آزادی کے حق میں پُراثر اور زوردار تقریر کی۔ 1961ء میں جناب بھٹو کی کوششوں سے عالمی معاملات میں قائداعظم کے بعد' پاکستان نے پہلا حریّت پسندانہ خارجی فیصلہ کیا جس کے تحت الجزائر کی عارضی جلاوطن حکومت کو تسلیم کر لیا گیا۔ اس اقدام کی الجزائر ہی میں نہیں پورے افریقہ میں تعریف کی گئی۔ پاکستان نے یہ فیصلہ فرانس کے ساتھ اپنے قدیم روابط اور خاص طور پر مسئلہ کشمیر پر اس کی تائید کو داؤ پر لگا کر کیا۔ اس جرأت و دلیری کا مظاہرہ بھٹو ہی کر سکتے تھے۔ 1961ء میں پاکستان نے 35 ممالک کی طرف سے جنرل اسمبلی میں قرارداد پیش کی جس کے تحت فرانس کی حکومت سے کہا گیا تھا کہ وہ الجزائری قیدیوں کی شکایت دور کر کے' ان کی بھوک ہڑتال ختم کرائے' یہ قرارداد منظور ہو گئی۔ جس کی وجہ سے بھوک ہڑتال ختم ہوئی اور فرانس اور الجزائر مذاکرات کے لئے فضا سازگار ہو گئی۔ بعد میں جنرل ڈیگال نے نہ صرف الجزائر کی آزادی تسلیم کر لی بلکہ افریقہ میں انہوں نے دوسری فرانسیسی کالونیوں کو بھی آزاد کرنا شروع کر دیا اور اس طرح تیسری دنیا میں اپنا وقار بحال کر لیا۔

عرب دنیا کے بارے میں بھی پاکستان کا رویّہ ہمیشہ دوستانہ اور برادرانہ رہا ہے مصر کے سلسلے میں قیام پاکستان سے قبل بھی برصغیر کے مسلمانوں نے سامراج کے خلاف اس کی جدوجہد کی بھرپور حمایت کی تھی۔ سویز زون سے برطانیہ کی قابض فوجوں کے انخلاء کے مطالبے اور اینگلو مصری سوڈان کے مسئلے کے حل کے لئے مذاکرات کی ہم نے تائید کی تھی پاکستان نے مصر اور برطانیہ کے مذاکرات دوبارہ شروع کرانے میں اہم کردار ادا کیا جو ڈیڈ لاک کا شکار ہو چکے تھے۔ صدر ناصر آئے تو انہوں نے غیر جانبداری کی پالیسی اختیار کی لیکن پاکستان 54ء میں امریکہ کے ساتھ فوجی امداد کا معاہدہ کر چکا تھا۔ اور اس سال سیٹو کا ممبر بھی بن گیا۔ یہ اقدامات اس وقت کے راہنماؤں نے اپنی دانست کے مطابق بھارتی جارحیت سے پاکستان کو محفوظ رکھنے کے لئے کئے تھے۔ ایک سال بعد پاکستان معاہدہ بغداد میں بھی شامل ہو گیا' صدر ناصر نے ان اقدامات کو عربوں کے مفادات کے خلاف تصوّر کیا ان کا خیال تھا کہ اب پاکستان فلسطین کے مسئلے پر اپنی سابقہ پالیسی برقرار نہ رکھ سکے گا۔ لیکن ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ پاکستان نے نہ صرف عربوں کی جدوجہد کا ساتھ دیا بلکہ وہ ایشیا اور افریقہ کی تمام تحاریک آزادی کی بھرپور حمایت کرتا رہا اور بھٹو نے تو ان تنظیموں کے پلیٹ فارم بھی مختلف مظلوم اقوام کی جدوجہد کو تقویت پہنچانے کے لئے استعمال کئے۔ اسوان بند کی تعمیر کے لئے امریکی امداد بند ہونے پر جب صدر ناصر نے سویز کینال کمپنی کو قومیانے کا فیصلہ کیا تو پاکستان نے مصر کے اس حق کو تسلیم کیا کہ وہ ایک آزاد ملک کی حیثیت میں اپنے ملک میں کسی بھی

www.bhutto.org

ادارے کو قومیانے کا مجاز ہے۔ حالانکہ پاکستان کا مفاد سویز کے کھلے رہنے میں تھا۔ کیونکہ اس وقت پاکستان کی 56 فیصد برآمدات اور 49 فیصد درآمدات کا اس آبی گزرگاہ پر انحصار تھا' اس کے باوجود پاکستان نے برملا اعلان کیا کہ صدر ناصر کا نہر سویز کو قومیانے کا فیصلہ جائز اور درست ہے۔ سفارتی محاذ پر پاکستان نے برطانیہ کی طرف سے فوجی حملے' عالمی کنٹرول نافذ کرنے اور ناصر حکومت کا تختہ الٹنے کی کوششوں کے خلاف کام کیا۔ امریکی وزیر خارجہ فاسٹر ڈلس کے ایماء پر لندن میں اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لئے جو کانفرنس طلب کی گئی' پاکستان نے اس میں اپنے مؤقف کا اعادہ کیا اور تجویز پیش کی کہ اینگلو فرنچ اور مصر کے اس تنازع کو پُرامن مذاکرات کے ذریعے حل کیا جائے۔ اس کانفرنس میں پاکستان نے مصر کے اقدام کو جائز قرار دیا۔ مغربی طاقتوں نے اس کانفرنس میں صدر ناصر کو الٹی میٹم دینے کی جو تجویز رکھی تھی پاکستان نے اس کی مخالفت کی اور اسکی کوششوں سے مذاکرات کے دروازے کھلے رکھنے پر اتفاق ہوا

پاکستان نے کھل کر کہا کہ صدر ناصر پر کسی قسم کا دباؤ ڈال کر شرائط تسلیم کرانے کی ہر کوشش یو این کے چارٹر کی خلاف ورزی ہوگی۔ پاکستان نے سویز نہر استعمال کرنے والی اقوام کی تنظیم قائم کرنے کی مغربی تجویز کی بھی مخالفت کی۔ اور کہا کہ نہر استعمال کرنے والے ممالک کو براہ راست مصر سے مذاکرات کرنے چاہئیں' پاکستان اور چند دوسرے ممالک کی کوششوں سے یہ تنظیم قائم نہیں کی جا سکی۔ جب صدر ناصر کے ساتھ مذاکرات ناکام ہو گئے اور مصر پر فرانس اسرائیل اور برطانیہ نے مشترکہ حملہ کیا تو پاکستان کے عوام بیک آواز اٹھ کھڑے ہوئے اور پورے ملک میں اس جارحیت کے خلاف زبردست مظاہرے کئے گئے۔ پورے ایک ہفتے تک حملہ کرنے والوں کی مذمت کی جاتی رہی' یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ حملہ خود پاکستان پر کیا گیا ہو۔ اقوام متحدہ میں پاکستان سرگرمی سے فائر بندی اور حملہ آوروں کے فوری اخراج اور یو این کی ہنگامی فوج کی روانگی کے لئے سرگرم رہا۔ لیکن صدر ناصر پاکستان کی ان سرگرمیوں پر مطمئن نہیں تھے۔ وہ پاکستان سے زیادہ کی توقع کر رہے تھے جو وہ بغداد پیکٹ کی وجہ سے نہیں کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے یو این کی ہنگامی فوج میں پاکستان کی شمولیت قبول نہ کی اور پاکستان کے وزیر اعظم کے دورۂ مصر کو بھی پسند نہ کیا۔ 1958ء میں عراق میں بادشاہت کے خاتمے اور پھر اس کی بغداد پیکٹ سے علیحدگی کے بعد صدر ناصر نے پاکستان کے بارے میں اپنی پالیسی پر نظر ثانی کی اور جب پاکستان میں فوجی حکومت آنے پر وہ سیاست دان منظر سے الگ ہوئے' جن کی پالیسیوں سے ناصر ذاتی طور پر نالاں تھے' اور بھٹو خارجہ پالیسی پر نمایاں انداز میں اثر انداز ہونے لگے تو' مصر اور پاکستان کے تعلقات مزید بہتر ہو گئے۔ 1960ء میں صدر ناصر نے پاکستان کا دورہ کیا اور ایوب خان نے جوابی دورہ کیا تو دونوں ملکوں نے زیادہ قریب سے ایک دوسرے کے مؤقف کو سمجھا۔ قاہرہ میں صدر ایوب کی تقریر درحقیقت بھٹو کے نظریات کی آئینہ دار تھی۔ جس کا وہاں زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ اس تقریر میں مسلمان ممالک کی کمزوریوں کا تجزیہ کیا گیا تھا۔ اور

www.bhutto.org

ان پر غالب آنے کے لئے ترقی پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ اس تجزیئے کو پورے مشرق اوسط میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔

63-1962ء میں مصر اور پاکستان کے تعلقات کا پھر ایک نیا موڑ آیا۔ جب مصر نے پاکستان کی طرف سے سعودی عرب کو بندوقیں اور اسلحہ دینے پر اعتراض کیا۔ مصر کا مؤقف تھا کہ یہ اسلحہ یمن میں مصروف پیکار شرپسندوں کو پہنچایا جاتا ہے۔ جو اسے انقلابیوں اور ان کی حمایت میں لڑنے والی مصری فوجوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ اسلحہ کی فروخت دو حکومتوں کے مابین ایک معمول کا لین دین تھا اور سعودی حکومت بھی اس کی تردید کر چکی تھی کہ وہ یہ اسلحہ یمن پہنچاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جناب بھٹو نے ایک برادر مسلم ملک کے شکوک دور کرنے کے لئے' اسلحہ کی اس فروخت کو بند کرا دیا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ دو مسلمان بھائیوں کے مابین تنازعے میں پاکستان کوئی فریق بنے۔ آگے چل کر پاکستان نے یمن کی انقلابی حکومت کو بھی تسلیم کر لیا۔ اس کے باوجود مصر نے 1962ء میں کشمیر کے مسئلے پر سلامتی کونسل میں افسوسناک رویّہ اختیار کیا' 1964ء میں اس نے بھارت کے ساتھ سپر سانک جہاز بنانے میں باہمی تعاون کا معاہدہ کیا' اس کے باوجود پاکستان مصر کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے کی کوششوں میں سرگرم رہا۔ آخر میں صدر سادات کے زمانے میں مصر کو بھارت کے حقیقی عزائم اور اس کی مسلم دشمنی کا تجربہ ہو گیا۔ ۔ پاکستان اور مصر ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ یہ بھٹو کی مسلسل اور صبر آزما کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ان دونوں ممالک کے باہمی تعلقات میں جب بھی کوئی نازک مسئلہ پیدا ہوا انہوں نے اسے اپنی فراست سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ حل کر دیا۔

سعودی عرب' اردن' شام اور یمن کے ساتھ پاکستان کے گہرے دوستانہ روابط ہیں ان پر کوئی بھی صورتحال اثر انداز نہیں ہو سکی' عراق کے ساتھ ہمارے تعلقات ماضی میں کچھ بدمزگیاں رہی ہیں' لیکن جناب بھٹو نے ان تعلقات کو کافی خوشگوار کر لیا۔ سعودی عرب کے ساتھ ہمارے تعلقات ایک عظیم تاریخی حقیقت ہیں' اور یہ بھٹو کے دور میں جس قدر گہرے اور مثالی رہے' مرحوم شاہ فیصل اور جناب بھٹو کا باہمی تعلق کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ سعودی عرب نے ہر نازک مرحلے پر پاکستان کی فراخ دلانہ مدد کی۔ خاص طور پر 71ء کی تباہ کن جنگ کے صدمے کو برداشت کرنے کے لئے سعودی عرب کی اخلاقی و مالی مدد کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان بھی دفاع سے لے کر دیگر تمام تعمیراتی و ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل میں سعودی عرب سے شاندار تعاون کرتا رہا اور ہزاروں پاکستانی آج اپنی فنی مہارتوں سے اپنے اس برادر ملک کی ترقی میں ہاتھ بٹانے کے لئے دن رات محنت کر رہے ہیں۔ جناب بھٹو کی حکومت نے مختصر سی مدت میں اسلام کی جو قابل قدر خدمات انجام دیں' سعودی حکومت اور عوام اسے بیحد توقیر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ متحدہ عرب امارات کے ساتھ ہمارے برادرانہ تعلقات پوری دنیا میں ایک مثال بن چکے

www.bhutto.org

ہیں۔ شیخ زید بن سلطان النہیان جناب بھٹو کے ذاتی دوست تھے آج لیبیا سے لے کر عرب امارات تک تمام مسلم ممالک پاکستان کی ترقی میں اہم اور فعال کردار ادا کر رہے ہیں' بھٹو نے پہلے بطور وزیر خارجہ اور پھر سربراہ مملکت کے طور پر برادر مسلمان ملکوں کے ساتھ خصوصی تعلقات کی جو بنیادیں رکھی تھیں اور جنہیں اسلامی سربراہی کانفرنس میں مستحکم کیا تھا آج ان پر ایک بلند و بالا اور عظیم الشان عمارت بن چکی ہے۔ عربوں کے باہمی تنازعات میں فریق بنے بغیر پاکستان ان کے اتحاد اور باہمی تعاون کی ہر کوشش کی بھرپور تائید کرتا ہے۔ مصر اسرائیل جنگ کے دوران بھٹو نے ایک بار پھر عربوں کی بھرپور مدد کی اور خود مصیبت میں ہونے کے باوجود مصر اور شام کو قابل قدر مادی امداد فراہم کی۔ تیل کی پابندی کے فیصلوں کا ساتھ دیا اور بعد میں ان کے نرخ بڑھائے گئے تو اپنی ملکی معاشیات پر ناقابل برداشت بوجھ پڑنے کے باوجود مسلمان ملکوں کے اس اقدام کی تائید کی۔

افریقہ میں نو آزاد مملکتوں کا قیام نہ صرف اس عظیم برّاعظم کی بیداری کا پیغام لایا بلکہ اسلامی دنیا کو اس سے ایک نئی تقویت حاصل ہوئی۔ ان نو آزاد مملکتوں میں دو تہائی سے زیادہ مسلم اکثریت رکھتی ہیں۔ یہ ممالک مسلم دنیا کے لئے ایک نئی تقویت لے کر ہی نہیں ابھرے' بلکہ اس سے اسلام کی عالمگیریت کے نظریئے کا عملی ثبوت بھی بہم پہنچا۔ یہ ممالک اسلامی اتحاد و تعاون کے جذبات کو فروغ دینے کے لئے پیش پیش ہیں۔ جو در حقیقت افریقہ ایشیا اتحاد ہی کی ایک صورت ہے۔ یہ ایک ابھرتا ہوا انقلابی برّاعظم ہے۔ بھٹو اس کی اہمیت کا پورا احساس رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اقتدار میں آنے کے بعد پہلی فرصت میں مسلم افریقی ممالک کا طوفانی دورہ کیا۔ اُس ابھرتے ہوئے عظیم برّاعظم کی انقلابی تحریکوں اور عوام کے ساتھ ہمارے تعلقات کی بنیاد فراہم کی ہے۔ یہ رشتہ تیسری دنیا کے ساتھ ہمارے تعلقات کو ایک نئی وسعت اور گہرائی عطا کرتا ہے۔ مستقبل کی انقلابی تحریکوں میں اسلام کو اہم اور مرکزی کردار ادا کرنا ہے۔ اور پاکستان بھٹو کی قیادت میں اس کردار کے لئے پوری طرح مستعد رہا۔ مستقبل کی دنیا کو معاشرتی ناہمواری' نسل پرستی سے مبّرا نظریات' اخوّت' مساوات اور انصاف کی عظیم اقدار کے لئے جدوجہد کرنا ہے۔ اور اس کے لئے اسلام ہی راہنمائی فراہم کرتا ہے' یہی سبب ہے کہ افریقہ میں آج اسلام انقلابی جدوجہد کے لئے قائدانہ کردار ادا کر رہا ہے۔

ہمارے عظیم ہمسائے چین کے ساتھ بھی ہمارے قدیم روحانی رشتے ہیں۔ ماضی میں چینی زائرین اپنے بدھ مت کے مقدس مراکز کی زیارتوں کے لئے پاکستان آیا کرتے تھے۔ جب سنٹرل ایشیا میں اسلام پھیلا تو مسلمان مورّخوں' سیاحوں اور تاجروں نے ان روابط کو مزید مستحکم کیا' بعد میں مسلمان ملاحوں نے ملایا کے راستے چین کے ساتھ براہِ راست رابطہ پیدا کیا اور بحری رابطے سے سے تجارت ہونے لگی۔ خلافتِ عباسیہ کے زوال کے بعد جب ایران کا تجارتی راستہ مسدود ہوا تو کاشغر سے گلگت اور وادیٔ سندھ

www.bhutto.org

سے ہو کر ٹھٹھہ کا نیا تجارتی راستہ دریافت ہوا۔ اس راستے کی دریافت نے برّصغیر کے اس مغربی حصّے کو ثقافتی' سیاسی اور تجارتی طور پر چین اور سنٹرل ایشیا کے مزید قریب کر دیا۔ چین کے شمال مغربی علاقے اور سنکیانگ میں مسلمانوں کی بڑی اکثریت آباد ہے۔ عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ ہمارے گہرے دوستانہ روابط نے چینی عوام کے ساتھ ان تاریخی اور تہذیبی تعلقات کے احیاء کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ یہ رابطہ ماضی میں سامراجی حکمرانوں اور قائداعظم کے بعد مفاد پرست سیاست دانوں کی غلط پالیسیوں کے باعث طویل عرصے تک معطل رہے تھے۔

سوویت روس کی سنٹرل ایشیائی ری پبلکز میں بھی مسلمانوں کی قابلِ ذکر آبادی ہے۔ اس خطے کے مسلمانوں سے برصغیر کے اور زیادہ گہرے اور قدیم رشتے ہیں' اس خطّے سے برّصغیر میں مسلم راج کی بنیادیں رکھنے والے فاتحین آئے تھے۔ آج بھی سمرقند اور بخارا کا ذکر ہمارے شہری اس انداز میں کرتے ہیں' جیسے یہ ان کے اپنے شہر ہوں یہ قدیم رشتے سوویت یونین کے ساتھ ہمارے تعلقات کو بہتر اور زیادہ سود مند بنانے میں اہم کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ایران اور ترکی کے ساتھ ہمارے تعلقات روزِ اوّل ہی سے مثالی رہے ہیں' ان ممالک نے باہمی طور پر ہمیشہ ایک دوسرے کے مفادات کے لئے بڑھ چڑھ کر کام کیا ہے۔ ہم نے ہر مسئلے پر ان کا ساتھ دیا اور انہوں نے ہمارا۔ ایران اور ترکی نے ہمیشہ پاکستان کے ہر مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھا اور پاکستان نے ان ممالک کے ہر مسئلے پر ڈٹ کر ان کا ساتھ دیا۔ دیگر معاہدوں کے علاوہ یہ تینوں ممالک آر سی ڈی کے باہمی معاہدے میں بھی منسلک رہے' جسے جناب بھٹو ایک نئی جہت دینے کی کوشش کرتے رہے۔ قبرص کے مسئلے پر بھٹو نے جو جرأت مندانہ مؤقف اختیار کیا تھا' اس کی وجہ سے ترکی کے عوام کے دلوں میں ہماری قدر و منزلت کئی گنا اور بڑھ گئی ہے۔

بھٹو کے دور حکومت میں انڈونیشیا کے ساتھ بھی پاکستان کے تعلقات ایک بار پھر بہتر ہو گئے۔ اور ملائشیا پہلے سے بھی زیادہ قریب آ گیا۔ اس سرسری سے جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ مسلم دنیا کے ساتھ پاکستان کے خصوصی تعلقات بھٹو کی خارجہ پالیسی کا ابتدا ہی سے مرکزی نقطہ تھے اور مسلم ممالک کے ساتھ باہمی تعلقات کی یہ بنیاد مفاد پرستی کے بجائے خلوص اور ایمان کی مستقل اقدار پر قائم ہے۔ یہ دوستی پاکستان کے خمیر میں شامل ہے۔ پاکستان کے عوام دنیا میں ہر جگہ کے مسلمانوں کے دکھ درد میں فطری طور پر شریک ہوتے ہیں۔ اور ان کی خوشیوں اور مسرّتوں کو اپنے لئے سرمایۂ حیات تصوّر کرتے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو نے اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد کر کے اسلامی اُخوّت اور بھائی چارے کے جذبات اور مسلم ممالک میں باہمی تعاون کی ضرورت کے احساس کو مزید فروغ دیا۔ ان کی خواہش تھی کہ

www.bhutto.org

تمام مسلمان ملک جو ماضی میں سامراجی استحصال کا شکار رہے ہیں' اپنے اپنے جُداگانہ طرزِ حکومت' سماجی واقتصادی نظام اور جغرافیائی و تاریخی مجبوریوں کے باوجود وسیع بنیادوں پر' اپنی عالمی اور باہمی پالیسیوں میں زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک ہم آہنگی پیدا کریں۔ بھٹو شعوری طور پر بڑی دانش مندی کے ساتھ انقلابی بنیادوں پر مسلم ممالک کے باہمی تعاون کے خدوخال اُبھارنے میں قابلِ ذکر کردار ادا کرتے رہے۔ انہیں اس راہ کی دشواریوں اور مشکلات کا پورا احساس تھا اور ساتھ ہی یہ کامل یقین کہ موجودہ صدی میں اسلام کا انقلابی کردار ایک بار پھر اُبھر کر سامنے آئے گا اور اس دکھی دنیا کے لئے یہ دین کامل انصاف' مساوات اور بھائی چارے کا راحت افزا پیغام بن کر پھیلے گا۔

www.bhutto.org

سترہواں باب

خارجہ پالیسی کا معمار

آج کی دنیا میں اگر داخلی پالیسیاں گھر کا نظام چلانے کے مترادف ہیں تو خارجہ پالیسی گھر کے باہر کے امور کو سرانجام دینے کا نام ہے۔ جو لمحہ بہ لمحہ گھر کے حالات پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ مختلف نظاموں' مفادات' اغراض اور تضادات میں تقسیم اس دنیا میں جو چیز سب سے زیادہ پیچیدہ اور گنجلک ہے' وہ ہے مختلف اقوام کے باہمی تعلقات' یہ ایک ایسی سائنس ہے جس کے کلیات بھی بدلتے ہوئے مفادات و تضادات کی پیروی میں ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ ایک کامیاب خارجہ پالیسی چلانے کے لئے ہاتھوں سے پھسلتے لمحوں پر مضبوط گرفت رکھنا لازمی ہوتا ہے اور غیر لچک دار اور جامد اذہان کے لوگ یہ کام نہیں کر سکتے۔ ہماری خوش نصیبی تھی کہ ہمارے رہنما بھٹو اس جدید اور انتہائی پیچیدہ سائنس کے نہ صرف ماہر تھے بلکہ ان کا شمار دنیا کے صفِ اوّل کے ان رہنماؤں میں ہوتا تھا جو خارجہ امور پر اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی دور بین نگاہیں ماضی سے لے کر حال تک تمام دنیا کے حالات کا ایکسرے کر لیتی تھیں۔ افریقہ کے کسی دور دراز گوشے میں بھی کوئی آواز اٹھتی تھی تو بھٹو کو اس کے تاریخی پس منظر حال کے عوامل اور مستقبل پر اس کی اثرانداز کا پورا علم ہوتا تھا۔ انسانیت کی بنتی ہوئی تاریخ کا سائنسی اور تخلیقی مطالعہ ان کا موضوع خاص تھا۔ کسی کی توہین کرنا مقصود نہیں' لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ بعض اوقات کسی خاص واقعے کے معاملے میں متعلقہ ملک کے اپنے راہنما اتنا گہرا اور جامع تجزیہ نہیں کر سکتے تھے جتنا بھٹو پاکستان میں بیٹھ کے کر دیتے تھے۔ اس سلسلے میں قدرت نے انہیں فراخ دلی کے ساتھ چھٹی حس سے بھی نوازا تھا۔ بعض اوقات ان کی پیش گوئیاں کبھی چند ماہ بعد اور کبھی کئی کئی سال بعد لفظ بہ لفظ پوری ہو جاتی تھیں۔ راجر زپلان پر اگست 70ء میں انہوں نے تقریر کے دوران سامراجی مقاصد کا تجزیہ کرتے ہوئے جو پیش گوئیاں کی

www.bhutto.org

تھیں وہ نصف سے زائد من و عن پوری ہوئیں اور باقی کی صداقت کی گواہی بعد کے حالات نے دی' خارجہ پالیسی کی فہم اور اس کی گہرائی پر ان کے عبور کا اندازہ بھٹو کے اس تجزیاتی مطالعے سے کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے کیا تھا۔

انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے نصف اوّل میں امور خارجہ کو طے کرنے کا روائتی طریقہ یہ تھا کہ اس قسم کے علاقائی معاہدہ کر لئے جاتے جن کی چھوٹی قوموں کے تعاون سے بڑی طاقتوں میں ہونے والی گروہ بندیوں کے مابین توازن اقتدار قائم رہ سکتا۔ اس نہایت نازک توازن کو قائم رکھ کر امن کا تحفظ کیا جاتا اور امن میں خلل اس وقت پیدا ہوتا جب اس توازن کا جھکاؤ کسی ایک گروہ کی طرف ہو جاتا۔ ان دنوں چھوٹی قومیں مختلف سیاسی بندھنوں اور جوڑ توڑ کے ذریعے بڑی طاقتوں کی پالیسیوں پر اثرانداز ہو سکتی تھیں۔ یہ طریقہ کار عالمی طاقتوں کے ابھرنے کی وجہ سے اب بدل گیا ہے۔ یہ طاقتیں کلاسیکی معنوں سے بڑی طاقتوں کی خصوصیات رکھنے کے علاوہ بیک وقت بہت زیادہ طاقتور بھی ہیں۔ اور دنیا بھر کے لوگوں کی تقدیروں کی تشکیل پر زیادہ اثرانداز بھی۔ ان طاقتوں کے ظہور نے امورِ مملکت کو سرانجام دینے کے سارے تصوّرات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ چھوٹی قوموں کے لئے ان عالمی طاقتوں کے ساتھ اپنے تعلقات طے کرنے اور اپنے مفادات کو آگے بڑھانے کا کام بیحد مشکل اور پیچیدہ ہو گیا ہے۔ ماضی کی بڑی طاقتوں کی دنیا بہت چھوٹی ہوا کرتی تھی۔ وہ دوسری قوموں پر یلغار کرتیں اور جونہی ان کی قوت پر زوال آتا ان کا قبضہ ختم ہو جاتا۔ ان کا دنیا پر دیرپا اثر باقی نہ رہ سکا۔ یورپی سامراجی طاقتوں کو بھی ایک دوسرے کی اُمنگوں کے خلاف ٹکر کھانی پڑتی جس کی وجہ سے دنیا نہ تو کسی ایک بڑی طاقت کے زیر نگیں آئی اور نہ معاہدوں کے تحت ان کے درمیان تقسیم ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم نے ان روائتی طاقتوں کی کمر توڑ دی تو اس خلا کو پُر کرنے کے لئے دو نئی اور توانا قوتیں آگے بڑھیں یعنی امریکہ جو جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہ کر اس سے کثیر منافع بھی کما چکا تھا اور روس جو جنگ کا شکار ہونے کے باوجود' ایک نئے اور امکانات سے بھرپور نظام کو لے کر نمودار ہوا تھا۔ ان دونوں طاقتوں نے جنگ سے نڈھال اقوام پر دباؤ ڈال کر اپنے مفادات کو آگے بڑھایا اور مغرب میں برلن اور وسطی یورپ تک ایک دوسرے کے سامنے آ گئیں۔ مشرق میں روس بحرالکاہل تک آ گیا اور امریکہ نے جاپان اور فلپائن میں اپنا دخل جمایا اور جنوب مشرقی ایشیا میں دم توڑتی فرانسیسی سلطنت کو بھی سہارا دیا۔ چونکہ یہ دونوں ممالک رائج سیاسی مفہوم میں استعماری ملک نہیں تھے' جو غیر ممالک پر براہ راست قبضوں کے قائل ہوں' لہٰذا اس وجہ سے ایک نئی قسم کی کشمکش وجود میں آئی۔ یہ جدید استعماریت کا آغاز تھا۔ جس کے تحت چھوٹے ممالک پر قبضہ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی بسامراج کا اصل مقصد نو آبادیوں کے وسائل کا استحصال تھا۔ ماضی میں اس کا طریق جداگانہ تھا۔ لہٰذا "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کا اصول چلتا تھا۔ لیکن استحصال کی نئی ضرورتوں کے تحت یہ

www.bhutto.org

اصول بدل کر "ملاؤ اور حکومت کرو" ہو گیا۔ اب یہ طاقتیں اپنے بلاک بنا کر چھوٹی قوموں کی منڈیوں کو یوں منظم کرنے لگیں کہ استحصال کے کام میں سہولت پیدا ہو جائے۔ بڑی منڈیاں مغرب کے ترقی یافتہ ممالک کے لئے زیادہ نفع بخش برآمد و درآمد کی شرائط مہیا کرتی ہیں۔ یہ ترقی یافتہ ممالک مل کر خام مال کے نرخ مقرر کرتے ہیں۔ کرنسیوں کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔ اپنے تیار مال کے نرخ اور فنی مہارت کی خدمات کا معاوضہ بڑھاتے ہیں اور اس طرح استحصال کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔ چھوٹے ممالک پیداوار بڑھا کر اور ماضی کے مقابلے میں زیادہ برآمدات کر کے بھی غریب رہتے ہیں۔ اور اس کے برعکس ترقی یافتہ ممالک اپنی مصنوعات اور فنی خدمات کے معاوضوں میں اضافہ کر کے مزید دولت کماتے ہیں۔ چھوٹی اقوام تجارت سے اپنے ترقیاتی منصوبوں تک ہر معاملے میں ان بڑی طاقتوں کے زیر اثر ہوتی ہیں۔ موجودہ دور میں اصل مسئلہ یہ ہے کہ (وہ اپنے معاملات کو اس مقصد سے کس طرح سرانجام دیں کہ ان کے بنیادی مفادات کا تحفظ بھی ہو' ان کی علاقائی سالمیت بھی برقرار رہے اور وہ بڑی طاقتوں کے ساتھ اپنے تعلقات میں اپنی خود مختاری بھی برقرار رکھ سکیں۔)

عالمی طاقتوں اور چھوٹی قوموں کے مابین تعلقات کی سطح مساوی نہیں۔ یہ طاقتیں ان چھوٹے ملکوں سے معاملہ کرتے وقت خود تو بے شمار رعائتیں حاصل کر لیتی ہیں اور جواباً چھوٹے ملکوں کو برابر تو کیا معقول رعایات بھی نہیں دیتیں۔ کسی چھوٹے ملک کے لئے ممکن نہیں کہ وہ محض حق و انصاف کے تقاضوں کا حوالہ دے کر' اپنے مفادات کو آگے بڑھانے کے لئے ان عالمی طاقتوں پر اثر انداز ہو سکے۔ یہ طاقتیں اپنے بے مہر مفادات کے تحت ہی اپنی پالیسیاں تشکیل دیتی ہیں۔ ان میں چھوٹی قوموں کے مفادات کا کوئی دخل نہیں ہوتا لیکن بھٹو اس تجزیئے کے باوجود یہ نقطہ نظر رکھتے تھے کہ چھوٹی قوموں کو چاہئے کہ وہ صورت حال کے اس جبر کو بلا چون و چرا تسلیم کر لینے کے بجائے اپنے معاملات ہوشیاری اور دانش مندی سے سر انجام دے کر اپنی آزادی برقرار رکھیں اور عالمی طاقتوں کے ساتھ اپنے تعلقات کے سلسلے میں عمل کی لچک قائم رکھیں۔ وہ اس چیز کے خلاف تھے کہ کسی ایک عالمی طاقت کے مفادات کے تحت اس سے وابستہ ہو کر' دوسری عالمی طاقتوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ وہ یہ تسلیم کرتے تھے کہ بعض اوقات مشترکہ مفادات اور واقعات کا رُخ کسی چھوٹی قوم کے لئے لازم کر دیتا ہے کہ وہ کسی ایک عالمی طاقت کے ساتھ زیادہ قریبی روابط استوار کرے۔ لیکن ساتھ ہی دو طرفہ تعلقات کی بنیاد پر معمول کے مطابق تعلقات قائم رکھے جائیں۔ وہ کسی بھی چھوٹی قوم کے کسی عالمی طاقت کے ساتھ تصادم کی پالیسی کے خلاف تھے۔ ان کی رائے تھی کہ تنازع کی صورت میں متعلقہ عالمی طاقت کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے تنازع کی حدود معین کر لی جائیں۔ اور اس کے ساتھ ایک ایسا قابلِ عمل اور متوازن رابطہ قائم کیا جائے کہ متصادم مفادات الگ تھلگ ہو سکیں۔ متصادم مفادات کا یوں الگ کر دینا دو طرفہ اور محتاط بنیادوں پر ہونا چاہئے۔ اور

www.bhutto.org

روک تھام کی سیاست کے اصول پر خود کو مداخلتوں سے محفوظ رکھنا چاہئے۔ لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو تو بھٹو کا خیال تھا کہ لیت و لعل کی پالیسی اختیار کر کے مستقل بحران کا شکار ہونے سے بہتر ہے کہ مداخلت کے خلاف واضح مؤقف اختیار کر کے ایک سخت اور فوری بحران کو قبول کر لیا جائے۔ ان کا قول تھا کہ "دباؤ" کیڑا بھی ہے اور بلا بھی۔ اگر آپ اسے پاؤں کے نیچے مسل دیں تو یہ کیڑا ہے لیکن اگر آپ جھک کر پیچھے ہٹ جائیں تو یہ بلا بن جاتا ہے۔"

دوسرے لفظوں میں کسی عالمی طاقت کے خلاف صف آرائی سے گریز کرنا چاہئے اور اگر یہ ناگزیر ہو جائے تو پھر بھٹو صورت حال کا فوراً اور مردانہ وار مقابلہ کرنے کے قائل تھے۔ تاخیر اور تذبذب کی پالیسی کو وہ چھوٹی اقوام کے لئے زہر قاتل تصوّر کرتے تھے۔

بنیادی طور پر وہ تصادم کی پالیسی اختیار کرنے کے بجائے مذاکرات اور روک تھام کی سیاست کے قائل تھے۔ تیسری دنیا کے ابھرتے ممالک اور مشرق اوسط کے مالدار ممالک کے اتحاد اور استقامت کے ساتھ نیم عالمی طاقتوں کا دو طرفہ بنیادوں پر تعاون بھی ان کے نزدیک عالمی طاقتوں سے معاملات طے کرنے میں ایک کارگر ہتھیار ثابت ہو سکتا ہے اس طرح اصولوں کے واسطے یا وفاداریوں کے بے معنی حوالے دینے کے بجائے ٹھوس خارجی حالات پیدا کر کے عالمی طاقتوں کو اپنا مؤقف بدلنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ باالفاظ دیگر ترقی پذیر اقوام مشترکہ طور پر مل کر متعلقہ عالمی طاقت کے کسی بڑی مفاد کو چیلنج کر دیں تو وہ لازماً اپنے چھوٹے مفاد کو نظر انداز کر کے ایک چھوٹی قوم کے ساتھ دو طرفہ سمجھوتہ کر سکتی ہے۔ اس کی ایک مثال مشرق اوسط کے مسئلے پر عربوں کی طرف سے تیل کی پابندیاں تھیں۔ جس کی وجہ سے نہ صرف بہت سی نیم عالمی طاقتوں کو اپنا دیرینہ مؤقف بدلنا پڑا بلکہ امریکہ کو بھی اسرائیل کی حمایت کے سلسلے میں انتہا پسندانہ پالیسی پر نظر ثانی کرنی پڑی۔ یہ ترکیب چھوٹے ممالک کے ثمر اور تعاون کی بہترین مثال تھی۔ بھٹو کے نزدیک سیاسی تصادم کے پہلوؤں کو نظر انداز کر کے چھوٹی قوم اصل تنازعات کے سوا باقی معاملات میں عالمی طاقتوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھ سکتی ہے۔ اس صورت میں وہ عالمی طاقت جس کے مفادات اس چھوٹی قوم سے متصادم ہوں' اس کے دوسری عالمی طاقت کے ساتھ اچھے تعلقات پر معترض نہیں ہو سکتی۔ جس کے ساتھ اس کے اپنے مفادات ہم آہنگ ہوں۔ نہ ہی مفادات سے متصادم طاقت اس چھوٹی قوم کے قومی مفادات میں مداخلت کرنے کا جواز تلاش کر سکتی ہے۔ کیونکہ ان کے معمول کے باہمی تعلقات کسی قسم کی پیشگی شرائط کے بغیر قائم ہوں گے۔

ہمارے معاملے میں دو عظیم کمیونسٹ طاقتوں روس اور چین کے ساتھ تعلقات کا مسئلہ بیحد نازک ہے۔ اگر یہ دونوں عظیم ممالک متحد ہوتے تو آج دنیا کمیونسٹ ممالک اور امریکی بلاک میں تقسیم ہوتی۔ اس تقسیم میں چین کو ثانوی حیثیت ملتی جو شاید برطانیہ کی طرح اسے قبول نہیں۔ اس طرح چین کی وجہ سے

www.bhutto.org

دنیا کی مساوی تقسیم ممکن نہ ہو سکی۔ سیاسی بلندیوں پر یہ سہ طرفہ تضاد دنیا کے لئے حد درجہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی وجہ سے چھوٹی قوموں کو اپنی خود مختاری اور مفادات کے تحفظ کے لئے بہتر مواقع میسر آئے ہیں۔ چین اور روس کی مناقشت نے روسی دباؤ کو کم رکھا ہے' جو امریکہ کے لئے سود مند ہے' یورپ میں امریکہ کے مفادات کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہاں روس ہی ان کے لئے خطرہ بن سکتا ہے۔ جب کہ چین کی طرف سے وہاں کوئی خطرہ نہیں امریکہ نے ویت نام سے فوجیں نکال کر چین کے ساتھ نئی قسم کے تعلقات کی ابتدا کر دی۔ مشرقِ اوسط میں بھی امریکہ کا تصادم چین کے بجائے روس سے ہے۔ بھٹو نے بہت پہلے ان ٹھوس وجوہ کی بناء پر ان تین عالمی طاقتوں کے سہ طرفہ تعلقات کا اندازہ کر لیا تھا۔ انہی سہ طرفہ تضادات کا پورا تجزیہ کر کے انہوں نے ان تینوں بڑی طاقتوں کے ساتھ دو طرفہ بنیادوں پر پاکستان کے قومی مفادات کی روشنی میں تعلقات کی بنیاد رکھی چین کے ساتھ ہمارے بیشتر مفادات ہم آہنگ ہیں اس کے ساتھ ہمارا کوئی تنازعہ نہیں۔

بھارت کے ساتھ مختلف تنازعات ہیں اس نے ہمیشہ کھل کر ہمارا ساتھ دیا۔ اس کے ساتھ ہماری دوستی کسی دوسری عالمی طاقت کے مفادات کی مخالفت پر مبنی نہیں۔ لہٰذا یہ ایک بہترین کار آمد دوستی ہے۔ امریکہ کے ساتھ بھی ہمارے تعلقات دوستانہ ہیں۔ وقت اور تجربے نے ظاہر کر دیا ہے کہ چین کے ساتھ ہمارے تعلقات امریکہ کی مخالفت پر مبنی نہیں تھے۔ ہم نے صرف اصولوں پر چین کی حمایت کی۔ اور یہ ایسی حمایت تھی جس پر امریکہ کو معترض ہونے کا کوئی حق نہیں تھا۔ سوویت روس کے ساتھ گذشتہ جنگ میں جو کشیدگی پیدا ہو گئی تھی بھٹو نے اسے پہلی فرصت میں ختم کرنے کے لئے روس کا دورہ کیا۔ بعد میں روس بہتر طور پر ہمارے ہمسایہ کو سمجھنے لگا۔ یہ تعلقات بھی قدم بہ قدم بہتر ہو رہے ہیں۔ روس کی مدد سے قائم ہونے والی پاکستان میں پہلی سٹیل مل باہمی تعاون کو مزید آگے بڑھانے کا ذریعہ بنی۔ اس طرح بھٹو نے نہایت ہی قلیل مدت میں ان تینوں بڑی طاقتوں کے ساتھ پاکستان کے غیر متوازن تعلقات کو بڑی دانش مندی سے قابل عمل متوازن تعلقات میں بدل دیا۔ زیادہ دوست طاقتیں ہم پر اعتماد کرنے لگیں اور کم دوست طاقتیں زیادہ دوستی کی طرف بڑھنے لگیں۔

ان عظیم طاقتوں کے علاوہ نیم عالمی طاقتوں کے ساتھ ہمارے تعلقات کافی زیادہ اچھے ہو گئے خاص طور پر فرانس کے ساتھ ہمارے تعلقات کافی خوشگوار ہو چکے ہیں۔ یورپ میں فرانس کی اہمیت کون نہیں جانتا اس کی دوستی ہمارے لئے کافی تقویت کا باعث بنی۔ اور پاکستان کو توانائی کی جس قلت کا سامنا ہے اسے دور کرنے کے لئے ایٹمی توانائی حاصل کرنے کی غرض سے قائم ہونے والے ایٹمی بجلی گھروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے فرانس نے ہمیں ری پروسیسنگ پلانٹ دینے کا وعدہ کیا ہے' ماضی میں بھی

www.bhutto.org

فرانس نے پاکستان کے حق پرستانہ مؤقف کی کئی مرتبہ حمایت کی ہے' 65ء کی جنگ کے بعد جب امریکہ نے پاکستان کو اسلحہ کی سپلائی پر پابندی عائد کر دی تھی تو فرانس نے ہمارے مسائل کو ہمدردانہ انداز میں سمجھا تھا۔ مغربی جرمنی اقتصادی و صنعتی طور پر "یورپ کا مرد توانا" بن کر اُبھرا ہے۔ امریکہ کے ساتھ گہرے روابط کا پابند ہونے کے باوجود اس کی اقتصادی پالیسیاں کافی آزادانہ ہوتی ہیں۔ جناب بھٹو نے جرمنی کی اس اہمیت کے پیش نظر اس کے ساتھ بھی بہت اچھے تعلقات اُستوار کر لئے۔

مجموعی طور پر اب یورپ میں باہمی اتحاد و تعاون کی ایک نئی رو چل رہی ہے اور سپر پاورز میں تقسیم شدہ اس دنیا میں دوسری عالمی جنگ سے تباہ شدہ معیشت کو سنبھالا دینے کے بعد' یورپ اپنے لئے زیادہ مؤثر اور فعال کردار تلاش کر رہا ہے۔ اس کا نمایاں اظہار اس نے عرب اسرائیل جنگ کے دوران امریکہ سے مختلف پالیسی اختیار کر کے کیا تھا۔ ہم ایشیا والے یورپ کی اس نئی ابھرتی تمنا کے نتائج کا اندازہ کرتے ہوئے اگر ابھی سے اس کی جانب تاریخ کے نئے شعور کی روشنی میں آگے بڑھیں تو یہ مستقبل کے لئے بہتر ہو گا۔ ماضی میں ایشیا پر یورپ کے غلبے کی وجہ سے ان دونوں براعظموں کے مابین اختلافات زیادہ رہے ہیں۔ ماضی کے تعلقات استحصال کنندہ اور مستحصل کے تعلقات تھے' جو ظاہر ہے مفاہمت کے بجائے تنازعات کو جنم دیتے ہیں۔ لیکن مساوی غلبے کا وہ دور گزر چکا ہے۔ اب یورپ اور ایشیا میں اشتراک و مشابہات کی تلاش کا دور ہے' برطانیہ میں اسلامی فلسفے و تاریخ کو سمجھنے کے لئے شاندار کانفرنسوں اور نمائندوں کا انعقاد اسی جذبے کی نشاندہی کرتا ہے۔ فرانس نے تیسری دنیا میں زیادہ اہمیت اختیار کر لی ہے۔ مستقبل میں یورپ اور ایشیا کے درمیان اشتراکِ عمل دنیا کے حالات کو زیادہ خوشگوار' کشادہ اور بہتر بنانے کے اچھے امکانات رکھتا ہے۔ بھٹو نے اس صورت حال کا اندازہ کرتے ہوئے 1965ء میں لکھا تھا۔

> "آنے والے سال مشترکہ مفاد کی وسعت ظاہر کریں گے۔ یہ وسعت اس وقت زیادہ واضح ہو جائے گی جب بڑی طاقتیں یورپ اور ایشیا میں حالات کے بدلتے ہوئے حوالوں کی روشنی میں اپنے مقاصد کو از سر نو واضح اور مرتب کریں گی۔ جب حاکمیت کو متحدہ مقابلے کا سامنا کرنا پڑے گا اور جب سائنس کی زمین میں اقتصادی اور معاشرتی حالات سے پھوٹنے والے واقعات کے عام تانے بانے میں نئے میدان سَر ہوں گے۔"

جب بھٹو نے اس توقع کا اظہار کیا تھا عالمی گروہ بندیوں اور توازن کے پرانے انداز نمایاں تھے۔ لیکن اب یہی بات منظر عام پر آ چکی ہے۔ ہلسنکی کانفرنس اور توانائی کے بحران نے مستقبل کے امکانات کو تہہ سے نکال کر سطح پر پہنچا دیا ہے۔ بھٹو نے ان بدلتے تاریخی حقائق کی روشنی میں پورے مناظر کو پیش نظر

www.bhutto.org

رکھتے ہوئے پاکستان کی خارجہ پالیسی کو ہمیشہ متحرک رکھا۔

عالمی طاقتوں، نیم عالمی طاقتوں اور دیگر ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ تعلقات اس وقت تک صحیح طور پر فائدہ مند نہیں ہوتے جب تک ہمسایوں کے ساتھ تعلقات بہتر اور منصفانہ نہ ہوں۔ ماضی میں ہمیں بھارت کی طرف سے ہمیشہ ناانصافی کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس میں ہماری اپنی کوتاہیوں کا دخل بھی رہا ہے۔ ایسے حکمران جو غیر منصفانہ نظام کے نمائندے اور عوام سے کٹے ہوئے تھے۔ ایک بڑے ہمسائے کی ناجائز خواہشات کا مقابلہ کرنے کے اہل نہیں تھے۔ بھارت سے یہ توقع کرنا غلط تھی کہ وہ ہماری کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کے بجائے منصفانہ رویہ اختیار کرے گا۔ عالمی سیاست میں یہ رواج نہیں کہ مخالفانہ مفادات رکھنے والے دو ملکوں میں سے ایک دب سکتا ہو تو دوسرا اسے دبانے سے گریز کرے۔ لیکن بھٹو کے دور میں صورت حال باقی نہ رہی۔ بھٹو نے اپنے ساڑھے پانچ سالہ دور میں بھارت کو باور کرا دیا کہ وہ پاکستان کے عوام کی امنگوں کے ترجمان ہیں اور عوام کسی قسم کی بالادستی، عدم مساوات اور ناانصافی برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ لہٰذا اب بھارت کو لازمی طور پر حقیقت پسندی سے کام لینا پڑے گا چنانچہ اس کے ساتھ تعلقات بتدریج بہتر ہوتے چلے گئے۔ لیکن بہتری کی جانب بڑھنے والے ہر قدم کے ساتھ بھٹو یہ یاد دلانا کبھی نہیں بھولتے کہ کشمیر کا تنازعہ ابھی طے ہونا باقی ہے۔ اور پاکستان اپنے دیرینہ مؤقف پر کاربند ہے اسی زمانے میں افغانستان کے ساتھ بھی انہوں نے مکالمے کا آغاز کیا جس کے مثبت نتائج پیدا ہوئے۔ باقی ہمسایوں کے ساتھ ہمارا کسی قسم کا کوئی تنازعہ نہیں تھا۔ عالمی تنازعات پر بحث کرتے ہوئے ہمسایہ ممالک کے ساتھ تعلقات کا از سر نو سرسری جائزہ اسی لئے لینا پڑا کہ جو قوم قریب ترین ہمسایوں کے ساتھ موافقت پیدا نہیں کر پاتی اس کے لئے دور اُفتادہ اقوام کے ساتھ باہمی مفاہمت تک پہنچنا اور زیادہ مشکل ثابت ہوتا ہے۔ کسی قوم کے بین الاقوامی رابطوں میں پختگی اور لچک سے اندازہ کیا جاتا ہے جو وہ اپنے ہمسایوں کے معاملے میں روا رکھتی ہے۔ جغرافیائی حالات آج بھی تمام حالات سے زیادہ ٹھوس حقائق پر مبنی ہیں۔ جغرافیائی تنازعات ہمیشہ پڑوسیوں میں اٹھتے ہیں اور کشیدگی کا باعث بنتے ہیں۔ قربت کی وجہ سے اور باہمی تعلقات میں وسعت کی بدولت بھی ہمسایہ ممالک کی خارجہ پالیسیوں میں اختلاف اور شدت پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ بلکہ ان کے مابین طرح طرح کے روزمرہ کے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وہ دائرہ عمل ہے جہاں کسی قوم کے راہنماؤں کی اہلیت و قابلیت کا اظہار ہوتا ہے۔ بھٹو نے خارجہ پالیسی کے اس دوامی عنصر کو پوری طرح سمجھتے ہوئے اپنی پالیسیاں مرتب کیں یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ دنیا جغرافیائی حقیقت پہلے ہے اور تاریخی حقیقت بعد میں۔ یہ بات پڑوسیوں پر ہی نہیں براعظموں پر بھی صادق آتی ہے۔

بحیرہ روم سے خلیج بنگال تک پھیلے ہوئے علاقے کے بارے میں حقائق کی تفصیلات جاننے اور ان کا تجزیہ کرنے کے بعد جناب بھٹو نے ماضی کے حکمرانوں کے اس مغالطہ آمیز تصور کو رد کیا۔ کہ انہوں

www.bhutto.org

نے تمام بین الاقوامی مسائل کے بارے میں خارجہ پالیسی کی عمارت 'قدروں اور رویے کی ایک مشترکہ بنیاد پر اُستوار کی ہے۔ ماضی میں پاکستان مختلف اقوام سے معاملہ کرتے وقت اپنی شخصیت کے صرف ایک پہلو کو سامنے رکھ کر صف آراء رہا یا پھر یوں کہہ لیجئے کہ ماضی کے حکمران جس ایک پہلو کو مکمل قومی شخصیت تصوّر کرتے رہے وہی نمایاں رہی اس کا نتیجہ اتنا ہی مایوس کن بر آمد ہوا جتنا کسی سراب پر رکھی گئی تمنا کا ہو سکتا ہے۔ ان ناکامیوں کے باوجود کبھی ماضی کے حکمرانوں کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ بنیادی مؤقف پر نظر ثانی کر لیں سبب یہ تھا کہ وہ اپنے ارد گرد ایسے جامد عقائد اور خیالات کی فضا پیدا کر چکے تھے جس سے باہر نکلنا ان کے اپنے بس کی بات بھی نہیں رہ گئی تھی۔ جناب بھٹو نے اقتدار میں آتے ہی اس غیر منطقی فضا سے پاکستان کی چوطرفہ خارجہ پالیسی کو آزاد کرالیا۔ چونکہ بھارت دوطرفہ تعلقات پر مُصر تھا لہٰذا انہوں نے کہہ دیا کہ ہم سب سے پہلے بھارت کے ساتھ دوطرفہ تعلقات و مذاکرات کی بنیاد پر تمام مسائل حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ جیسا کہ انہوں نے شملہ اور دھلی میں کیا۔ دوطرفہ تعلقات میں سب سے بڑا مسئلہ اپنے مُوقف کو کامیابی و مؤثر انداز میں پیش کر کے منوانے کا ہوتا ہے اور جناب بھٹو اس ضمن میں دنیا کے صفِ اوّل کے راہنماؤں میں شامل تھے لہٰذا انہیں اس میں کیا جھجک ہو سکتی ہے۔ اپنی صلاحیتوں پر بھرپور اعتماد کے باوجود دوطرفہ تعلقات میں یہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ دوسرا فریق ہر مرحلے پر معقولیت اور استدلال سے کام لے گا۔ اس امکان کے پیش نظر بھٹو نے دوسرے طریقوں کے امکان کو کبھی بھی رَدّ نہیں کیا۔ انہوں نے اقوام متحدہ کے چارٹر اور دیگر عالمی حقوق کے تحت اپنے اختیارات کار کو ہمیشہ آزاد رکھا۔ بھارت کے ساتھ دوطرفہ تعلقات و مذاکرات کی پالیسی کے برعکس انہوں نے مسلم مشرق اوسط کے ساتھ مختلف الاطراف تعلقات کی پالیسی اختیار کی۔ اس طرح وہ دو مختلف منطقوں میں واضح طور پر پاکستان کی قومی شخصیات کے دو مختلف پہلوؤں کو روبہ عمل لائے اس لئے کہ ان دو علاقوں میں اقتصادیات سیاسیات اور عقائد وسیع پیمانے پر مختلف تھے۔

دو بڑی طاقتوں کے حوالے سے انہوں نے خصوصی پالیسی وضع کی اور جہاں تک چین کا تعلق ہے انہوں نے قریبی تعاون اور اتحاد سے ملتی جلتی مشاورت کی پالیسی اختیار کی۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک دونوں جگہ مخالفین کے لئے ان کے نپے تلے اقدامات ایسے پیچیدہ اور ہکا بکا کر دینے والے تھے کہ وہ انہیں "چیستان بھٹو" کے نام سے یاد کرنے لگے۔ جس کا دوسرے معنوں میں یہ مطلب تھا کہ جناب بھٹو نے ان کی کلاسیکی توقعات کو غلط ثابت کر دکھایا ہے اور ان کے فیصلوں پر برتری حاصل کر لی ہے۔ با الفاظ دیگر ان کی پالیسیوں کے دام میں آنے سے انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ۔

بر واپس دام بر مرغ دگرنہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

www.bhutto.org

1965ء میں انہوں نے ایک "مثبت عنصر" کا نظریہ آگے بڑھایا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی طویل عرصے تک پاکستان کو اپنی اقتصادی ترقی اور اپنے تحفظ کے لئے ایک مثبت عنصر کی ضرورت ہو گی۔ اس زمانے میں انہوں نے چین کو مثبت عنصر قرار دیا تھا۔ مگر جب وہ برسر اقتدار آئے تو انہوں نے بین الاقوامی اتحاد کے لئے کہیں زیادہ وسیع تر اُفق کا تصوّر کیا۔ اور بحیرۂ روم سے لے کر پاکستان کی سرحدوں تک وسیع و عریض علاقہ ان کے لئے گویا ایک فصیل و پشت پناہ کی حیثیت میں پھیلا ہوا تھا۔ اور ایک دفاعی حصار کی امکانی صورتیں پیدا کر رہا تھا۔ اس عظیم ڈھانچے کے اجزاء ترکیبی میں نہ تو توازن تھا اور نہ ان کے مفادات و نظریات میں ہم آہنگی تھی۔ ضرورت ایک ایسے ماہر فن کی تھی جو انہیں باہم یکجا کر کے ایک سیسہ پلائی دیوار کے سانچے میں ڈھال سکے۔ یوں تو وہ بہت سے ملکوں بشمول بھارت سے دو طرفہ روابط کی حکمتِ عملی پر کاربند تھے۔ لیکن دوسری طرف انہوں نے بیڑا اٹھایا کہ وہ برسوں سے خارجی غلبہ اور استحصال کے شکار شرق اوسط کو جو قدرتی وسائل سے مالا مال ہے تمام رکاوٹیں ہٹانے میں مدد دیں گے۔ اس مقصد کے تحت انہوں نے مختلف اطراف سے ان تک رسائی حاصل کی ان کے مخالفین بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس خطّے میں انہوں نے ایک طرف قدامت پرست اور سوشلسٹ عرب ملکوں اور دوسری طرف عرب اور غیر عرب ملکوں کے درمیان غلط فہمیوں اور خدشات کا ازالہ کر کے انہیں سیاسی طور پر قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے آزادانہ علاقائی تعاون کے ایک نئے تصور کو متحرک کیا۔ جس نے علاقائی اشتراک کے محدود عمل کو' جس کی بنیاد پر آر سی ڈی کا قیام عمل میں لایا گیا تھا مزید لامحدود وسعت دے دی۔ اور علاقائی اتحاد کی اس توسیع سے نہ صرف آر سی ڈی کو تازہ قوّت ملی بلکہ ترقی پذیر قوموں کے آزادانہ طور پر علاقائی تعاون کا ایک ایسا تصوّر صورت پذیر ہونے لگا۔ جس کی صلاحیت اور فوائد بے پناہ ہیں' اس کے نتیجے میں مشرق اوسط بالخصوص اور اسلامی دنیا بالعموم طاقت کے ایک نئے احساس کا شعور کرنے لگی۔ ایسی طاقت جو طویل عرصے سے اس کی گرفت میں آنے سے گریز کر رہی تھی۔

دو نظاموں میں تقسیم شدہ اس دنیا میں پاکستان ایسی نظریاتی مملکت کی خارجہ پالیسی مرتب کرنا جو وسائل اور ترقی کے لحاظ سے نچلی سطح پر ہے' جو اپنا جداگانہ نظریۂ حیات رکھتی ہے' ایک ایسا نیا اور انوکھا تجربہ ہے۔ جس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ ہمیں ان دو برسرپیکار نظاموں کے درمیان رہ کر جنہیں جدید سائنسی، تکنیکی تنظیم اور زبردست وسائل کی قوت حاصل ہے۔ اپنی پسماندگی کے باوجود ایک آزادانہ اور باوقار مقام حاصل کرنا ہے۔ ہمیں اپنے تاریخی ارتقاء کی سطح اور تہذیبی روایت کے مطابق ایک بینظیر طریقے سے ترقی و خوشحالی کی منزل کی جانب پیش قدمی کرنا ہے۔ یہ راہ پیچیدہ بھی ہے اور دشوار

www.bhutto.org

بھی' یہ کامرانیوں اور ناکامیوں سے بھری ایک طویل راہ ہے۔ یہ سخت جدوجہد کی راہ ہے' لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر خدا کے فضل و کرم سے ہمیں مزید دس پندرہ برس تک ذوالفقار علی بھٹو کی عظیم قیادت کا سرمایہ حاصل رہتا تو ہماری اور آپ کی زندگیوں کے دوران ہی وہ پاکستان کو ایسا مثالی ملک بنا کر دکھا دیتے جو دیگر اسلامی ملکوں کے لئے اور تیسری دنیا کے ممالک کے لئے ایک رہنمایانہ کردار کا حامل ہوتا۔

www.bhutto.org

اٹھارواں باب

اپوزیشن کا کردار

اقتدار میں آنے کے بعد جناب بھٹو نے یہ سوچا تھا کہ ملک و قوم کے ساتھ سانحہ عظیم گزر جانے کے بعد اپوزیشن ماضی کی سیاسی روایات کو ختم کر کے' جو ملک کی تباہی کا باعث بنی تھیں' نئی قومی امنگوں سے سرشار ہو کر شاید تعمیری انداز میں اختیار کر لے گی۔ اس خیال کے تحت انہوں نے از خود پیش عملی کی اور ماضی کی تمام انتخابی تلخیوں کو فراموش کر کے اس کی طرف بنیادی قومی امور میں دست تعاون بڑھایا۔ یہاں تک کہ عبوری آئین اسمبلی میں پیش کیا گیا تو رائے عامہ اور قومی اسمبلی کے ممبران کی اکثریت مارشل لاء کو مستقل آئین کے نفاذ تک برقرار رکھنے کے حق میں تھی۔ لیکن جناب بھٹو نے از خود اپوزیشن کے کردار کو بامعنی بنانے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ تعاون کی فضا میں مخالفین پر کسی حد تک اعتقاد کرتے ہیں از خود مارشل لاء ختم کرنے کا اعلان کر دیا' بعد میں مستقل آئین کی تیاری میں بھی انہوں نے وسیع تر قومی مفاد کی خاطر اپوزیشن سے تعاون حاصل کیا۔ لیکن تجربہ جناب بھٹو کو بتاتا جا رہا تھا کہ ان لوگوں نے قومی مفادات کے تحت اختیار کئے گئے اس نرم اور پُر تعاون رویے کو ان کی کمزوری پر محمول کیا ہے اور یہ لوگ اپنی پرانی اور تباہ کن طرز سیاست کو ترک نہیں کر سکے۔ اس طرح سیاست کا ہلکا سا جائزہ لے لیا جائے تو اہل وطن کو اندازہ ہو گا کہ یہی وہ طرز سیاست تھی جس نے قائداعظم کی وفات کے بعد عوام کو یکسر ملکی امور سے بے تعلق کر دیا تھا اور آخر کار ملک کا شیرازہ منتشر کرنے کے اسباب مہیا کر دیئے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد پہلا سال تو اس ملک کے لئے ریاستی مشینری وجود میں لانے پر ہی صرف ہو گیا۔ 11 ستمبر 1948ء کو بابائے قوم ہم سے جدا ہو گئے۔ پاکستان کا دستور بنانے اور قومی اسمبلی کا کردار ادا کرنے کے دوہرے مقصد کے لئے ایک اسمبلی تشکیل دے لی گئی تھی' جس کا پہلا اجلاس یوم آزادی سے

www.bhutto.org

چار روز قبل منعقد ہوا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قائداعظم دستور سازی کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔ ان کے بعد یہ تمام ذمہ داریاں لیاقت علی خان پر آ پڑی تھیں۔ یہ درست ہے کہ اس وقت بھی دستور سازی کے معاملے میں انتہا پسند مذہبی گروہ' علاقائی مسائل' زبان کا سوال اور مرکزی و صوبائی اختیارات کے معاملات الجھاؤ پیدا کر رہے تھے۔ لیکن یہ مسائل تقریباً دنیا کے ہر ملک میں پیدا ہوتے ہیں' ان پر مفاہمتیں کی جاتی ہیں' قابل عمل سمجھوتے وجود میں آتے ہیں' لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی ملک اپنے آئین ہی سے محروم رہے' لیکن ہماری دستوریہ نے تقریباً دو سال کے عرصے میں صرف ایک قرارداد مقاصد پاس کرنے میں کامیابی حاصل کی' جو مستقبل کے دستور کے لئے صرف چند اساسی اصول فراہم کرتی تھی۔ قرارداد مقاصد پاس کرتے ہی دستوریہ نے تمام جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک بنیادی اصول کمیٹی تشکیل دے دی جو آئین سازی کے سلسلے میں ابتدائی رپورٹ مرتب کرے۔ اس کمیٹی نے اہم مسائل طے کرنے کے لئے تین کمیٹیاں تشکیل دیں۔ 28 ستمبر 1950ء کو اس اصولی کمیٹی نے مستقبل کے آئین کا خاکہ مرتب کر کے پیش کیا جو وفاقی ریاستی ڈھانچے پر مشتمل تھا۔ لیکن اس پر نہ صرف مذہبی حلقوں کی طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہو گئی بلکہ مشرقی پاکستان کے نمائندوں نے بھی عدم اطمینان کا اظہار کیا کہ ان کی اکثریت کو اقلیت میں بدل دیا گیا ہے۔

یہاں ایک بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ دستوریہ میں مغربی پاکستان کے نمائندوں کی اکثریت' جاگیرداروں' سرداروں اور خوانین پر مشتمل تھی' جب کہ مشرقی پاکستان کے نمائندوں کی اکثریت متوسط طبقے کے افراد پر مشتمل تھی' مغربی پاکستان کا یہ جاگیردار ٹولہ ہر ایسی دستوری تجویز کو رد کر دیتا تھا جس میں مشرقی پاکستان کے نمائندوں کو غلبہ حاصل ہونے کا امکان ہوتا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جمہوریت اور جاگیرداری کبھی ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ چنانچہ دستور سازی کے ہر مرحلے پر وہ گھوم پھر کر ایسا فارمولا تلاش کرتے جس میں مشرقی پاکستان کی اکثریت کو کم از کم برابری کی سطح پر لا کر جاگیردارانہ ریاستی ڈھانچے کو برقرار رکھا جا سکے۔

مندرجہ بالا آئینی تجاویز میں اردو کو واحد قومی زبان قرار دیا گیا تھا' جس پر مشرقی پاکستان کے انتہا پسندوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس پر چوطرفہ تنقید کی بوچھاڑ سے تنگ آ کر لیاقت علی خاں نے دستوریہ کا اجلاس ملتوی کر کے' ہر طبقۂ فکر سے تجاویز طلب کر لیں اور یقین دہانی کرائی کہ وہ ہر ممکنہ حد تک تمام اعتراضات دُور کرنے کی کوشش کریں گے۔ قبل اس کے کہ اصولی کمیٹی دوسرا دستوری خاکہ مرتب کرتی 16 اکتوبر سنہ 1951ء کو لیاقت علی خاں شہید کر دیئے گئے۔ ان کی جگہ خواجہ ناظم الدین وزیراعظم بنے تو مجوزہ رپورٹ میں بھی تاخیر ہو گئی۔ آئین سازی کے دوران کس قسم کے تنازعے اور مشکلات کھڑی کی جا رہی تھیں اس کا اندازہ آپ یوں کر سکتے ہیں کہ لیاقت علی خاں جیسا معقول اور ہمہ مقتدر وزیراعظم بھی

www.bhutto.org

وزیر اعظم بھٹو دوہا میں شیخ خلیفہ بن حواد التھانی سے گفتگو کرتے ہوئے

www.bhutto.org

تقریباً ساڑھے چار برس کے طویل عرصے میں آئین کا ایسا ابتدائی خاکہ تیار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا جو سب کے لئے قابل قبول ہوتا۔

خواجہ ناظم الدین نے تقریباً چودہ ماہ کے بعد 22 دسمبر 1952ء کو اصولی کمیٹی کی آئینی رپورٹ پیش کی۔ یہ بھی ایک وفاقی آئین کا ڈھانچہ فراہم کرتی تھی۔ لیکن یہاں بھی جاگیردار ٹولہ نے جو آج جمہوریت کے نعرے لگاتا نہیں تھکتا اپنے ہاتھوں جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا۔ ایوانِ بالا میں مغربی پاکستان کو اکثریت دے کر، مشترکہ ایوانوں میں مشرقی پاکستان کو برابر کی سطح دے دی گئی' اس وقت مشرقی پاکستان کی سیاست میں ہندو کافی اہم رول ادا کر رہے تھے۔ لہٰذا مذکورہ بالا دونوں بنیادوں کو سامنے رکھ کر انہوں نے ملک کے دونوں حصّوں میں تناؤ پیدا کر دیا۔ اور ان تجاویز کو (Party Proposals) "برابری کی تجاویز" کا نام دیا گیا۔ پنجاب کے جاگیردار نمائندوں نے بھی اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ مرکز میں بنگال کو اس خوف سے برابر کا درجہ نہیں دینا چاہتے تھے کہ مبادا وہ مغربی پاکستان کے کسی ایک چھوٹے یونٹ کو ساتھ ملا کر جاگیرداری کے نظام پر ضرب لگا دے۔ دونوں طرف کی اس طرز تنقید نے ملک میں پہلی مرتبہ صوبائی تعصبات کو شدت کے ساتھ بھڑکایا' انہی تجاویز پر بحث کے دوران صوبائی خود مختاری کی بحث نے زور پکڑا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ کمیٹی یہ رپورٹ بھی متفقہ طور پر منظور نہیں کر سکی تھی' کمیٹی کے 29 میں سے صرف 16 ممبروں نے اس تجویز پر دستخط کئے تھے' جن ممبروں نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا ان میں میں ممتاز دولتانہ' مشتاق احمد گورمانی اور چودھری نذیر احمد بھی شامل تھے۔ ابھی ان آئینی تجاویز پر بحث چل رہی تھی کہ پنجاب سے ختم نبوّتؐ کی تحریک اٹھی اور 16 اپریل سنہ 1953ء کو خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر کے' امریکہ سے محمد علی بوگرہ کو بلوا کر وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ حالانکہ خواجہ ناظم الدین پارلیمنٹ کی اکثریت کے سربراہ تھے اور گورنر جنرل ملکہ برطانیہ کا نمائندہ۔ عوام کا نمائندہ تو ملکہ سے درخواست کر سکتا تھا کہ گورنر جنرل کو برطرف کر دیا جائے۔ لیکن ایک علامتی ملکہ کا علامتی نمائندہ یہ حق نہ رکھتا تھا کہ ملک کی قومی اسمبلی کے قائد کو عدم اعتماد کے ووٹ کے بغیر برطرف کر دے۔ یہ پاکستان میں جمہوریت پر پہلا حملہ تھا' جس کے خلاف جمہوریت کے نعرے بلند کرنے والوں میں سے کسی نے بھی صدائے احتجاج بلند نہ کی۔ بلکہ اس وقت کی اکثریتی پارٹی نے بڑی نیاز مندی کے ساتھ نہ صرف اپنے منتخب وزیر اعظم کی برطرفی کو قبول کیا۔ بلکہ باہر سے نامزد وزیر اعظم کو پوری سعادت مندی سے اپنا لیڈر تسلیم کر لیا۔

محمد علی بوگرہ نے وزیر اعظم بننے کے چھ ماہ بعد دستور یہ میں اپنا ایک آئینی فارمولا پیش کیا' جس کے بارے میں انہوں نے کہا کہ یہ ملک کے دونوں حصّوں کے لئے قابلِ قبول ہے' یہ ماضی کے مقابلے میں ایک بہتر آئینی فارمولا تھا اور عام طور پر اسے پسند کیا گیا تھا۔ دستور ساز اسمبلی نے اکتوبر سنہ 1953ء میں

www.bhutto.org

اس پر بحث کی اور پہلی مرتبہ دستور سازی ممکن دکھائی دینے لگی تھی بلکہ عملاً دستور مرتب کرنا شروع کر دیا گیا تھا لیکن یہ عمل جاری ہی تھا کہ اکتوبر 1954ء کو دستور ساز اسمبلی ختم کر دی گئی اور پاکستان ایک مرتبہ پھر سیاسی خلاء میں لٹک گیا۔ پہلی دستور ساز اسمبلی کی مجرمانہ سست رفتاری اور سیاسی لیڈروں کی مفاد پرستانہ ہٹ دھرمیوں نے مسلم لیگ کو ملک کے دونوں حصّوں میں عوام سے کاٹ دیا تھا۔ مشرقی پاکستان میں جگتو فرنٹ نے لیگ کو شرمناک شکست دینے کے بعد قومی اور دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کے نمائندوں کی اتھارٹی کو چیلنج کر دیا تھا۔ بنگال میں اپنا انجام دیکھنے کے بعد مغربی پاکستان کے مسلم لیگی لیڈر انتخابات میں عوام کا سامنا کرنے سے گھبرا رہے تھے' اور ملک کی تمام تر سیاست ان لوگوں نے محلاتی سازشوں تک محدود کر کے رکھ دی تھی۔ جس وقت ان مفاد پرست سیاست دانوں کی خواہشات کے تحت غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر کے صریحاً غیر جمہوری انداز میں انھیں باہر سے لیڈر آف دی ہاؤس فراہم کیا تو ان لوگوں نے اسے ووٹ دے کر تسلیم کر لیا لیکن بعد میں انھیں گورنر جنرل کے اختیارات پر اعتراض ہوا تو جمہوری انداز اختیار کرنے کی بجائے سازشی طریقے سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کی ان کلازز کو کالعدم قرار دے دیا جس کے تحت گورنر جنرل کابینہ کو برطرف کرنے کا مجاز تھا۔ گو گورنر جنرل کے ان نو آبادیاتی اختیارات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا، لیکن انھیں سازش کے ذریعے ختم کرنے کی بجائے عوام کا تعاون حاصل کر کے جمہوری طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ سیاست دان جو پاکستان کی جڑیں کاٹنے میں مصروف تھے' عوام کے پاس جانا ہی نہیں چاہتے تھے' چنانچہ ان کلازز کو کالعدم قرار دینے کے لئے سازشی طریقہ اختیار کرتے ہوئے' جب غلام محمد دارالحکومت سے باہر گیا تو انہوں نے ایک ہی روز میں یہ آئینی ترمیم کر کے' اسے گزٹ کر دیا' یعنی جس روز یہ ترمیم ایوان میں پاس ہوئی' اسی روز گزٹ بھی ہو گئی۔ غلام محمد بھاگ کر کراچی واپس پہنچا اور اس نے فوری طور پر ہنگامی حالات کا اعلان کر کے قومی اسمبلی کو ختم کر دیا۔ ان سیاست دانوں نے ترمیم پاس کرنے کے لئے جو سازشی انداز اختیار کیا تھا اسے عوام میں بھی ناپسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا تھا۔ لیکن غلام محمد کے اس اقدام پر کسی طرف سے صدائے احتجاج بلند نہ ہوئی۔ غلام محمد نے اس اقدام سے دستور سازی کے کام کو پھر وہیں پہنچا دیا جہاں سے وہ شروع ہوا تھا۔ مولوی تمیز الدین مرحوم نے اس اقدام کو عدالت میں چیلنج کیا' سندھ ہائی کورٹ نے ان کے حق میں فیصلہ دیا لیکن سپریم کورٹ میں جسٹس منیر نے غلام محمد کے اقدام کو جائز قرار دے دیا۔

ان سیاست دانوں کی جمہوریت پسندی ملاحظہ ہو کہ اس غلام محمد نے اسمبلی ختم کرنے کے بعد اسی محمد علی بوگرہ کو دوبارہ وزارت بنانے کی دعوت دی تو یہ سر کے بل چل کے اس کابینہ میں بھی وزارتیں لے کر بیٹھ گئے۔ یہی وہ کابینہ تھی جس میں ایوب خاں کو فوجی سربراہ ہونے کے باوجود اور سکندر مرزا کو سرکاری ملازم ہوتے ہوئے وزارتی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ اسی کابینہ میں سرخ پوش تحریک کے قائد ڈاکٹر خان

www.bhutto.org

صاحب کو شامل کیا گیا۔ ان جمہوریت پسندوں کی یہ کابینہ کسی کی نمائندہ نہ تھی۔ کسی اسمبلی کے سامنے جواب دہ نہ تھی' دوسری دستور ساز اسمبلی بھی براہِ راست عوام میں سے منتخب کرنے کے بجائے اس وقت موجود صوبائی اسمبلی کے ممبروں کے ووٹوں سے بالا ہی بالا منتخب کر لی گئی' اس کے کل 80 ممبر تھے۔ پہلی دستوریہ میں مسلم لیگ کو واضح اکثریت حاصل تھی۔ لیکن اب کے مشرقی پاکستان میں اس کی شکست کے بعد نئی دستوریہ میں پارٹی پوزیشن حسب ذیل ہو گئی۔ اس کی تفصیل جاننا ضروری ہے کہ بعد میں جو کھیل کھیلے گئے ان کا زیادہ تر انحصار اسی پارٹی پوزیشن پر ہے۔ مسلم لیگ۔ 25 جگتو فرنٹ۔ 16۔ عوامی لیگ۔ 12۔ نون گروپ۔ 2۔ آزاد مسلم۔ 1۔ پاکستان کانگریس۔ 4۔ اور گیارہ نشستیں دوسرے مختلف گروہوں کو حاصل تھیں' اس پارٹی پوزیشن میں کوئی بھی واحد پارٹی اتنی اکثریت کی حامل نہیں تھی کہ وزارت سازی کر کے کامیابی سے ملکی امور انجام دے سکتی۔ یہی وہ آئیڈیا تھا جسے یحییٰ خاں نے سامنے رکھ کر انتخابات کرائے تھے۔ خیر اس پارٹی پوزیشن میں ہر وزارت کولیشن ہی بن سکتی تھی' اور کولیشن کی وزارتیں ہمیشہ کمزور ہوا کرتی ہیں' یہاں غلام محمد نے چودھری محمد علی کو آگے کیا جو آگے چل کر پاکستان کی تقسیم پر منتج ہوا۔ 20 ستمبر سنہ 1955ء کو ایک قانون کے ذریعے مغربی پاکستان کے صوبے ختم کر دیئے گئے اور اسے ایک یونٹ بنا دیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اس وقت اس فیصلے کے زہریلے اثرات سے قوم کو آگاہ کر دیا تھا۔ گویا سیاست دانوں کا یہ ٹولہ جو 10 اگست 47ء سے پاکستان کے لئے آئین تیار کرنے پر مامور ہوا تھا آئین تو تیار نہ کر سکا۔ لیکن اس دوران ملک کے دونوں حصّوں میں اپنی احمقانہ تجاویز اور باہمی مفادات کے ٹکراؤ کی گونج سے ایسی فضا پیدا کر گیا کہ تحریک پاکستان کے دوران قائداعظم نے پورے ملک کے مسلمانوں میں اُخوّت و یکجہتی کی جو روح پھونکی تھی اس کی جگہ صوبائی اور علاقائی نفرتوں نے لے لی۔ اور دُوئی کی یہ بنیاد رکھ دینے کے بعد 23 مارچ سنہ 1956ء کو آئین دے دیا گیا۔ اس میں بھی صدرِ مملکت کو عوام کی منتخب اسمبلی کو کالعدم کرنے کا بے لگام اختیار دیا گیا تھا۔ اس آئین کے نفاذ کے ساتھ ہی ملک میں عام انتخابات کی نوید سنائی گئی۔ لیکن جمہوریت کے چیمپئن جو عوام کی پہلی براہ راست منتخب حکومت پر نکتہ چینی کرتے رہے اس وقت خود اقتدار میں تھے' لیکن انہوں نے آئین کے نفاذ کے بعد بھی انتخابات کرانے کی کوئی کوشش نہ کی اور ایک بار پھر محلّاتی سازشوں میں مصروف ہو کر اقتدار کی بندر بانٹ کرنے لگے۔ سکندر مرزا کے اشارے پر راتوں رات ڈاکٹر خان کی سربراہی میں ایک ری پبلکن پارٹی بنائی گئی۔ اس پارٹی کا نہ کوئی منشور تھا' نہ کوئی تنظیم تھی اور نہ ہی عوام سے اس کا کوئی رسمی واسطہ تھا۔ اس وقت کے وزیراعظم چودھری محمد علی دیکھتے ہی رہ گئے اور ان کی پارٹی کے ارکان نے اس نئی جماعت میں شمولیت اختیار کر لی اور ستمبر سنہ 1956ء میں انھیں وزارت عظمیٰ سے الگ ہونا پڑا اور عوامی لیگ نے ری پبلکن پارٹی کے تعاون سے ایک دوسری کولیشن بنالی۔ یہ وزارت بھی ایک سال سے کچھ ہی زیادہ عرصے

www.bhutto.org

تک چل سکی۔ اس کے بعد ہر چند روز کے بعد ممبر پارٹیاں بدلتے' صدر نئے افراد کو کابینہ بنانے کی دعوت دیتا' اور جب چاہتا اس کی ٹانگ کھینچ کر نئے آدمی کو سامنے لاتا۔ اس افراتفری اور خود غرضی کے جواز میں خواہ کوئی بھی عذر پیش کیا جائے۔ لیکن حقیقت میں اس تمام انتشار کی بنیادی وجوہ صرف چند تھیں' سب سے پہلی اور بڑی وجہ کسی قومی سطح کی قیادت کا فقدان تھا۔ دوسرے اقتدار میں عوام کی عدم شرکت کہ لیڈروں نے کبھی ان سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی اور تیسرے متحارب سیاسی جماعتوں کے پاس نہ کوئی پروگرام تھا اور نہ ہی عوام کی فلاح و بہبود کا کوئی منصوبہ' یہ لوگ صرف اپنے ذاتی اور طبقاتی مفادات کے تحفظ اور فروغ میں مصروف تھے' غلام محمد اور سکندر مرزا جیسے معمولی افراد جن کی عوام میں کوئی حیثیت ہی نہیں تھی جمہوریت کو کُند چھری سے ذبح کرتے رہے اور یہ ہر نئے وار کے بعد انہی کو سلام کر کے وزارتوں میں حصے وصول کرتے رہے۔ آج یہ لوگ کوئی عذر پیش کریں لیکن عوام اور تاریخ کے سامنے اس قسم کے جرائم کی کوئی تاویل قابلِ قبول نہیں ہوا کرتی۔ اور پھر ہم نے تو ذوالفقار علی بھٹو کو عملاً یہ کرتے دیکھا ہے کہ جب اسے یہ احساس ہوا کہ ایوب خاں نے قومی و ملکی مفاد سے انحراف کی راہ اختیار کی ہے تو وہ ہر قسم کے لالچ اور خوف کو ٹھکرا کر مردانہ وار عوام میں آ گئے۔ واضح رہے کہ ان لیڈروں میں سے جو دوسری قومی اسمبلی میں گئے تھے تقریباً ایک تہائی کے قریب سفارتی عہدے لے کر ملک کو ان جمہوریت کشوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چل دیئے تھے' بھٹو کو بھی ایوب خاں نے فرانس میں سفیر کے عہدے کی پیش کش کی تھی' لیکن انہوں نے قوم کو یوں چھوڑ کر جانا پسند نہ کیا۔ اگر ان لوگوں میں سے کوئی قیادت کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہوتا' یا اس کی جڑیں عوام میں ہوتیں یا انھیں عوام کے جذبات اور ان کی امنگوں کا احساس ہوتا یا انھیں ملک و قوم کے مستقبل سے کوئی دلچسپی ہوتی تو غلام محمد یا سکندر مرزا' ایوب خاں کے مقابلے میں زیادہ طاقتور نہ تھے۔ یہ لوگ عوام کی قوّت سے کام لے کر انہیں پر کاہ کے مانند اڑا کے رکھ دیتے' لیکن جمہوریت کے ان دعویداروں کو جمہور سے واسطہ تھا اور نہ جمہوریت سے' جب اس کے برعکس بھٹو ایک طویل اور عظیم جدوجہد کی آزمائش سے پورے پاکستان کے عوام کے محبوب اور مصدقہ راہنما بن کر اُبھرے۔ ان کی پارٹی کو تمام اسمبلیوں میں فیصلہ کن اکثریت حاصل تھی بجائے اس کے کہ ماضی میں انتشار' سیاسی کمزوریوں اور قیادت کے خلا کے باعث تباہ شدہ پاکستان کی حالت زار سے سبق لے کر یہ لوگ ایک مضبوط سیاسی پارٹی جس کی جڑیں عوام کے اندر تھیں اور ایک مصدقہ سیاسی قائد کو دیکھ کر جسے ہر طبقہ فکر کی تائید حاصل تھی' خدا کا شکر ادا کرتے الٹا اس کی اکثریت کو "بے رحم" اکثریت کا غیر جمہوری نام دینے لگے۔ شاید یہ لوگ "بے رحم" اکثریت کے بجائے ایک بار پھر ان "قابل رحم" سیاسی ٹولوں کے تمنائی تھے جن میں سے کوئی بھی حکومت چلانے کا اہل نہ تھا اور جن کی "قابل رحم" حالت کے باعث کوئی وزیراعظم رات کو یہ یقین لے کر نہیں سو سکتا تھا کہ وہ صبح اٹھ کر پرائم منسٹر ہاؤس سے اپنے دفتر

www.bhutto.org

جائے گا یا سامان باندھ کر ذاتی مکان میں منتقل ہو گا۔ پاکستان کا ماضی میں سب سے بڑا المیہ ہی یہ رہا ہے کہ یہاں نہ تو کوئی سیاسی جماعت عوام کے ووٹ لے کر اکثریت حاصل کر سکی تھی اور نہ لیاقت علی خاں کی موت کے بعد اسے کوئی مرکزی قیادت میسر آئی تھی۔ یہ حالات مارشل لاء کا باعث بنے اور انہیں حالات نے قیام پاکستان کے مقصد کو دھندلا کے صوبائی اور علاقائی تعصبات کو فروغ دے کر' قوم کو نشان منزل سے بے خبر کر دیا تھا۔ لیکن بھٹو کے دور میں پیپلز پارٹی کی صورت میں پہلی مرتبہ یہاں نہ صرف ایک مضبوط عوامی سیاسی پارٹی موجود تھی بلکہ عوام کو ایک مضبوط مرکزی قیادت بھی حاصل تھی۔ انہیں دو چیزوں کی کمی نے پہلے پاکستان کو تباہی کے کنارے پہنچایا اور بعد میں بھی ان سیاسی لیڈروں کے پاس کوئی مشترکہ مقصد تھا تو وہ صرف بھٹو اور ان کی پارٹی کو کمزور کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا' گویا ان لوگوں نے ماضی کے تباہ کن تجربات سے کوئی سبق نہیں لیا تھا یہ آپس میں خود تو چھوٹے چھوٹے اور عوام سے کٹے ہوئے ٹولوں پر مشتمل تھے ہی ساتھ ہی پاکستان کے عوام کو ان کی اپنی پارٹی اور قیادت سے بھی محروم کرنے کے خواب دیکھتے رہے کوئی اور ملک ہوتا تو ایسے بھیانک' مجرمانہ اور شرمناک کردار کے حامل سیاستدانوں کو جبراً سیاسی زندگی سے ریٹائرڈ کر دیتا۔ لیکن یہ بھٹو کی جمہوریت پسندی تھی کہ انہوں نے فراخ دلی سے ان کے ماضی کو فراموش کر کے انھیں قومی زندگی میں از سر نو اپنا کردار ادا کرنے کا موقع فراہم کیا۔ انھیں بطور اپوزیشن اپنا جمہوری کردار ادا کرنے کی فضا فراہم کی لیکن یہ بدستور سنہ 57 - 56ء کی فضا میں سانس لیتے رہے۔ ان کے پیٹ میں یہی مروڑ اٹھتے رہے کہ پانچ پانچ سال میں آٹھ دس مرتبہ وزارتیں کیوں نہیں ٹوٹیں' قوم کو ایک غیر متنازعہ راہنما کیوں مل گیا؟ اور پھر اپنے طور پر ان کی یہ حالت تھی کہ متحدہ محاذ بنا لینے کے باوجود انھیں اپنے لئے کوئی ایک ترجمان بھی ایسا نہ مل سکا جس پر سب کا مشترکہ طور پر اعتماد ہوتا' یہ لوگ ان دنوں ایک پریس کانفرنس کرنے بھی آتے تو کرسیوں پر دس پندرہ لیڈروں کا ایک ایک جلوس برا جمان ہوتا' یہ اتنے طویل عرصے میں نہ تو کوئی مشترکہ پروگرام بنا سکے اور نہ ہی مشترکہ قیادت تلاش کر سکے۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ بھٹو کو اس بات کا دلی صدمہ رہا کہ انھیں اپنے دور میں معیاری اپوزیشن میسر نہ آ سکی۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ پاکستان میں کوئی منظم' جمہوری اقدار کی حامل اور قومی مفادات پر ذاتی مفادات کو قربان کرنے والی اپوزیشن موجود ہو۔ لیکن افسوس کہ ماضی کے ان فن کاروں نے ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہونے دی اور یہ اپنی سابقہ حرکات کو دُہرا دُہرا کر عوام کے پرانے زخموں کو تازہ کرتے رہے۔

www.bhutto.org

انیسواں باب

شخصیت ..... تاثرات و مشاہدات

ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت میں خدا نے بے پناہ جاذبیت اور دلنوازی بھر دی تھی اور وہ مشرق و مغرب کے ان چند زعما میں سے تھے جو اپنے ملنے والوں کو اپنی خوش گفتاری، حُسنِ خلق اور دانائی و ہوشمندی کے ساتھ بہت جلد مسحور کر لیتے تھے۔ میں جب تک ان سے ملا نہ تھا اور صرف ان کی تصویریں اخبارات میں چھپی دیکھی تھیں، میں ان کی شخصیت سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوا تھا اور ان کی تصویر میرے لئے جاذبِ توجہ نہیں بنی تھی۔ لیکن میں جب ان سے ملا تو مجھے ان کی شخصیت بڑی ہی پُرکشش اور جاذبِ نظر محسوس ہوئی۔ مجھے وہ بے حد خوبصورت نظر آئے ان کے چہرے پر بے پناہ حُسن تھا اور ان کی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی، وہ جتنے حسین تھے، اتنے ہی پُروقار اور متین بھی تھے، ان کے چہرہ پر میں نے مسکراہٹیں بھی دیکھیں اور معصومیت کی سُرخی بھی جھلکتی پائی۔

وہ ہر ملنے والے سے بڑی خوش دلی اور خندہ پیشانی سے ملتے، مجھ سے بھی پہلی ملاقات میں اور بعد کی ملاقاتوں میں انہوں نے اپنا یہ خصوصی وصف ملحوظ رکھا۔ انہوں نے کبھی اپنے ملنے والوں کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ ان سے اونچے یا بلند رتبہ ہیں وہ معمولی سے معمولی کارکن اور معمولی سے معمولی آدمی سے پورے ادب و آداب کے ساتھ ملتے وہ ساتھیوں کے دکھوں اور تکلیفوں کو محسوس کرتے تھے اور ان کی تکلیفوں اور دکھوں میں برابر کے شریک رہے۔

ان کے کتنے ملازم، کتنے کاشتکار اور کتنے محلّہ دار، شہردار اور قریبی دیہات میں رہنے والے ایسے ہیں، جنہوں نے ان کی عملی ہمدردی اور تعاون سے بارہا اپنی جھولیاں بھری ہیں۔ بعد میں تو خیر ان کی زمین، زرعی اصلاحات کے بعد بہت سکڑ گئی تھی مگر کبھی ان کی جاگیر و زمینداری پینتالیس ہزار ایکڑ کے رقبہ میں

www.bhutto.org

پھیلی ہوئی تھی اور ان کے کاشتکار ہزاروں کی تعداد میں تھے' ان میں سے کتنے ہزار کاشتکار بعد میں ان زمینوں کے مالک بن گئے جو کبھی ان کی تھیں۔ مگر یہ ہزاروں کاشتکار ان کے بچے' ان کی بیویاں اور بیٹیاں اب تک ان لمحات کو یاد کرتے ہیں' جب جناب بھٹو ان کے غموں اور ان کی خوشیوں میں شریک ہوتے تھے۔

ان کے ذاتی ملازمین نے' ان کی محبتیں اور عنایتیں جس طرح سمیٹی ہیں ایسی شائد ہی کسی بڑے آدمی' کسی بڑے سے بڑے سیاسی زعیم' حتیٰ کہ مذہبی رہنما کے ملازمین کے حصّہ میں نہیں آئی ہیں۔ ان کے درجنوں ملازم تھے جن کی بچیوں کے جہیز ان کی مدد سے خریدے گئے' ان کے بیسیوں ملازم ایسے تھے جن کی بیواؤں نے ان سے تاعمر وظیفے پائے ہیں۔

بعد میں تو ان کے ذاتی ملازمین کی تعداد بہت گھٹ گئی تھی ان کے ملازمین میں سے اکثر وہ تھے جو ان کی چھوڑی ہوئی زمینوں کے مالک بن گئے تھے' مگر ان میں سے کسی ایک کو معلوم ہو جاتا کہ بھٹو صاحب کے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا ہے تو اس کانٹے کی چبھن' وہ اپنے دلوں میں محسوس کرتے اور اس طرح بے چین ہو جاتے جیسے کہ ان کو زہریلے بچھوؤں نے ڈس لیا ہے۔

اس ملک کے سیاسی زعماء میں تنہا جناب بھٹو کی ذات ایسی تھی' جس کے متعلقین میں سے سینکڑوں ایسے تھے جو ان کے حکم پر اور ان کی خاطر موت کو ہنسی خوشی قبول کر سکتے تھے۔

وہ بھی ان کے متعلقین میں سے تھے جنہوں نے جناب بھٹو کی خاطر سختی کے دنوں میں اپنی انگلیوں کو چراغوں کی لوؤں پر رکھ کر جلا لیا تھا۔

ان کے مخالفین نے ان کی تحریک کے دنوں میں اکثر ان پر یہ طعن کیا ہے کہ وہ ایک بڑے جاگیردار ہیں اور سوشلزم کی باتیں کرتے ہیں انہیں شائد یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ جناب بھٹو ہی تھے جنہوں نے ایوبی دور میں زرعی اصلاحات کا منصوبہ تیار کیا تھا اور اس منصوبہ کو عملی جامہ پہناتے وقت اڑتیس ہزار ایکڑ زمین حکومت کے سپرد کر دی تھی کہ کاشتکاروں کو دے دی جائے' جو زمین باقی بچی تھی اسے انہوں نے اپنے دور کی زرعی اصلاحات میں کاشتکاروں میں جس دیانت داری کے ساتھ تقسیم کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے وہ جو کبھی چالیس ہزار ایکڑ سے زائد زمینوں کے مالک تھے بعد میں ذاتی طور پر صرف ڈیڑھ سو ایکڑ کے مالک رہ گئے۔

یہ بات بھی شائد بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ جب ان کے پاس زیادہ زمین تھی تو اس کی آمدنی میں سے وہ کاشتکاروں کو برابر کا شریک ٹھہراتے تھے۔

کوئی ایک کاشتکار بھی ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا' جس کو ان کی طرف سے کسی قسم کی زیادتی کی کبھی شکایت ہوئی ہو یا بھوک اور ننگ کے آزار میں خود کو ان کے سبب مبتلا پایا ہو۔

www.bhutto.org

پاکستان کے بڑے بڑے زمینداروں کی پوری 28 سالہ زندگی اس ملک کی استحصالی تاریخ کا ایک بڑا ہی المناک باب ہے' ان لوگوں نے اپنی زمینیں کاشت کرنے والوں پر جو زیادتیاں پچھلے 28 سال میں کی ہیں انہیں ہماری معاشی زندگی کبھی فراموش نہیں کر پائے گی' بہت کم بڑے زمیندار اور جاگیردار اس ملک کے ایسے تھے جو اپنے کاشتکاروں کو اپنا رفیق' اپنا معاون اور اپنا ساتھی قرار دیتے تھے مگر جناب بھٹو نے ہمیشہ انہیں اپنا رفیق اور اپنا کامریڈ جانا یہ وصف اس وقت ان میں پیدا نہیں ہوا جب کہ انہوں نے پیپلز پارٹی کی بنا رکھی' یہ خوبی ان میں اس وقت سے ہے جب کہ وہ سنہ 1952ء میں اپنے وطن واپس آئے اور اپنے بزرگ باپ کی زمینوں کی نگرانی اپنے ذمہ لی۔

یہ بات بے محل نہ سمجھی جائے کہ جناب بھٹو کو کاشتکاروں، کسانوں اور ہاریوں سے لگاؤ بچپن ہی سے ہے۔

پیلو مودی نے جو ان کے بچپن کے دوستوں میں سے ہیں اور ان سے بہت قریب رہ چکے ہیں ان کی مختصر سوانح حیات میں اس بات کا واضح اعتراف کیا ہے کہ برکلے میں دوران تعلیم ایک بار جناب بھٹو سے انہوں نے کہا تھا کہ انہیں سوشلزم سے اس لئے قرب پیدا ہوا ہے کہ انہوں نے سوشلزم پر بعض سوشلسٹ پروفیسروں کے لیکچر سنے اور ان کی تحریریں پڑھی ہیں تو جناب بھٹو نے اس بات کی نفی کی اور کہا کہ وہ سوشلزم سے ان سندھی کاشتکاروں اور ہاریوں کے سبب قریب آئے ہیں جنہیں انہوں نے اپنے بچپن میں انتہائی غربت و افلاس اور بے چارگی کی زندگی گزارتے دیکھا ہے اور غریب کاشتکاروں اور ہاریوں کی غریبی اور افلاس نہ صرف انہیں سوشلزم سے قریب لائی' یہی شے دراصل پہلے ایوبی دور کی زرعی اصلاحات اور پھر عوامی حکومت کی زرعی و معاشرتی انقلاب کی محرک بنی۔

جن حضرات نے انہیں دسمبر سن 1971ء سے پہلے کے ایام میں لاڑکانہ کے قیام کے دوران اپنے کاشتکاروں کے معاملات نبٹانے اور ان کے نجی اور مجلسی مسائل کو سلجھاتے دیکھا ہے وہ ساری دنیا کے سامنے یہ گواہی دیں گے کہ جناب بھٹو ان کے ساتھ اس طرح باتیں کرتے' جیسے وہ ان کے برابر کے ساتھی تھے یا جیسے اِن کا اور اُن کا خون باہم مشترکہ تھا۔ محض کاشتکاروں اور ہاریوں ہی نے ان کی شفقت سے وافر حصّہ نہیں پایا ان کے رفقاء' ان کے دوستوں اور ان کی پارٹی کے کارکنوں نے بھی ان کے اخلاقِ حسنہ کی لطافتوں سے پُورا پُورا حصّہ پایا ہے۔

یہ ان کا حُسنِ خلق ہی تھا جو پیپلز پارٹی کی غیر معمولی مقبولیت و ہر دلعزیزی کا اوّلین محرک بنا' جب انہوں نے حیدر آباد کے ایک مکان میں پیپلز پارٹی کی پہلی اینٹ رکھی تھی تو ان کے گرد چند اخبار نویس تو ضرور بیٹھے تھے مگر ان کا ساتھی صرف ایک تھا۔

www.bhutto.org

لیکن جب 30 ر نومبر سنہ 1967ء کو انہوں نے لاہور میں اپنی پارٹی کا پہلا کنونشن بلایا تو اس کی حاضری چھ سو سے اُوپر تھی اور چھ سو کی یہ تعداد چند مہینوں میں ان کے گرد جمع ہوئی تھی' ان لوگوں کو ان کے قریب یقیناً ان کا اسلامی و فلاحی منصوبہ لایا تھا لیکن ان کا حُسنِ خلق اصل سبب تھا اگر وہ حد درجہ خلیق' انتہائی ملنسار اور خوش مزاج نہ ہوتے' تو مقصد کی ہزاروں رفعتیں بھی اس اجتماع کی بنیاد نہ بن پاتیں۔

عالمی تحریکوں کی تاریخ سے واقف اصحاب اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ جتنی بھی عالمی تحریکیں دنیا میں پھلیں اور پھُولیں وہ صرف اس لئے کہ ان کے بانی حُسنِ خلق کے بہترین نمونے تھے۔ کسی بھی کج خلق' تنگ ظرف اور تلخ مزاج شخص نے' خواہ وہ کتنا بھی عقلمند' کتنا بھی دانا بینا اور قابل کیوں نہ تھا کسی عالمی تحریک کی بِنا نہیں رکھی ہے اور نہ کامیابی و ہر دلعزیزی صِلہ میں پائی ہے۔ اس کُلیّہ کے تابع جناب بھٹو کو جو ہر دلعزیزی اور قبولِ عامہ دسمبر سنہ 1970ء تک نصیب ہوا' جس طرح ان کی پارٹی ہزاروں سیلابوں اور طوفانوں کی سی تندی و تیزی اور وسعت حاصل کر گئی اور مغربی پاکستان کے اَسّی فیصد عوام کی محبوب و منظور نظر بن گئی' جناب بھٹو کی وسعتِ ظرف' پاکیزگیٔ خلق اور پیشانی کی کشادگی اس کا موجب تھی۔

یہ جو کروڑوں عوام نے سنہ 1970ء کے انتخاباتِ عامہ میں ان کی پارٹی کے حق میں ووٹ ڈالے تھے' یہ ان کا عوام سے حد درجہ خلوص عوام سے لگاؤ اور ان کی فلاح و بہبود کا حُسن خیال تھا جو عملی صورت اختیار کر گیا تھا۔

اس کے مخالفین جو چاہیں سوچیں اور جو چاہیں کہیں۔ پیپلز پارٹی مشرق کی عظیم تحریکوں کی فہرست کی صفِ اوّل میں اپنا نام صرف اس لئے درج کر پائی کہ اس کے بانی کے اندر عظیم تحریکوں کے بانیوں جیسے سارے اوصافِ حسنہ مجتمع تھے۔

نہ صرف یہ کہ وہ سرتا پا خلق تھے اور اپنے ساتھیوں کے حق میں شفقت ہی شفقت تھے' انہوں نے اپنے ساتھیوں اور رفقاء کی تربیت بالکل اس طرح کی ہے جیسے کوئی مشفق استاد اور مہربان اور فرض شناس باپ یا بڑا بھائی اپنے محبوب شاگرد' اپنے بیٹے اور اپنے چھوٹے بھائی کی کرتا ہے۔

ہم میں سے جتنے بھی ان کے ساتھی تھے' ہم میں سے جتنے بھی لوگ ان سے قریب رہے ہیں اور جنہوں نے ان کے ساتھ مل کر عوامی جدوجہد کی ہے ان کی تربیت میں انہوں نے حد درجہ دلچسپی لی ہے اور بڑی محنت کی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ پیپلز پارٹی کا پہلا کنونشن جب لاہور میں ہوا تھا تو بعض اخبارات نے اس پر تبصرہ کرتے وقت لکھا تھا کہ بھٹو صاحب نے اپنے گرد جتنے لوگ جمع کئے ہیں وہ سب کے سب ناپختہ سیاست دان اور نو آموز ہیں۔

www.bhutto.org

اسی زمانہ میں کئی پرانے سیاستدانوں نے بھی جناب بھٹو کے ساتھیوں پر یہی طنز کی تھی مگر جناب بھٹو نے اپنے ان ساتھیوں کو جو اچھی اور عمدہ سیاسی تربیت دی' یہ اسی کا کرشمہ ہے کہ ان کے ساتھیوں نے ان کے قدم بہ قدم اور ان کے پہلو بہ پہلو چل کر پیپلز پارٹی کی جدوجہد کو ساحلِ مراد تک پہنچایا' سنہ 1970ء کے عوامی انتخابات بڑی کامیابی سے لڑے اور 20ر دسمبر سنہ 1971ء کے بعد عوامی حکومت کی ذمہ داری بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دی ہے۔

یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ جناب بھٹو نے اپنے ساتھیوں کی تربیت کرتے وقت ان کو پڑھایا بھی ہے۔ انہیں مطالعہ کے لئے مفید اور عمدہ کتابیں بھی مہیا کی ہیں اور ان سے گھنٹوں سیاسی مسائل پر تبادلۂ خیال اور بحث و تمحیص بھی کی ہے اور انہیں ایک مضبوط ٹیم کی شکل دینے کے لئے ایک ایک فرد کے ساتھ ویسی ہی محنت کی ہے' جیسے کہ کوئی فرض شناس کیپٹن اپنی ٹیم میں شامل کھلاڑیوں پر فرداً فرداً کرتا ہے۔

جناب بھٹو نے اپنے ساتھیوں کی محض تربیت ہی نہیں کی' ان کی پوری حوصلہ افزائی بھی کی ہے انہوں نے انہیں اپنے ساتھ برابر آگے کی سمت بڑھایا ہے اور جو شہرت خود پائی ہے اور جو مقام خود حاصل کیا ہے اپنے ساتھیوں کو بھی اس میں حصّہ دار بنایا ہے۔

ساتھیوں اور دوستوں کے معاملے میں وہ حد درجہ فراخدل تھے وہ دوستوں کی بڑی سے بڑی غلطی اس طرح معاف کر دیتے جیسے مہربان باپ یا مشفق استاد اپنے بیٹے یا شاگرد کی غلطی معاف کر دیتا ہے۔ وہ ساتھیوں کو یہ محسوس تک نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ ان سے ناراض ہیں۔

حالانکہ وہ ساتھیوں کی ایک ایک بات اور ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھتے تھے اور ان سے اگر کوئی کوتاہی ہو جاتی تھی تو وہ اس کا نوٹس ضرور لیتے تھے' مگر اس لئے نہیں کہ وہ ساتھیوں پر عتاب نازل کریں بلکہ اس لئے کہ ساتھیوں کی اصلاح ہو۔

میں اس سلسلہ میں کچھ ذاتی مثالیں پیش کروں گا۔

پنڈی کے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں ایران پاک دوستی کی انجمن کی طرف سے ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مجھے اس کی صدارت کرنی تھی ایران کے سفیر اور کچھ اور ملکوں کے سفراء بھی اس میں مدعو تھے۔

مشاعرہ کا وقت ساڑھے سات بجے شام تھا' مجھے منتظمین نے یہ سہولت دی تھی کہ میں پونے آٹھ بجے تک آسکتا ہوں' میں پونے آٹھ بجے مشاعرہ میں پہنچا اور مشاعرہ کی کارروائی شروع ہوئی۔

دو دن کے بعد مجھے پریذیڈنسی سے جناب بھٹو کا ایک نوٹ موصول ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ میں اس مشاعرہ میں وقتِ مقررہ سے پندرہ منٹ تاخیر سے کیوں پہنچا جب کہ اس میں کئی سفارتی نمائندے شریک تھے۔

www.bhutto.org

جناب بھٹو نے اپنے اس نوٹ میں مجھے بڑے حسین انداز میں تلقین کی کہ میں آئندہ ایسے مواقع پر تاخیر سے نہ آؤں کیونکہ اس طرح پاکستان کا وقار متاثر ہوتا ہے۔

ایسا ہی ایک واقعہ اور پیش آیا۔ کیبنٹ کی ڈیفنس کمیٹی اس وقت پریذیڈنٹ بھٹو کی صدارت میں مجتمع ہوئی تھی' میں بھی اس کا رکن تھا' اجلاس کا وقت دس بجے تھا' میں ٹھیک دس بجے کمرہ میں داخل ہوا تو ایک چپراسی کمرے کا دروازہ بند کرنے کے لئے دروازہ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا' اس سے پہلے کبھی اجلاس کے وقت کمرے کا دروازے بند نہیں کیا گیا تھا۔ جناب بھٹو اس وقت شرکائے اجلاس سے ہاتھ ملا رہے تھے مجھ پر نگاہ اٹھی تو مسکراتے ہوئے بولے۔

"تمہیں نہ دیکھ کر میں نے حکم دیا تھا کہ عین دس بجے دروازہ بند کر دیا جائے تاکہ تم باہر رہو اور آئندہ وقت پر اجلاس میں شامل ہو۔"

ان کا انداز بڑا شفیقانہ تھا مگر اس کا اثر مجھ پر یہ ہوا کہ اس کے بعد میں کبھی تاخیر سے کسی بھی اجلاس میں نہیں پہنچا وقت کی پابندی میرا معمول بن گیا۔

جناب بھٹو نہ صرف اپنے ساتھیوں اور رفقائے کار کو وقت کی پابندی کی تربیت دیتے اور انہیں وقت کا پابند بناتے وہ اپنے ساتھیوں کو مجلسی آداب کی تربیت دینا بھی ضروری سمجھتے۔

اس سلسلہ میں بھی میں ایک ذاتی مثال پیش کروں گا ایک مرتبہ ایوان صدر میں ایک ڈنر تھا ڈنر کے مینو کارڈ میں پھل آخری شے تھی۔ مگر پھلوں کی ڈشیں میز پر پہلے سجا دی گئیں' ایک ڈش میرے سامنے بھی رکھی گئی۔ میں نے ایسے ہی شغلاً اپنے سامنے رکھی ڈش میں سے چند انگور اٹھائے اور انہیں کھا لیا۔

جب ڈنر ختم ہوا تو جناب بھٹو مجھے ایک طرف لے گئے اور پوچھا .....

"تم نے مینو کارڈ نہیں پڑھا تھا اس میں پھل تو آخری شے تھی پھر تم نے ان کی طرف پہلے کیسے ہاتھ بڑھا دیا' یہ بات مجلسی آداب کے منافی ہے۔"

ایک بار اور آفیشل ڈنر تھا میں بھی دوسرے وزراء کی طرح آفیشل ڈریس پہن کر اس میں شریک ہوا تھا۔ مگر پاؤں میں بوٹوں کی بجائے پشاوری چپل پہن رکھی تھی۔

تقریب کے دوران انہوں نے دو ایک بار مجھے گھور کر دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔ دوسرے دن انہوں نے مجھے خصوصیت سے یاد کیا اور کہا .....

"اس آفیشل ڈریس کے ساتھ آئندہ چپل نہ پہنا کرو۔ سیاہ بوٹ استعمال میں لاؤ۔"

یہ بظاہر بہت چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر بڑی تحریکوں کے خالقوں کی زندگیوں میں ایسی مثالیں بے حد و بے حساب ہیں۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کی ایک ایک عادت اور ایک ایک حرکت اور ایک ایک

www.bhutto.org

عمل پر نگاہ رکھی ہے۔ یہی عالم جناب بھٹو کا بھی تھا وہ بھی اپنے ساتھیوں کی ایک ایک عادت 'ایک ایک عمل پر نگاہ رکھتے اور ان کی ایک ایک عادت کو سنوارنے کی کوشش کرتے حتیٰ کہ یہ تک بتاتے کہ بیرونی مہمانوں اور باہر کے سفیروں سے کس انداز سے ملا جائے' ان کے ساتھ مصافحہ کس طرح کیا جائے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں کتنی دیر رکھے جائیں اور ان سے کس لہجہ میں بات چیت کی جائے انہیں صوفے پر کس جانب بٹھایا جائے اور خود کس جانب بیٹھا جائے۔

یہ اس امر کا نتیجہ ہے کہ ان کے ساتھی بعد میں اس قدر سلجھ گئے تھے کہ وہ جب بھی باہر کے ملکوں میں جاتے تو خود کو وہاں کے لوگوں سے مجلسی آداب کے شعور میں پیچھے نہیں پاتے' بلکہ اکثر جگہوں پر خود کو دوسرے کی نسبت بہتر محسوس کرتے۔

محض یہی نہیں کہ وہ اپنے ساتھیوں کو مجلسی آداب کا پابند دیکھنا چاہتے تھے' وہ خود بھی مجلسی آداب کا بڑا لحاظ رکھتے تھے' میرے خیال میں تو وہ مشرق کی عظیم شخصیتوں میں سے' اس اعتبار سے بے حد ممتاز تھے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے بھی ملتے وقت مجلسی آداب کی پابندی کرتے۔ ان سے جو لوگ ملنے جاتے۔ وہ خواہ کسی درجہ کے بھی ہوں وہ ان سے اٹھ کر ملتے اور بڑی گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملاتے اور مزاج پرسی کرتے۔

درحقیقت انہوں نے یہ عادت اپنے والد گرامی سے ورثہ میں پائی تھی ان کے والد بھی بے حد ملنسار اور انتہائی خلیق تھے۔ وہ بھی اپنے ملنے والوں سے بڑے ادب آداب کے ساتھ ملتے تھے۔

جناب بھٹو کا اپنا بیان ہے کہ انہیں کوئی گھڑی ایسی یاد نہیں ہے کہ وہ کبھی ان کے پاس آئے ہوں' خواہ ان کے پاس کتنے بھی لوگ اور کیسے بھی مہمان کیوں نہ ہوتے اور وہ ان سے اٹھ کر نہ ملے ہوں۔

جناب بھٹو اپنے والد گرامی کو محض اپنا والد ہی نہیں جانتے تھے وہ انہیں اپنا استاد اور مربّی بھی قرار دیتے تھے۔ وہ اکثر اپنے بزرگ باپ کا ذکر کرتے تو فرطِ ادب سے ان کی آنکھیں جھک جاتیں۔

حالانکہ ان کے والد کے انتقال کو عرصہ دراز گزر چکا تھا مگر پھر بھی اپنے دور حکومت میں شائد ہی کوئی دن یا رات ایسی ہو کہ جناب بھٹو نے اپنے والد گرامی کو یاد نہ کیا ہو اور ان کے حضور دو حرف عجز و عاجزی کے عرض نہ کئے ہوں۔ اپنے والد گرامی کی زندگی میں وہ ان سے عشق کی حد تک محبت کرتے رہے ہیں۔

پیلو مودی نے اپنی کتاب میں جناب بھٹو کی اپنے والد گرامی سے محبت کی کچھ مثالیں دی ہیں۔

مثلاً انہوں نے لکھا ہے کہ وہ جب بیرسٹر بننے کے بعد ساؤتھ ایمپٹن کی انٹرنیشنل لاء یونیورسٹی میں لیکچرر تھے اور یہ ایک بڑا اعزاز تھا مگر انہوں نے یہ اعزاز محض اس لئے چھوڑ دیا کہ انہیں لاڑکانہ سے خبر موصول ہوئی تھی کہ ان کے والد گرامی بیمار ہیں۔ وہ بیماری کی خبر پاتے ہی وطن لوٹ آئے اور باپ کے بہتر علالت سے اس وقت تک نہیں ہٹے جب تک ان کی حالت سنبھل نہ گئی۔

www.bhutto.org

مثلاً وہ ون یونٹ کے سخت خلاف تھے اور ایک تحریک شروع کر دی تھی۔ مگر جب حکومت نے ان کے والد گرامی سے رابطہ پیدا کیا اور ان کے والد گرامی نے انہیں حکم دیا کہ مخالفت چھوڑ دو اور اس تحریک میں حصّہ نہ لو۔ تو انہوں نے ادب سے سر جھکا دیا اور باپ کے حکم کی دل و جان سے تعمیل کی۔

اپنے والد گرامی کی طرح انہیں اپنی والدہ ماجدہ سے بھی بے حد عقیدت تھی۔ انہوں نے ان کی زندگی میں بھی انہیں عشق کی حد تک چاہا اور بعد میں بھی ان کا قلبی لگاؤ اپنی والدہ ماجدہ سے اس قدر رہا کہ وہ ہر رات جب تک اپنی ماں کی تصویر پر ایک نظر نہ ڈال لیتے اپنے بستر پر نہ جاتے۔

وہ پریشانی اور دکھ کی گھڑیوں میں ان کو بہت یاد کرتے تھے اور اپنے پروردگار سے ان کے وسیلہ سے امداد چاہتے۔

ان کی ماں بھی ان کے والد بزرگوار کی طرح بڑی مذہبی خاتون تھیں اور جیسے کہ پیلو مودی نے لکھا ہے۔

"سر شاہنواز جن دنوں بمبئی میں مقیم تھے تو ان کا گھرانہ پکّا مذہبی گھرانہ تھا اور یہ ماحول اس لئے پیدا ہوا تھا کہ جناب شاہنواز بھی اور ان کی بیگم صاحبہ بھی مذہبی فرائض بڑی پابندی سے ادا کرتیں۔"

وہ قرآن حکیم کی تلاوت کرتیں اور اس مقدس صحیفہ کو اسی انداز میں آنکھوں اور ہونٹوں سے لگاتیں جس انداز میں جناب بھٹو قرآن کا نذرانہ ملتے وقت اسے اپنے ہونٹوں اور آنکھوں سے لگایا کرتے تھے۔ یہ بات انہوں نے اپنی ماں سے سیکھی تھی۔ اپنی ماں سے انہوں نے بچوں سے محبت' ان کی خواہشات کا احترام ان کی بہتر تربیت کا سلیقہ بھی ورثہ میں پایا تھا۔ ان کی ماں بھی بچّوں سے ویسی ہی محبت کرتیں اور ان کی خواہشات کا خیال رکھتیں جس طرح جناب بھٹو رکھتے تھے۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے .....

"تم میں سے سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں یعنی بیوی بچوں کے ساتھ اچھا ہے۔" (بخاری شریف)

یعنی ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتا ہے ان کو اچھی تربیت و تعلیم دیتا ہے اور ان کو عزت مندی اور وقار سے رہنے کے قابل بناتا ہے اور بہتر شہری کی حیثیت سے معاشرہ کے سپرد کرتا ہے۔

جناب بھٹو بھی اپنی اولاد کی خواہشات کا احترام کرتے وہ بڑے شفیق باپ تھے۔ میں نے انہیں اپنے بچوں کے ساتھ بچوں کے سے انداز میں کھیلتے دیکھا ہے وہ انہیں گدگداتے بھی اور ہنساتے بھی۔ جب بھی وہ باہر جاتے تو بچوں سے روزانہ فون پر رابطہ قائم کرتے اور ان کی فرمائشیں اور خیر خیریت معلوم کرتے۔

جناب بھٹو نے اپنی اولاد کی بڑی اچھی تربیت کی اور اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اپنے بچوں کو۔ بیٹوں کو بھی اور بیٹیوں کو بھی بہت عمدہ تعلیم دلائی اور ان کے بچے حالانکہ ایک عظیم باپ کی اولاد ہیں۔ اس

www.bhutto.org

کے باوجود بڑے مؤدب بڑے ملنسار اور ادب آداب کے پابند ہیں۔ وہ اپنے باپ کے ساتھیوں کی بھی پوری عزت کرتے ہیں اور اپنے دوسرے ملنے والوں سے بھی پورے اخلاق کے ساتھ ملتے ہیں اور وقت پڑنے پر وطن کے ایک جانباز سپاہی کا فریضہ بھی انجام دینے پر قادر ہیں اور ان کی بیگم صاحبہ تو سچے معنوں میں ان کی رفیقۂ حیات ہیں۔ انہوں نے پارٹی کی جدوجہد کے زمانہ میں بھی اور اس عہد میں بھی جبکہ جناب بھٹو آمریت کے معتوب تھے۔ ایک بہترین رفیقِ حیات کے فرائض انجام دیئے ہیں۔

جناب بھٹو کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ انہیں اچھی کتابوں سے عشق کی حد تک محبت تھی۔ فلسفہ اخلاق' سیاسی تاریخ اور سیاسی سائنسی علوم۔ ان کے محبوب موضوع تھے۔ یوں انہوں نے تاریخ عالم اور معلومات عامہ اور مذہبی تقابل پر بھی بہت سی کتابیں پڑھی تھیں' سوشلزم و کمیونزم کا بھی عمیق مطالعہ کیا تھا اور بڑی شخصیتوں کی خودنوشت سوانح عمریوں کے علاوہ بڑی شخصیات پر عام تصانیف بھی پوری دلچسپی سے پڑھتے رہے تھے۔

ان کی ذاتی لائبریری بڑی اچھی لائبریریوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ پاکستان میں شاید دو چار ایسے آدمی ہوں جن کی ذاتی لائبریریاں اتنی مکمل اتنی جامع اور اتنی عمدہ ہوں جتنی کہ جناب بھٹو کی ذاتی لائبریری ہے۔

یہ لائبریری بعض بڑے امراء' بڑے نوابوں اور والیان ریاست کی طرح شوقیہ اور نمائشی لائبریری نہیں ہے۔ میں نے ایک مرتبہ اس لائبریری کی کچھ کتابوں کو کھول کر دیکھا تو میں نے ان پر کہیں تو سرخ پنسل سے نشان دیکھے کہیں لائینیں کھینچی ہوئی پائیں۔ جن سے مجھے احساس ہوا کہ جناب بھٹو نے یہ تمام کتابیں پڑھی ہیں۔

جناب بھٹو کی اس لائبریری میں خاصی تعداد مذہبی کتابوں کی بھی ہے۔ قرآن پاک کے متعدد نسخے اس لائبریری کی زینت ہیں۔ جن میں مختلف زبانوں کے تراجم بھی شامل ہیں۔

یہ بات شاید بہت سے لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ جناب بھٹو کو مذہب سے خاصا لگاؤ تھا۔ انہوں نے قرآنی اور دینی مسائل پر مجھ سے اکثر بحثیں کی ہیں اور ان بحثوں کے دوران اسلام کے مختلف مکاتبِ فکر کے حوالے کچھ اس اعتماد کے ساتھ پیش کئے کہ مجھے یہ جان کر بے حد حیرت ہوئی کہ ان کا مذہبی مطالعہ کس قدر وسیع ہے۔

وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے' عقیدہ کی یہ پختگی ان کے خون میں شامل ہے۔ انہوں نے اسلام کی خوبیوں' خصوصیت سے معاشی نظام کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ عصبیت کی حد تک ایشیائی بھی تھے۔

www.bhutto.org

جن لوگوں نے ایشیائی اور افروایشیائی کانفرنسوں میں ان کے خطبات پڑھے ہیں یا جنہوں نے اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم پر سے ہونے والی ان کی وہ تقریریں سنی ہیں جو انہوں نے ایشیائی اور افروایشیائی مسائل اور الجھنوں پر کی ہیں' وہ اس بات میں مجھ سے اتفاق کریں گے کہ انہیں ایشیا اور افریقہ کی جملہ تکلیفوں اور دکھوں کا شدید احساس تھا اور ان کی زندگی اس احساس کے گرد گھومتی تھی کہ ایشیائی اور افریقی ممالک اتنے ہی اونچے اٹھ جائیں جتنے کہ اونچے مغربی ممالک ہیں۔ ایشیا اور افریقی ممالک کے باشندے بھی ویسے ہی خوشحال ہوں۔ جتنے کہ مغربی لوگ ہیں۔

میرے نزدیک وہ ان افروایشیائی رہنماؤں کی صفِ اوّل میں شامل تھے' جن میں۔ چواین لائی' صدر سوکارنو اور صدر ناصر کو جگہ ملی ہے۔

جناب بھٹو نے ان تمام ایشیائی رہنماؤں کی عملی جدوجہد کی روداد۔ تمام تر جزئیات کے ساتھ اپنے پیش نظر رکھی تھی۔ انہوں نے ان غلطیوں کا شمار بھی کیا تھا جو ان بڑے ایشیائی رہنماؤں سے سہواً سرزد ہوئیں اور ان محاسن کا ریکارڈ تو آئینہ کی طرح ان کے روبرو رہا جن کے سبب ان ایشیائی رہنماؤں نے اپنے ہاں کے لوگوں کو آگے کی سمت بڑھایا ہے۔

یہ بات زبان قلم پر لانے کی نہیں ہے۔ اس ملک کے اکثر لوگ جانتے ہیں کہ مجھے خطابت سے کتنا تعلق ہے میں اس فن کے اصولوں اور ضوابط کا علم بھی رکھتا ہوں اور عملی طور پر ان کا استعمال بھی جانتا ہوں۔ یقین جانئے گا کہ میں نے جناب بھٹو کو جب پہلی بار بولتے ہوئے سنا تو میں ان سے بے حد متاثر ہوا اور میرا جی بے اختیار چاہا کہ وہ جہاں بھی تقریر کرنے جائیں میں ان کو بولتا سنوں وہی بات کہ .....

دل میں یہ آرزو ہے اے کوثر
وہ کہا کرتے ہم سنا کرتے

ان میں بے پناہ خطابت تھی۔ خصوصیت سے وہ انگریزی زبان کے تو اتنے بڑے خطیب تھے کہ خود اہل زبان ان کی فصاحت و بلاغت کا لوہا مانتے تھے۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل' جنرل اسمبلی اور دوسرے عالمی مباحثوں میں جو خطبے دیئے تھے وہ تاریخ خطابت میں اپنی مثال آپ ہیں۔ سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی میں ان کی سنہ 65ء کی تقریروں کے بارے میں تو سارے عالمی پریس نے بیک زبان یہ اشتہار ساری دنیا کے سامنے پیش کیا تھا کہ انہوں نے جو تقریریں کی ہیں' ایسی تقریریں اقوام متحدہ کے کسی بھی پلیٹ فارم پر ان سے پہلے کسی بھی عالمی خطیب نے نہیں کی تھیں۔

یقیناً ان کی اردو زبان کی تقریریں اس معیار کی نہیں تھیں اور انہیں اردو زبان پر وہ قدرت بھی نہیں تھی جو انگریزی زبان پر انہیں حاصل تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پیپلز پارٹی کی تحریک کے دنوں میں یہاں کے

www.bhutto.org

اکثر سیاست دانوں کو یہ خیال ہوا تھا کہ وہ عوامی رابطہ کی مہم میں ناکام ہو جائیں گے اور موچی دروازے، دہلی دروازے، مینار پاکستان، ناصر باغ، لیاقت باغ، نشتر پارک اور دوسرے عوامی پارکوں میں جمع عوام کو متاثر نہ کر پائیں گے۔

لیکن انہوں نے کئی کئی لاکھ کے اجتماعات کو اپنی کئی کئی گھنٹے کی طویل تقریروں سے جس طرح متاثر کیا۔ اس کی مثال پاک و ہند کی پوری سیاسی تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔

لاہور کے ناصر باغ اور مینارِ پاکستان سے متصل باغ میں ان کی تقریریں سننے کے لئے لاہور اور مضافات لاہور کے جو لوگ جمع ہوئے تھے، ان کی تعداد لاہور کی تاریخ میں بے مثال ہے اور حاضرین کی اس کثرت کی وجہ ان کا خطیبانہ جاہ و جلال اور منفرد اندازِ خطابت ہی تو تھا۔

وہ گو اردو زبان پر اتنی قدرت نہیں رکھتے تھے جتنی کہ بعض دوسرے بڑے خطیبوں کو حاصل تھی مگر وہ خطیبانہ زیر و بم سے خوب آگاہ تھے۔ وہ عوام کی نفسیات کو خوب سمجھتے اور جب بولتے تو عوام کی دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں اور ان کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑنے لگتا۔

وہ بر محل عوام کو ہنساتے بھی تھے۔ جوش بھی دلاتے تھے اور کبھی کبھی رُلا بھی دیتے تھے یہ عوام کا ان سے بے پناہ لگاؤ تھا یا ان کی زبان میں غیر معمولی جادو بھرا ہوا تھا کہ کبھی کبھی اردو زبان پر مکمل قدرت نہ ہونے کے سبب وہ تذکیر و تانیث کی غلطی کر جاتے۔ تو تذکیر و تانیث کی یہ غلطی ان کے منہ سے بڑی بھلی لگتی اور ان کی تقریر کی دلنوازی اور بڑھ جاتی۔

خیال رہے کہ بعد میں ان کی یہ لسانی غلطیاں روز بروز کم ہوتی گئیں ہیں اور وہ آخر میں اردو زبان پر پہلے سے کہیں زیادہ قدرت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

انہوں نے جتنی بھی بڑی تقریریں کیں۔ عموماً وہ انہیں پہلے سے تیار کر لیتے۔ وہ تنہائی میں ان کی پہلے سے مشق بھی کرتے۔ لیکن ان کی بعض بعض معرکتہ الآرا تقریریں ایسی بھی ہیں جو فی البدیہہ اور بر موقعہ تھیں اور ان سے مجمع غیر معمولی طور پر متاثر ہوا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ انہیں ایک بڑا لمبا سفر درپیش تھا اور انہیں مختلف مقامات پر مسلسل تقریریں کرنا تھیں۔ انہوں نے ایک جگہ ایک جلسہ میں تقریر کی۔ اگلے مقام پر وہ جب جلسہ گاہ میں پہنچے اور تقریر کی تو انہیں حاضرین کے انداز سے کچھ ایسے محسوس ہوا جیسے وہ ان کی تقریر میں دلی دلچسپی نہیں لے رہے ہیں جیسے کہ اکثر مقامات کے لوگ لیتے رہے ہیں۔

تقریر کے بعد انہوں نے بعض دوستوں سے اس کی وجہ پوچھی تو ایک دوست نے انہیں بتایا کہ آپ کے آنے سے پہلے فلاں صاحب آپ کی وہ تقریر یہاں دُہرا گئے ہیں جو آپ نے پچھلے مقام پر کی تھی اور جس کے ضروری پوائنٹس آپ نے یہاں بھی لوگوں کے سامنے پیش کئے۔

www.bhutto.org

یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ اس دن شام کو ایک اور جگہ جو جلسہ ہوا۔ اس میں جناب بھٹو نے جو فی البدیہہ تقریر کی وہ نہ صرف حرف بہ حرف بالکل نئی تھی بلکہ اس درجہ مؤثر تھی کہ مجمع منٹ منٹ پر "جئے بھٹو" کے فلک شگاف نعرے لگا رہا تھا۔

میں ان کی خطیبانہ صلاحیتوں کا کسی بھی بڑے عالمی خطیب سے تقابل موزوں نہیں جانتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ہندو پاک کے جتنے بھی بڑے اور اچھے خطیب سیاست کے اسٹیج پر (مذہبی پلیٹ فارم کی بات دوسری ہے) ابھرے ہیں ان میں سے کوئی دوسرا خطیب عوام کو اس درجہ متاثر نہیں کر پایا۔ جتنا کہ جناب بھٹو نے اپنی تحریک کے دنوں میں کیا تھا اور اتنے بڑے اجتماعات کسی بھی ہندی یا پاکستانی خطیب کو میسر نہیں آئے، جتنے کہ جناب بھٹو کو ملے ہیں۔

اس سلسلہ میں جناب بھٹو کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ انہوں نے بڑے شہروں اور قصبوں کے عوام ہی کو لاکھوں کی تعداد میں اپنے گرد جمع نہیں کیا بلکہ وہ دور دراز کے دیہاتی ماحول میں رہنے والے عوام کے دل بھی اس طرح گرماتے رہے ہیں جس طرح انہوں نے شہریوں کے دلوں کو لبھایا ہے۔

انہوں نے سبّی کے ریگ زاروں اور سانگھڑ جیسے سخت مزاج دیہات، قصبات سے بھی داد خطابت وصول کی ہے اور صوابی، مردان، سیدو شریف اور ہنزہ و گلگت کے پہاڑیوں کی رگوں میں بھی احساس کی رو دوڑائی ہے۔

تاریخی نوعیّت کے جلسوں میں تقریر سے پہلے وہ خاص طور پر پورے اہتمام کے ساتھ تیاری کرتے۔ سب سے پہلے وہ موضوع کے پورے پس منظر کو ذہن نشین کر کے، اسے واضح کرتے۔ پھر اس کی فنّی تقسیم کرتے اور پھر اہم اور اصل بات کہنے کے لئے، موزوں ترین لمحے کا انتخاب کرتے۔ اس پورے عمل میں عوام کی شعوری سطح ان کے پیش نظر رہتی، چونکہ وہ عام طور پر یہ سب کچھ انگریزی میں سوچتے تھے۔ اس لئے بعد میں اپنی تقریر کے لئے اُردو الفاظ تلاش کرتے۔ مشکل الفاظ کے متبادل اردُو لفظ تلاش کرتے وقت خاص احتیاط سے کام لیتے۔ وقت پیش آتی تو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتے۔ آخر میں وہ اپنی تقریر کے اختتامیے پر خصوصی توجہ دیتے۔ ان کی کوئی تقریر کبھی یونہی یا اچانک ختم نہیں ہوئی، بلکہ وہ جس طرح اور جس مقام پر اپنی تقریر ختم کرتے، اس کا انتخاب انہوں نے پہلے سے کر رکھا ہوتا، تقریر کے دوران اپنے ساتھیوں کے جذبات کا خاص طور پر خیال رکھتے، انہیں ساتھیوں کے جذبات کا کس قدر احساس رہتا ہے اس کے لئے بھی میں ایک ذاتی سی مثال پیش کرتا ہوں۔

28 فروری سنہ 1971ء کو مینار پاکستان کے سائے میں تاریخی جلسۂ عام سے خطاب کے دوران جب وہ اپنے ساتھیوں کی قربانیوں کا ذکر کر رہے تھے تو نام گنوائے، جوش خطابت میں میرا نام نہ لے سکے۔ اس پر حاضرین میں سے ایک شخص نے "کوثر نیازی کو ثر نیازی" کے نعرے بلند کئے۔ ایک کارکن نے

www.bhutto.org

انہیں خاموش کرانا چاہا تو محترمہ بیگم نصرت بھٹو نے اسے منع کرتے ہوئے ڈانٹ کر کہا۔ "مت منع کرو۔ یہ ٹھیک کہتے ہیں۔" اس دوران بھٹو اپنی تقریر میں کافی آگے نکل چکے تھے۔ جلسہ ختم ہوا تو میں ہجوم کے باعث کافی دیر وہاں پھنسا رہا اور بمشکل تمام نکلا تو تھک چکا تھا۔ اس لئے سیدھا گھر چلا آیا۔ میرے ذہن میں ان کی تقریر کا اثر تھا اور یہ واقعہ یاد تک نہ تھا۔ لیکن رات کو ان کا فون آیا۔ وہ بڑے ملائم لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"تمہارا نام لینا بھول گیا تھا' کہیں تم نے محسوس تو نہیں کیا؟"

ہر چند یہ بات بہت معمولی سی ہے 'لیکن اس سے آپ ان کی اس محبت اور توجہ کا اندازہ کر سکتے ہیں جو وہ اپنے ساتھیوں سے روا رکھتے تھے۔

ان کا حافظہ بہت تیز تھا۔ وہ سالہا سال کی معمولی سے معمولی بات بھی یاد رکھتے تھے انہیں ماضی کے واقعات کی جزئیات حتیٰ کہ تاریخیں اور گھڑیاں تک یاد رہتی تھیں۔

نو سال کی عمر سے لے کر آخری وقت تک کے تمام واقعات ان کے حافظہ کی گرہ میں اس طرح بند تھے کہ وہ جب چاہتے انہیں ذہن کے آئینہ میں اتار لیتے۔ پارٹی کی جدوجہد کے دوران جن لوگوں نے ان کے ساتھ صبح و شام اور دن رات کام کیا ہے وہ سارے کا سارا ان کے سامنے ہر لمحے موجود رہتا ہے۔ وہ جب بھی تحریک کے دوران کسی رفیق کو دیکھتے 'انہیں اس کی ہر بات یاد آ جاتی۔

وہ دنیا کی عظیم تحریکوں کے بانیوں کی طرح اپنی پارٹی اور اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی ہر بات کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔ یہ جائزہ ان کے ذہن میں عموماً محفوظ رہتا اور سالہا سال گزر جانے کے باوجود وہ جب چاہتے اسے اپنے ساتھیوں کے سامنے لے آتے اور ضرورت پڑنے پر اپنے ساتھیوں کو یاد دلاتے کہ تم نے فلاں مجلس محفل یا وقت پر یہ کچھ کہا تھا۔

خواہ بڑی سے بڑی مجلس کیوں نہ ہو رہی ہو وہ اس میں شامل لوگوں کی ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھتے۔ اگر مجلس کے دوران کوئی ایک شریک کسی دوسرے کو اشارہ بھی کرتا تو وہ اسے بھی دیکھ لیتے اور اگر ضرورت محسوس کرتے تو اس پر توجہ بھی اسی وقت کر دیتے۔

ساتھیوں اور رفقائے کار کے معاملہ میں اس درجہ احتیاط کے باوجود وہ دوستوں کی خطائیں معاف کرنے کے عادی تھے۔ وہ بلاوجہ ساتھیوں کے کام میں کبھی مداخلت نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو جو ذمہ داریاں سونپ رکھی تھیں ان کی انجام دہی میں وہ ان کو مکمل آزادی دیتے اور ان کے فہم و فراست اور عملی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ کرتے اور دل سے چاہتے کہ ان کے ساتھی آگے بڑھیں۔ ترقی کریں اور ان کی شخصیتیں روز بہ روز قدم بڑھاتی جائیں۔

www.bhutto.org

میں نے اکثر رہنماؤں کو دیکھا ہے۔ وہ جماعتی قیادت کے دوران خود کو بڑ کا درخت بنا لیتے ہیں اور ان کے نیچے کا کوئی پودا پنپ نہیں سکتا وہ ساتھیوں کو آگے بڑھتے پا کر ان کی ٹانگیں کھینچ لیتے ہیں۔

مگر جناب بھٹو کی بات ان سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی اپنے سایہ میں اُگنے والے پودوں کی مانند خود نشوونما کرتے اور ان کو پھولنے اور پھلنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرتے۔

وہ خود جتنے بڑھتے جاتے ان کے ساتھی بھی اسی رفتار سے ترقی کرتے جاتے۔ اپنے ہر دوست کی صلاحیتوں کے پیش نظر انہوں نے اس سے کام لینے کا منصوبہ پہلے سے بنا رکھا ہوتا۔ کبھی بظاہر ایسا بھی لگتا ہے کہ انہوں نے اپنے بعض دوستوں کو پس منظر میں ڈال دیا ہے۔ مگر درحقیقت وہ مناسب و موزوں وقت کے منتظر رہتے تھے اور جیسے بھی وہ وقت آتا وہ اپنے موزوں دوستوں کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق کام سونپ دیتے۔

جناب بھٹو کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی بڑا دلنواز ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں اور حکومت میں شریک رفقاء کے بعض فیصلوں سے اگر کبھی اختلاف کرتے۔ تو وہ انہیں جو یادداشت بھیجتے اس میں پورے مجلسی آداب ملحوظ رکھتے مثلاً میں نے کافی عرصہ پہلے اپنی وزارت کے ایک عہدیدار کے خلاف ایک ایسی کارروائی کی جس سے انہیں اختلاف تھا اور جسے وہ موزوں نہ سمجھتے تھے۔ وہ یہ کر سکتے تھے کہ میری کارروائی کو اپنے حکم نامہ کے ذریعہ باطل قرار دے دیتے۔ مگر انہوں نے ایسا نہ کیا چند دن بعد مجھ سے فون پر رابطہ قائم کر کے بڑے ہی پُر تکلف انداز میں فرمایا .....

"میری آپ سے ایک درخواست ہے کہ آپ اس آدمی کو معاف کر دیں اور اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں۔"

یہ انداز اپنے وزراء کے ساتھ شاید ہی سربراہان مملکت میں سے کسی نے اختیار کیا ہو جو جناب بھٹو نے کیا۔

البتہ ان کی یہ خواہش ہی نہیں بلکہ نہ بدلنے والی روش تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں سے فرائض منصبی کی ادائیگی میں کسی قسم کے تساہل و تغافل کو گوارہ نہ کرتے تھے اور یہ ضروری جانتے تھے کہ ان کے سارے ساتھی بلا امتیاز و تفریق اپنے منصب کی ذمہ داریاں بحسنِ تمام پوری کریں وقت پر آئیں، وقت پر جائیں۔ آج کا کام کل پر نہ چھوڑیں۔

انہوں نے خود کو اپنے سارے ساتھیوں کے لئے ایک قابل تقلید مثال بنا کر ان کے سامنے پیش کیا۔

انہوں نے جس وقت صدارت کا منصب سنبھالا وہ بڑا نازک وقت تھا ملک کے وقار کو مشرقی پاکستان کے محاذ پر ہماری ذلّت آمیز شکست نے قومی آن کو بہت بُری طرح مجروح کیا تھا۔ ہماری ساری کی ساری اقتصادیات، دیوالیہ پن کی حد تک تباہ ہو چکی تھی۔ مگر انہوں نے ملک کے وقار کو اوپر اٹھانے اور اقتصادی و

www.bhutto.org

معاشی اور سیاسی زندگی کو بحال کرنے کے لئے جو شدید محنت کی۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ کئی کئی دن متواتر وہ اپنے بیوی بچوں سے بالکل نہیں ملے۔ ان کے بچوں اور اہل و عیال کو ہفتوں تک یہ معلوم نہ ہوتا کہ وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہیں؟

وہ رات دن اور صبح و شام متواتر و مسلسل کام کرتے رہتے۔ وہ سات بجے اپنے کام کی میز پر آجاتے اور دو دو بجے رات تک کام میں مصروف رہتے۔ کئی بار رات کو دو بجے میرے ہاں یا دوسرے ساتھیوں کے ہاں، ٹیلی فون کی گھنٹی اچانک بجنے لگتی تو ہم فوراً سمجھ جاتے کہ یہ ٹیلی فون ایوان صدر سے آیا ہے اور ہمیں طلب کیا گیا ہے۔

وہ تو ایمرجنسی کے دن تھے۔ بعد میں بھی ان کے کام کا معمول یہی رہا کہ وہ صبح ساڑھے سات بجے اپنی میز پر موجود ہوتے اور رات کے ساڑھے بارہ بجے تک برابر کام کرتے، صرف کبھی کبھی سہ پہر کو ایک گھنٹے کا وقفہ کرتے۔

کام کی زیادتی کے سبب وہ اکثر دوپہر کا کھانا نہیں کھاتے تاکہ پیٹ بوجھل نہ ہو جائے اور کام متاثر نہ ہو۔

مجھے ساڑھے پانچ سال کے دوران میں ایک واقعہ یا ایک وقت بھی ایسا یاد نہیں ہے۔ جب کہ میں نے کوئی فائل ان کے ملاحظہ کے لئے اپنے ہاں سے بھیجی ہو اور وہ فائل جس تاریخ کو وزیراعظم ہاؤس پہنچی اسی دن انہوں نے اسے پڑھا اور اس پر حکم نہ لکھا ہو۔

یہی حال دوسری وزارتوں سے ان کے پاس جانے والی فائلوں کا تھا۔ وہ روزانہ کی فائلیں روزانہ پڑھتے، حتیٰ کہ دن کی فائلیں دن کو، شام کی فائلیں شام کو اور رات کی فائلیں رات کو پڑھتے اور ان پر احکام اپنے ہاتھ سے لکھتے اور جب تک یہ فائلیں ختم نہ ہو جاتی بستر پر نہ آتے۔

یہ ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ سفر کے دوران یقیناً اس معمول میں فرق آجاتا۔ انہیں جلسوں اور جلوسوں سے خطاب کرنا پڑتا۔ وفود سے ملنا ہوتا۔ عوامی رابطہ قائم کرنا پڑتا۔ مقامی حکام کو ہدایات دینا ہوتیں۔

اس کے باوجود ان کی روزانہ کی ضروری فائلیں وہ جہاں بھی ہوتے ان تک پابندی سے پہنچتی رہتیں اور وہ انہیں وقت نکال کر ضرور ملاحظہ فرماتے اور ان پر احکام لکھتے۔

میں یہ باتیں اس لئے نہیں لکھ رہا ہوں کہ میں ان کی حکومت کا ایک وزیر رہا ہوں۔ ان کے ساتھ وزیراعظم ہاؤس میں کام کرنے والے ہر فرد کو یہ سب کچھ معلوم ہے اور یہ ایک ایسا امر واقعہ ہے جس کی نفی ممکن نہیں ہے۔

www.bhutto.org

پروردگار نے ان کے وجود میں کام کی غیر معمولی صلاحیتیں بھر رکھی تھیں۔ ان سے کم عمر اور زیادہ توانا اہل کار جوان کے شب و روز میں ان کی معاونت کرتے' ان کی باریاں مقرر تھیں۔ وہ ایک دن کام کرتے دوسرے دن چھٹی پر ہوتے کہ ایک دن کے شدید کام کے سبب ان کے جسم تھک جاتے تھے۔ مگر وہ بالکل نہ تھکتے۔

اسے ان کی کام سے لگن کہئے یا حد درجہ فرض شناسی اور احساس ذمہ داری ٹھہرایئے کہ وہ کوئی چھٹی نہ کرتے اور کوئی لمحہ وقت کا بے کار جانے نہ دیتے۔

بسا اوقات ساتھی اور رفقائے کار ان کے پاس بیٹھے ہوتے' ان کی موجودگی کے باوجود ضروری فائلوں کے انبار ان کے سامنے لگے ہوتے وہ ان سے باتیں بھی کرتے جاتے اور فائلیں بھی پڑھتے جاتے' اس انداز کے ساتھ کہ ساتھیوں کو پوری توجہ بھی دیتے اور فائلوں کا مطالعہ بھی جاری رہتا۔ وہ اس دوران فائلوں پر نوٹ بھی لکھتے اور رفقائے کار کی بحث میں حصّہ بھی لیتے۔ دونوں کاموں میں سے کوئی بھی ذرّہ برابر متاثر نہ ہوتا۔

تصنّع اور بناوٹ سے سخت نفرت کرتے' نہ خود اس کے عادی تھے اور نہ ہی اسے اپنے ساتھیوں میں دیکھنا پسند کرتے۔ سستی شہرت حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ مثلاً منافق بالکل نہیں تھے۔ لباس میں بھی منافقت نہ تھی۔ اس معاملے میں وہ بھی قائداعظمؒ کی طرح تھے۔ وہ سوٹ پر انگریزوں یا یورپیوں کا اجارہ نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ تعلیم یافتہ لوگوں کا عالمی لباس بن چکا ہے۔ جناب بھٹو جیسا خوش لباس آدمی آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ لباس کے رنگ اور تراش کا ان کا اپنا معیار تھا جو نت نئے بدلتے فیشن سے متاثر نہیں ہوتا تھا لباسوں کی تعداد کا تو شمار ہی نہیں۔ وہ پہلے ہی سے اتنے سوٹ بنوا چکے تھے اور انہیں ایسی ترتیب سے زیب تن کرتے تھے کہ ہم پہچان نہیں سکتے تھے کہ یہ سوٹ ہم نے پہلے بھی کبھی دیکھا ہے۔ رنگوں کا انتخاب موسم اور وقت کے لحاظ سے کرتے' صبح کا لباس اور ہوتا اور شام کا اور۔

یحییٰ خاں کے دور میں بیرونی سفارت خانوں کی سرگرمیاں عروج پر تھیں لیکن جناب بھٹو نے اقتدار میں آتے ہی انہیں اپنی حدود کار کا پابند بنا دیا۔ پہلے ان کی شبینہ دعوتیں سرکاری افسروں اور کابینہ کے وزراء کی بڑی تعداد سے بارونق ہوا کرتی تھیں۔ جو شراب و کباب پر بے حجاب ہر قسم کے موضوعات پر گفتگو کرتے تھے۔ ان دعوتوں میں شریک ہوتے وقت نہ تو متعلقہ ملک کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کی سطح اور نوعیت کا لحاظ رکھا جاتا نہ پروٹوکول کا۔ یہ چیز ملک کے وقار اور مفاد دونوں کے منافی تھی۔ لیکن جناب بھٹو نے اس کا ایک طریق کار متعین کر دیا اور ان کے دور میں کسی سفارت خانہ کی دعوت میں صرف ایک ہی وزیر جا سکتا اور اس کا فیصلہ بھی وزارت خارجہ کرتی۔ کسی وزیر کو براہ راست نہ دعوت دی جا سکتی اور نہ وہ قبول کر سکتا۔ اگر دعوت موصول ہو بھی جائے تو وہ وزارتِ خارجہ سے پوچھے بغیر اسے قبول نہیں کر سکتا تھا

www.bhutto.org

اور افسروں پر تو بالکل ہی پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں۔ کوئی افسر وزارتِ خارجہ سے خصوصی اجازت نامہ حاصل کئے بغیر سفارت خانوں کی دعوتوں میں شریک نہیں ہو سکتا تھا اسی طرح پہلے افسر اور وزراء سفارت خانوں کے نمائندوں اور سفیروں سے بے محابا ملاقاتیں کر لیا کرتے تھے اور دوران گفتگو ایسی بے احتیاطیاں کر جاتے جو ملک کے مفاد کے لئے ضرر رساں ثابت ہوتیں اِن گفتگوؤں کی بنیاد پر سفارتی نمائندوں کو اپنی رپورٹیں مرتّب کرنے کا موقع مل جاتا اور ان رپورٹوں کو سامنے رکھ کر متعلقہ ممالک کے ماہرین پاکستان کی پالیسیوں اور حالات کا تجزیہ کر کے متعلقہ حکومت کی کمزوریوں اور اس کے منصوبوں سے باخبر ہو جاتے۔ بین الاقوامی تعلقات میں اس قسم کی معلومات اکثر اوقات ملک کو بے پناہ نقصان پہنچانے کا ذریعہ بن جاتیں' یہ روزمرّہ کا سفارتی معمول ہے۔ لیکن ہمارے ہاں اس کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔

جناب بھٹو نے ان ملاقاتوں کے لئے بھی ایک ضابطہ مقرر کر لیا ان کے زمانۂ حکومت میں کوئی وزیر ڈپلومیٹک کور کے آدمی سے اس وقت تک ملاقات نہیں کر سکتا تھا جب تک وزارت خارجہ کا کوئی نمائندہ موجود نہ ہو' یہ نمائندہ صرف حاضر ہی نہ ہوتا بلکہ اس ملاقات کے دوران ہونے والی گفتگو کے باقاعدہ نوٹس بھی تیار کرتا۔ اس کا نتیجہ فطری طور پر یہ ہوتا تھا کہ گفتگو کرنے والے بطورِ خاص احتیاط سے کام لیتے۔ اس طرح بیرونی سازشوں کا اثر و نفوذ بالکل نہ ہو پاتا۔ ان اقدامات سے پاکستان کا وقار بے حد بلند ہوا۔ کسی ملک کے قومی دن پر اس کے سفارت خانے کی دعوت میں اگر کوئی وزیر یا وزیر اعظم خود شرکت کر لیتے تو وہ اپنے لئے اسے بڑا اعزاز تصوّر کرتا۔ شرکت کا یہ فیصلہ بھی ٹھوس بنیادوں پر کیا جاتا' اس کے لئے جائزہ لیا جاتا کہ متعلقہ ملک کے اندر ہمارے سفارت خانے کی طرف سے یوم پاکستان پر دی جانے والی دعوت میں کس حیثیت کے سرکاری نمائندے نے شرکت کی تھی۔ اسی معیار کو سامنے رکھ کر یہاں فیصلہ کیا جاتا کہ پاکستان بھی اسی حیثیت کے نمائندے کو اسلام آباد کے سفارت خانہ میں شرکت کے لئے نامزد کرے۔ اس طرح گویا غیر محسوس انداز میں متعلقہ ملک کو محسوس کرا دیا جاتا کہ پاکستان اپنے قومی وقار کے معاملے میں از حد حسّاس ہے اور وہ کسی بھی ملک کے ساتھ برابری کی سطح پر تعلقات اُستوار رکھتا ہے۔ اسی طرح بیرون ملک سفر کے دعوت نامے بھی براہ راست افراد' اداروں یا شخصیات کو نہ دیئے جا سکتے یہ بھی ایک پرانا سامراجی طریقہ ہے کہ اس طرح کے دعوت ناموں کے ذریعے حکومتیں پاکستان کے با اثر افراد یا اداروں کو ممنون کر کے اپنے زیر اثر لاتیں اور پھر ان کے ذریعے اپنے اثرات یہاں پھیلاتیں۔ یہ بھی رشوت دینے کا ایک جدید طریقہ ہے۔ لیکن بھٹو صاحب نے حکم دے دیا کہ یہ دعوت نامے صرف حکومتِ پاکستان کے توسّط ہی سے دیئے جا سکتے ہیں۔ کوئی بھی شخص خواہ وہ وزیر ہی کیوں نہ ہو اپنے طور پر اس دعوت نامے کو قبول کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ یہ کام صرف وزارتِ خارجہ کا ہے کہ وہ مدعو فرد اور دعوت نامہ دینے والے

www.bhutto.org

ملک کے اصل مقاصد اور دعوت نامے کی غرض وغائت کا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کرے کہ آیا متعلقہ فرد کو اس دورے پر جانا چاہئے یا نہیں؟ بیرونی سازشوں کو روکنے کا یہ بھی ایک مؤثر طریقہ ثابت ہوا۔

خوراک کے معاملے میں جناب بھٹو کافی حد تک بے نیاز طبیعت کے مالک تھے وہ بہت کم خوراک آدمی تھے۔ ان کی پھرتی اور سجاوٹ پن کا راز یہی محتاط خوراک تھی۔ صبح کو وہ صرف چائے کا ایک کپ یا کبھی کبھی ساتھ ایک ٹوسٹ کا ناشتہ کرتے۔ دوپہر کا کھانا عام طور پر نہ کھاتے۔ ان کی عادت سے ہم کابینہ کے ممبروں کو ذاتی طور پر کافی "لطف اندوز" ہونے کا موقع ملتا' جس روز کابینہ کی میٹنگ ہوتی ہم سوچ لیتے کہ آج لنچ کا لازماً ناغہ ہو گا۔ میٹنگ شروع ہونے کے ایک گھنٹہ بعد چائے کا ایک کپ اور ایک دو بسکٹ مل جاتے' اور وقت ایک بجے سے متجاوز ہو جائے تو ایک آدھ سموسہ یا سینڈوچ کی مزید عنایت ہو جاتی' اجلاس خواہ چار پانچ بجے شام سے بھی آگے طول کھینچ جائے اس روز ہماری یہی خوراک ہوتی۔

جناب بھٹو ڈنر عموماً رات کو دس بجے یا اس کے بعد کرتے۔ ان کی مرغوب غذائیں فرائی قیمہ' دال' مچھلی اور مرغ تکہ تھیں۔ جوسوں میں انار کا جوس شوق سے پیتے۔ آم سے بھی رغبت تھی۔ لیکن صرف ایک آدھ آم ہی کھاتے' اچھے ہونے کی حد تک غالب سے اتفاق تھا لیکن "بہت ہوں" کے وہ قائل نہ تھے۔ موسم سرما میں کبھی کبھی اپنے گھر میں سیاہ رنگ کا ایک خاص حلوہ تیار کراتے یہ بھٹو خاندان کا ایک صدری نسخہ ہے جو ایک درخت کی لکڑی کو کوئلے کی طرح جلا کر تیار کیا جاتا ہے۔ اس میں گوند نما ایک چیز ملائی جاتی ہے' سردیوں میں وہ اس حلوے کے دو تین ٹکڑے بھی شوق سے کھاتے۔

کھانا اکیلے کبھی نہ کھاتے۔ اپنے ساتھ چند قریبی دوستوں کو ضرور شامل کرتے۔ کھانے کی میز پر ان کا موڈ بے حد خوشگوار ہوتا اور اس دوران بڑی پُرلطف اور دلچسپ گفتگو کرتے' یہ گفتگو اس وقت نقطۂ عروج پر ہوتی جب کھانا ختم کر چکنے کے بعد وہ سگار سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے' عام طور پر کھانے کے بعد وہ ایک سگار پیتے اور بعد از طعام کی یہ محفل اس سگار کے سلگنے کی مدت کو محیط ہوتی۔ سگار کے ساتھ ہی گیارہ سوا گیارہ کے قریب یہ محفل اختتام کو پہنچ جاتی' کبھی کام بہت زیادہ ہوا تو ایسا بھی ہوا کہ وہ سگار ختم کرنے سے پہلے اٹھ گئے۔ میں ان کی اس محفل میں شرکت کو اپنے لئے بہترین تحفہ تصوّر کرتا تھا' کیونکہ اس دوران ان کی خوشبو بھری باتوں کی مہک کچھ زیادہ ہی تیز اور دلربا ہو جایا کرتی تھی۔

کھانے کے بعد وہ تنہائی میں بیٹھ کر فائلوں کا مطالعہ کرتے اور ان پر احکامات جاری کرتے۔ اس دوران وضاحت طلب امور کے لئے متعلقہ وزیروں سے فون پر بات بھی کرتے جاتے' یہ سلسلہ رات کے ڈیڑھ دو بجے تک جاری رہتا' پہلے وہ صبح ساڑھے سات بجے دفتر آ جایا کرتے تھے' لیکن بعد میں صبح سات بجے اٹھ کر فائلیں اور اخبارات اپنے پاس ہی منگوا لیتے۔ اس دوران وہ نہ صرف اخبارات کا مطالعہ کرتے بلکہ اخبارات میں شائع شدہ ایسی خبروں اور شکایات پر فوری احکامات بھی جاری کر دیتے' جو ان کی توجہ کی

www.bhutto.org

مستحق ہوں۔ پورے نو بجے وہ اپنے آفس میں تشریف لے آتے' کابینہ کا اجلاس بھی عموماً صبح نو بجے طلب کرتے اور ان کا اپنا کام زیادہ ہوتا تو فائلوں کا بکس منگوا کر میٹنگ کے دوران اپنے پاس رکھ لیتے اور ساتھ ہی باہر سے نئی فائلیں بھی تیار ہو کر آتی رہتیں' جن کا مطالعہ کر کے دستخط کرنے کے بعد وہ میٹنگ کے دوران ہی متعلقہ وزراء کو مل جاتیں کئی مرتبہ مجھے بھی ایسی فائلیں ملیں جو صبح کے اخبارات کی خبروں کی روشنی میں جاری کردہ احکامات پر مشتمل تھیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ جب وزیر اعظم کی طرف سے دس بجے صبح اسی روز کے اخبارات کی خبروں کی روشنی میں جاری کردہ احکامات ٹائپ ہو کر ہمیں مل جاتے تو ان احکامات کو جاری کرنے والا صبح کس وقت اپنے کام کا آغاز کرتا ہو گا۔ روزمرّہ کے کاموں کے سلسلے میں کوئی فائل پرائم منسٹر ہاؤس میں ایک دن سے زیادہ نہیں رہتی تھی اوّل تو وہ اسی شام مع احکامات کے ہم تک پہنچ جاتی ورنہ اگلے روز صبح کو لازماً اور اگلے روز نہ آئے تو ہمیں تشویش ہونا شروع ہو جاتی اور ہم یہ تصوّر کر لیتے کہ وہ لازماً پرائم منسٹر ہاؤس نہیں پہنچی ورنہ احکامات کے ساتھ واپس آچکی ہوتی' فائل کا مطالعہ وہ کس تفصیل اور توجہ سے کرتے تھے' اس کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ بیشتر اہم فقرے ان کے اپنے قلم سے خط کشیدہ ہوتے اور کئی بار تو ان کے قلم نے املاء کی اغلاط تک کی تصحیح کی ہوتی۔ سفر کے دوران جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں اہم فائلوں کا بکس ان کے ساتھ رہتا جن کا مطالعہ کر کے وہ اپنے احکامات کے ساتھ یہ فائلیں واپس بھجواتے رہتے' فائلوں پر وہ جو نوٹ لکھتے ان میں سرکاری احکامات کی روائتی خشکی اور بدمزگی نہ ہوتی تھی۔ ان کے نوٹ زبان و ادب اور وسیع معلومات کا شاہکار ہوتے۔ اس معاملے میں بھی ان کی خوش ذوقی بے مثال ہے۔ وہ صرف مواد حسن ہی کے قائل نہیں' ہیئت کا حسن بھی ملحوظ خاطر رکھتے۔ جب میں وزیر اطلاعات تھا تو میں نے ان کی اسی خوش ذوقی کو مدّنظر رکھتے ہوئے جناب بھٹو کو بھیجی جانے والی فائلوں کے کور کا ایک خصوصی ڈیزائن تیار کرایا' جس کے چاروں طرف نیلے رنگ کا بارڈر تھا اور اوپر نمایاں طور پر خوبصورت حروف میں طبع تھا ..... "سمری فار دی پریذیڈنٹ" ..... کور کے درمیان میں ایک چوکھٹے کے اندر خالی جگہ تھی جس پر ٹائپ کر کے' ایک چٹ چسپاں کر دی جاتی تھی' اس میں فائل سے متعلقہ کیس کا موضوع لکھا ہوتا تھا۔ جس وقت یہ فائل ان کے پاس گئی تو انہوں نے یہ طریقہ بے حد پسند کیا اور احکامات جاری کر دیئے کہ دوسری وزارتیں بھی اسی طریقے پر عمل کریں چنانچہ اب تک وزیر اعظم ہاؤس جانے والی فائلوں کے سلسلے میں یہی طریقہ رائج ہے۔

کام کی رفتار' کثرت اور تسلسل کا جو عالم تھا اسے بیان کرنے کے لئے کم از کم میرے پاس الفاظ نہیں ہیں' یہاں وہ کوئی دوسری ہی مخلوق معلوم ہوتے' کیونکہ جتنا زیادہ اور جس اعلیٰ معیار کا کام وہ کرتے' یہ کسی انسان کے بس کی تو بات نہیں یہ طاقت اور توانائی اللہ تعالیٰ نے انہی کو ودیعت کی تھی۔ جس روز ان کی صدارت میں کوئی اجلاس ہونے والا ہوتا ہم لوگ تمام کام چھوڑ دیتے۔ ایجنڈے پر خواہ ایک ہی شق کیوں

www.bhutto.org

نہ ہو ، وہ مسئلے کی گہرائی میں اترتے 'ایک ایک جز پر بات کرتے۔ دوسروں کے تفصیلی خیالات بڑی توجہ سے سنتے اور پھر ایک ایک نکتے کو نمایاں کر کے بالترتیب سب کو اظہارِ خیال کی دعوت دیتے۔ سب کی رائے سن کر اس کا محاکمہ کرتے۔ ان کی سربراہی میں مسائل پر غور کرتے وقت ہم پر اکثر نئے نئے پہلوؤں کا انکشاف ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ مختصر سے مختصر کابینہ میٹنگ بھی چار پانچ گھنٹے سے کم کی نہ ہوتی۔ بلکہ جو میٹنگ اس عرصے میں ختم ہو جاتی تو ہم خوشی محسوس کرتے 'ہم میں اکثر اس میٹنگ کے کام کی وجہ سے تھک جاتے لیکن جناب بھٹو کو دن میں ایسی کئی میٹنگوں کی صدارت کرنی ہوتی اور وہ ہر میٹنگ میں اسی طرح تازہ دم اور حاضر دماغ ہوتے اس پر مختلف انٹرویوز مستزاد تھے۔ وہ دن میں بے شمار لوگوں سے ملاقاتیں کرتے 'سب کی باتیں توجہ سے سنتے اور خوش اخلاقی سے انہیں جواب دیتے۔ اہم امور پر نوٹ بھی لکھتے جاتے اور ان نوٹس کی روشنی میں متعلقہ محکمہ کو احکامات بھی جاری کرتے۔ اس کے علاوہ اپنے نام موصول ہونے والے اہم خطوط کا ذاتی طور پر مطالعہ بھی کرتے اور ان کی روشنی میں ہی احکامات بھی جاری کرتے میں نے خود کئی مرتبہ انہیں عوام کے خطوط کی فائل کا توجہ سے مطالعہ کرتے اور احکامات جاری کرتے دیکھا ہے 'بعض خطوط کا خلاصہ تیار کر کے ان کے مطالعے کے لئے پیش کیا جاتا۔ عوام کے خطوط کا مطالعہ کرنے 'ان پر اقدامات اور ان کے ذاتی مطالعہ کے لئے خطوط کا انتخاب اور ان کا خلاصہ تیار کرنے کیلئے پرائم منسٹر ہاؤس میں ایک مستعد اور خصوصی شعبہ مخصوص تھا۔ روزمرہ کے ان بے شمار اور تھکا دینے والے کاموں کے ساتھ وہ کراچی ' لاہور اور راولپنڈی کے اخبارات کا مطالعہ بھی کرتے۔ لندن اور نیویارک کے چند منتخب اخبارات بھی باقاعدگی سے پڑھتے 'اس کے علاوہ رسالوں میں ٹائم 'نیوز ویک 'فار ایسٹ اکنامک ریویو اور اکانومسٹ بھی ان کی نگاہ سے ضرور گزرتے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ محکمہ اطلاعات کے ان ذمہ داروں کو 'جن کی ڈیوٹی ہی مطالعہ کرنا ہے 'یہ جرائد بعد میں پڑھنے کا موقع ملتا اور وہ پہلے ہی سے پڑھ کر متعلقہ امور میں استفسار یا حکم جاری کر چکے ہوتے اور یہ لوگ وزیراعظم ہاؤس سے موصول ہونے والے حوالے دیکھ کر بعد میں ان رسائل کی ورق گردانی کرتے۔

شام کے وقت کام کے دوران وہ ٹیلی ویژن بھی دیکھتے رہتے 'یہ محض تفریح نہ ہوتی بلکہ وہ پوری ناقدانہ نظر سے اس کا جائزہ لیتے۔ اگر پروگرام میں کوئی خامی نظر آتی تو اسی وقت بذریعہ ٹیلی فون متعلقہ سربراہ کو اس کی طرف متوجہ کر کے 'مشورہ دیتے' کبھی کبھی کوئی اچھی فلم بطور خاص دیکھتے۔ شروع میں جب وہ صدر مملکت اور میں وزیر اطلاعات تھا تو ان کی فرمائش پر میں سنسر بورڈ والوں سے کہہ کر کوئی معیاری در آمدی فلم منتخب کرواتا اور انکے ملاحظے کے لئے ایوانِ صدر بھجوایا کرتا۔ فلم دیکھتے وقت وہ اپنے قریبی اور منتخب دوستوں کو بھی بلوایا کرتے ان میں عام طور پر میرے علاوہ ممتاز بھٹو 'عبدالحفیظ پیرزادہ 'رفیع رضا اور غلام مصطفیٰ جتوئی بھی شامل ہوا کرتے تھے۔

www.bhutto.org

مطالعۂ کتب کے بارے میں بھی میں نے ان جیسا مستعد اور باخبر آدمی کوئی نہیں دیکھا۔ تازہ کتابوں کے وہ شیدائی تھے۔ کسی محفل میں جب کسی کتاب کا ذکر آیا تو میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ وہ اسے پہلے سے ہی پڑھ چکے ہیں اور اگر اتفاق سے کبھی ایسا ہوا کہ مذکورہ کتاب ان کی نگاہ سے نہ گزری ہو تو وہ فوراً پوچھتے یہ کس پبلشر نے، کس ملک میں اور کب چھاپی ہے؟ چند ہی روز بعد وہ کتاب ان کی میز پر پڑی دکھائی دیتی۔

فن تعمیر میں ان کی دلچسپی بہت گہری اور ماہرانہ تھی۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو سے لوگ عام طور پر واقف نہیں۔ وہ دنیا کے مختلف فنون ہائے تعمیر کا پورا علم رکھتے تھے اور طرزِ تعمیر میں ظاہر ہونے والی قومی امنگوں اور قدروں کا تجزیاتی مطالعہ کرتے رہتے۔ عمارتوں کی زیبائش و آرائش کو بامعنی بنانے کے قائل تھے۔ بے مقصد نمود و نمائش کو ہلکا پن تصوّر کرتے۔ پرائم منسٹر ہاؤس جہاں وہ مقیم رہے ایوب خاں اور یحییٰ خاں کے زمانے میں ایوانِ صدر ہوا کرتا تھا۔ میں نے ان دونوں کے دور میں بھی اس عمارت کا حال دیکھا ہے۔ لیکن میں نے وہاں ہمیشہ ماحول کو ڈل، افسردہ اور ٹھٹھرا ہوا ہی پایا۔ لیکن جناب بھٹو نے وہاں کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ انہوں نے عمارت کے تناسب کو مدِّنظر رکھتے ہوئے جگہ کا انتخاب کر کے ایک شاندار ہال تعمیر کرایا۔ یہ گوناگوں مقاصد کا حامل ہے۔ یہاں وہ مختلف اجلاس بھی طلب کرتے۔ اندر ہی ایک اسٹیج بنا ہوا ہے، جس پر فن کار پرفارمنس دے سکتے ہیں، اس ہال میں فلم شو بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ہال جدید چین کے ہالوں کی طرز پر تعمیر کیا گیا ہے۔ میں نے چین کے سفر کے دوران ہر جگہ ایسے ہال دیکھے ہیں، کئی نئے دفاتر بھی تعمیر کئے جا چکے ہیں، مختلف مقاصد کے لئے نئی عمارتیں بنوائی جا چکی ہیں، کابینہ روم جس میں پہلے ایوب خاں اور یحییٰ خاں اپنی کابینہ کے اجلاس بلایا کرتے تھے۔ ایک نہایت بے ڈھنگا اور لمبوترا سا بدنما کمرہ تھا۔ جس میں نہ نوشتوں کی ترتیب میں کوئی حسن ہوا کرتا تھا اور نہ ماحول کو خوشنما بنانے کے لئے در و دیوار پر کوئی نقش کاری تھی اور نہ کوئی تصویر ہی آویزاں تھی۔ لیکن بھٹو صاحب کے دور میں اس کی دیواروں پر شیشہ کاری کا فن کارانہ کام کرایا گیا، کابینہ کے ارکان کے ڈیسک پر جدید ترین مائک سسٹم قائم کیا گیا جو صرف ایک بٹن دباتے ہی کام شروع کر دیتا۔ دیواروں پر مشاہیر کی تصاویر آویزاں کی گئیں جو نامور مصوّروں کے شاہکار ہیں۔ یہی عالم انتظار گاہ کا ہے۔ جہاں پہلے ایک بے ہنگم اور لایعنی سے ماحول میں ملاقاتی بیٹھا کرتے تھے۔ ان میں غیر ملکی نمائندے بھی ہوتے تھے، جو سربراہِ مملکت سے ملنے آتے، یہاں بیٹھ کر انہیں کوئی اندازہ نہ ہوتا تھا کہ جس ملک کے سربراہ سے ملنے کے لئے وہ آئے ہیں اس کی تاریخ کیا ہے؟ اس کا ماضی کیا ہے؟ اس کا قومی تشخص کیا ہے؟ لیکن اب اس کی تزئین پورے قومی پس منظر کو اجاگر کرتی۔ دیواروں پر سلطان ٹیپو سے لے کر احمد شاہ ابدالی تک، مختلف قومی مشاہیر کی پینٹنگز آویزاں کی گئیں۔ اب یہاں بیٹھنے والے بالخصوص غیر ملکی نمائندے ایک ہی نظر ماحول پر ڈال کر اندازہ کر لیتے کہ وہ کسی قوم کے وزیرِ اعظم سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔ اس ملک کی تاریخ کیا ہے اور وہ کتنا باوقار اور

www.bhutto.org

شاندار ماضی کا حامل ملک ہے؟۔

پرائم منسٹر ہاؤس کا رہائشی حصہ بھی، جہاں ان کا دفتر اور ملاقاتوں کا کمرہ "گرین روم" واقع تھا، جناب بھٹو کی خوش ذوقی اور احساس جمال کی گواہی دیتا تھا یہ گرین روم پہلے بھی موجود تھا، جہاں ایوب خاں اور یحییٰ خاں ملاقاتیں کیا کرتے تھے، لیکن آج کے اور اس وقت کے گرین روم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کتابوں کا انتخاب جو اس کمرے میں موجود ہے، ملاقاتی کو بہت اچھی طرح متاثر کرتا ہے۔ ماضی میں یہاں کتابوں کا وجود تک نہ تھا۔ اب اردو اور انگریزی کی بہترین اور معیاری کتابیں موجود ہیں۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے اپنی جو کتابیں ذاتی طور پر مطالعہ کے لئے ان کی خدمت میں پیش کی تھیں، انہوں نے ان کتابوں کو اس لائق سمجھا کہ گرین روم کے منتخب ذخیرہ کتب میں انہیں شامل کیا جائے۔ ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کا نقشہ بھی بالکل بدل چکا ہے۔ یہاں بھی دیواروں پر شیشہ کاری کا نفیس کام کرایا گیا اور نامور مصوّروں کی شاہکار تصاویر یہاں آویزاں کی گئی ہیں۔ ان میں مغل بادشاہوں اور شیر شاہ سوری وغیرہ کی تصاویر بھی شامل ہیں، یہاں کے کمرۂ انتظار کی آراستگی و پیراستگی بھی دیدنی ہے۔ اس پورے اہتمام نے پرائم منسٹر ہاؤس کے منظر کو مجموعی طور پر ایک قومی کردار کا حامل بنا دیا ہے جو نہ صرف ہماری تہذیب اور تاریخ کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ اپنے ملک کے فنکاروں کی عظیم تخلیقی صلاحیتوں کا بھی امین ہے، یہاں بھی جناب بھٹو کی قوم پرستی کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔ پرائم منسٹر ہاؤس کے لان کے ایک حصّے میں جس موزوں انداز کے ساتھ فوارہ لگایا گیا ہے اور جو نئی تبدیلیاں کی گئی ہیں ان کی بدولت پرائم منسٹر ہاؤس کا حُسن اب عظیم اقدار، جمال اور گہرے مفہوم کا حامل بن گیا ہے۔

تمام اہم قومی تعمیرات کے نقشے وہ ذاتی طور پر منظور کرتے۔ ان کے دور میں کسی نامراد عاشق کی حسرتوں سے آلودہ قطرۂ اشک، کسی عمارت کا روپ دھار کے، شاہراہ قائداعظم لاہور کے تاریخی [illegible] کو بدنما نہیں کر سکتا تھا وہ قومی تعمیرات کے نقشوں کا جائزہ نہ صرف معنوی طور پر لیتے بلکہ وہ جس ماہرانہ انداز میں بحث کرتے اس سے پتہ چلتا کہ انجینئرنگ کے موضوع پر انہیں کتنی دسترس حاصل ہے۔ کراچی [illegible] نئی حسن کاری کی بہت دُھوم ہے۔ لیکن بہت کم یہ لوگ جانتے ہیں کہ یہ ساری تبدیلیاں جناب [illegible] دلچسپی کا نتیجہ ہیں اِس شہر کی حسن کاری کی ایک ایک چیز ان کی ذاتی دخل اندازی کی مرہون منت ہے۔ یہی حال اسلام آباد ایئرپورٹ کی جدید صورت اور ایئرپورٹ سے ملحقہ سڑکوں کا ہے [illegible] کی تزئین کے لئے بھی وہ برابر ہدایات دیتے رہتے۔

آج تک پاکستان کے قومی دن کی پریڈ جس انداز سے اور جس مقام پر ہوتی تھی، اس میں کوئی وقار اور ندرت نہیں پائی جاتی تھی۔ لیکن بھٹو صاحب کے زمانے میں اس قومی دن کے شایانِ شان اسلام آباد میں ایک سکوئر بنایا گیا ہے جو ہمارے ماضی اور قومی یکجہتی کی ایک علامت ہے۔ اس میں قومی دن کی پریڈ ہوا

www.bhutto.org

کرے گی اور نشستوں کا بندوبست باوقار انداز میں وسیع پیمانے پر ہو گا۔ اسلام آباد میں مسجد فیصل کے نقشے کی منظوری اور تعمیر میں ان کی براہ راست سرپرستی موجود رہی ہے وہ فن تعمیر کے موضوع پر جب بولتے تو پتہ چلتا کہ انہوں نے اس کا کتنا گہرا مطالعہ کیا ہے۔

مذہبی طور پر وہ حد درجہ شدید جذبات رکھتے تھے۔ رسول خدا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات مبارک سے ان کا لگاؤ ان کے ہر قریبی ساتھی کے علم میں ہے۔ جب وہ عمرہ کے لئے گئے تو روضہ مبارک پر جس طرح روئے' اسے قریب سے دیکھنے والوں کی رائے ہے کہ اپنے تمام رفقاء میں سب سے وہی متاثر نظر آ رہے تھے۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ وہ رسول خدا کو بطور ایک تاریخ ساز انسان کے بھی اپنا سب سے بڑا ہیرو سمجھتے تھے' اسلام کے موضوع پر انہوں نے نہ صرف مستشرقین کی کتابیں پڑھی تھیں بلکہ خود پاکستان اور دنیائے اسلام کے نامور اہل قلم کی کتابیں بھی ان کے زیر مطالعہ رہتیں۔

ان کا دل بے حد نرم اور دردمند تھا' کسی انسان کو دکھ میں دیکھ کر وہ بے قابو ہو جاتے۔ اپنے رفقاء کے لئے ان کے دل میں بے پناہ محبت تھی' ہمارے جواں سال ساتھی شیر پاؤ جب شہید ہوئے اور وہ واپس وطن آئے تو ان کی آنکھیں کثرت گریہ سے سرخ اور متورم تھیں۔ یہی حال ان کا اپنی ہمشیرہ کی موت پر ہوا تھا۔ خود میرے جگر گوشے فاروق نیازی کا جب حادثہ ہوا ہے تو وہ لاہور میں تھے۔ علاج کے دوران وہاں سے روزانہ ٹیلی فون کر کے حالات و کیفیت دریافت کرتے۔ ان کے انداز تخاطب سے اندازہ ہوتا تھا جیسے ان کا اپنا بیٹا زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا ہو۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ امانت واپس لے لی تو ان کا بہت ہی درد بھرا ٹیلی فون آیا' لاہور سے واپس اسلام آباد آئے تو اپنے گھر جانے کے بجائے سیدھے میرے ہاں تشریف لائے اور کافی دیر تک فرش ماتم پر غم زدہ بیٹھے رہے۔ ان کی باتوں اور گہرے تاثر نے ہمیشہ اس ناقابل تصوّر غم کو برداشت کرنے میں میری بے پناہ مدد کی۔

تمام پالیسیوں اور پروگراموں کی وہ برسوں پہلے سے منصوبہ بندی کر لیتے اور مستقبل میں سامنے آنے والے تمام موڑ پہلے ہی سے ان پر روز روشن کی طرح عیاں ہوتے۔ وہ اچھی طرح باخبر ہوتے کہ کس مرحلے پر انہیں کیا فیصلہ کر کے' کون سے نتائج حاصل کرنا ہیں۔ انہیں اپنے فیصلوں ہی کا نہیں بلکہ بر آمد ہونے والے نتائج کا بھی نہ صرف علم ہوتا بلکہ وہ ان نتائج کو خود پیدا کرتے' لیکن کوئی دوسرا شخص خواہ کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو' ان کے فیصلوں سے واقف نہ ہو سکتا۔ مثال کے طور پر جن دنوں انتخابات کی آمد آمد کا چرچا تھا۔ ان کی تیاریاں بھی جاری تھیں۔ ان کے وقت کا کسی کو بھی علم نہ تھا۔ خود جناب بھٹو اس مسئلے پر اپنے ساتھیوں سے گفتگو کرتے' ان کی رائے پوچھتے۔ لیکن کوئی یہ نہ کہہ سکتا کہ خود ان کا اپنا ارادہ کیا ہے؟ حالانکہ ہمیں یقین ہے کہ وہ کئی سال پہلے نہ صرف تفصیل سے پورا پروگرام مرتب کر چکے ہوں گے بلکہ تاریخ کا تعین بھی کر لیا ہو گا۔

www.bhutto.org

انہیں اپنے وہ ساتھی سخت ناپسند تھے جو خفیہ باتوں کے سلسلے میں غیر محتاط یا انہیں ہضم نہ کر سکیں۔ ایک زمانے میں ذرا سی غیر شعوری لغزش پر میں اس کی کافی سخت سزا پا چکا ہوں۔ یہ سنہ 1970ء کی بات ہے۔ میں جناب بھٹو کے ساتھ راولپنڈی کے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں مقیم تھا۔ رات کو ہم کھانے پر اکٹھے ہوئے۔ مصطفیٰ کھر ان دنوں لاہور میں تھے۔ دوران گفتگو شیر پاؤ مرحوم اور کھر کے موازنے کی بات چھڑ گئی۔ جناب بھٹو کا فیصلہ شیر پاؤ کے حق میں تھا۔ انہوں نے کہا "وہ میرا بیٹا ہے اور اس کی پارٹی اور قیادت کے ساتھ وفاداری شک و شبہ سے بالاتر ہے" اس وقت میری رائے مصطفیٰ کھر کے حق میں تھی۔ واپس لاہور جا کر کھر سے ملاقات ہوئی تو میں نے بلا ارادہ اس محفل کا ذکر چھیڑتے ہوئے صرف مثبت پہلو کو سامنے رکھا اور یہ کہا کہ "بھٹو صاحب شیر پاؤ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ میرے نزدیک ایک ساتھی کی تعریف کا ذکر کر دینا ایسا بُرا فعل نہ تھا۔ میں نے یہ تک نہیں بتایا تھا کہ اس تعریف کا موقع کیا تھا اور یہ کس سلسلے میں کی گئی تھی۔ ظاہر ہے اس ایک فقرے میں نہ کوئی بُرا مقصد تھا اور نہ اس مین کسی راز کا افشا کر کے جناب بھٹو اور کھر کے مابین منافرت کی تخم ریزی کا پہلو تھا۔ لیکن کھر مجھ سے زیادہ جناب بھٹو کے مزاج شناس تھے' میں ابھی نیا نیا ان کے قریب آیا تھا۔ کھر نے اسی مختصر سی بات کو خوب بڑھا چڑھا کر جناب بھٹو کے گوش گذار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس میں مذکورہ محفل اور اس کے ایک فقرے کا حوالہ موجود تھا' جس نے کھر کی تمام رنگ آمیزیوں کو بنیاد فراہم کر دی تھی۔ لہٰذا جناب بھٹو اس پر خفا ہو گئے اور کئی دنوں تک الفاظ کا سہارا لئے بغیر محض اپنے اطوار اور اشاروں کنایوں سے مجھے احساس دلاتے رہے کہ وہ مجھ سے ناراض ہیں۔ میں شدید ذہنی کرب سے دوچار ہوا اور آخر کار اس ناکردہ گناہ کے بارے میں پوچھ ہی لیا' جس کی سزا مجھے دی جا رہی تھی۔ شدید اصرار کے بعد یہ راز کھلا کہ کس نے کیا کرم فرمائی کی تھی؟ میں نے وضاحت تو کر دی لیکن اس دوران زندگی بھر کے لئے مجھے سبق مل چکا تھا اور میں جان چکا تھا کہ جناب بھٹو بڑی سختی کے ساتھ اس قول رسولؐ پر عمل چاہتے ہیں جس میں دوران مجلس ہونے والی تمام باتوں کو امانت قرار دیا گیا ہے۔

ان کی سیاست کا مرکز و محور صرف اور صرف رائے عامہ تھی۔ ان کا یقین تھا کہ آخری نتیجے میں عوام کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے۔ جدوجہد کے زمانے میں تو وہ زمین کا گز بن ہی گئے تھے ایوان اقتدار میں آنے کے بعد بھی وہ دوسرے حکمرانوں کی طرح محصور ہو کر رہ گئے تھے رائے عامہ کے ہر طبقے اور ہر گوشے سے ان کا براہ راست تعلق قائم تھا۔ ایک زمانے میں جب انہوں نے کھلی کچہریوں کا سلسلہ شروع کیا تھا تو اس کی تہہ میں بھی رائے عامہ سے براہ راست رابطے کا مقصد کار فرما تھا۔ ان کچہریوں سے ان کی مراد یہ تھی کہ یہاں عوام بلا خوف و خطر اپنی تکالیف کا اظہار کریں تاکہ انتظامیہ کے بارے میں لوگوں کے جذبات و مشکلات کا انہیں پوری طرح علم ہو سکے اور وہ افراد کی ذاتی مشکلات حل کرنے کے علاوہ ان کی شکایات

www.bhutto.org

سے اخذ کردہ مجموعی نتائج کی روشنی میں انتظامیہ کی اصلاح کر سکیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں بعض وزرائے اعلیٰ نے نوکر شاہی کا تابع مہمل بن کر ان کچہریوں کا جس طرح حلیہ بگاڑا اور ان کے انعقاد کے اصل مقصد کو جس طرح مجروح کیا وہ حد درجہ افسوسناک ہے۔ افسران ہر کھلی کچہری سے دس پندرہ دن قبل اس میں شریک ہونے والوں کی باقاعدہ فہرستیں مرتب کرتے' اور پھر ان کے منہ میں جو شکایات ڈالی جاتیں ان کی ریہرسلیں بھی فرماتے۔ جناب بھٹو کو جب ان حرکات کا علم ہوا تو انہوں نے نہ صرف کچھ وقت کے لئے ان کچہریوں کا سلسلہ موقوف کر دیا بلکہ اس حرکت پر وزرائے اعلیٰ کی سرزنش بھی کی۔ یہ سارے طریقے بنیادی طور پر وہ اس لئے اختیار کرتے تھے کہ عوام کے احساسات و جذبات کا انہیں ہر وقت علم رہے۔ وہ اپنے تمام فیصلوں میں رائے عامہ کو خاصی اہمیت دیتے۔ لیکن اس کا مقصد یہ نہ تھا کہ وہ کمزور لیڈروں کی طرح بلاوجہ کسی دباؤ کے سامنے جھک جائیں۔ اپنے وہ مؤقف' جن کے بارے میں وہ دیانت داری سے سمجھتے کہ ان پر قائم رہنا قومی و ملکی مفاد اور فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہے' ان سے وہ کبھی نہ ہٹتے۔ لیکن ایسا کرتے وقت وہ ہٹ دھرمی کا راستہ بھی اختیار نہ کرتے' بلکہ اس کے لئے وہ ایک خصوصی حکمت عملی مرتب کرتے۔ جس میں رائے عامہ کی تربیت کی جاتی۔ مسائل کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کر کے نفع و نقصان کے تناسب کو نمایاں کیا جاتا۔ پھر وہ ایسے موزوں وقت کا انتظار کرتے جب جذبات کی دھند چھٹ جائے اور عقل و ہوش کی طاقتیں صحیح فیصلہ کرنے کی اہل ہو جائیں اور حقائق پوری طرح نکھر کر سامنے آجائیں۔ اس سلسلے میں ''بنگلہ دیش منظور نامنظور'' کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

جناب بھٹو کی طے شدہ رائے تھی کہ مسلم بنگال ہماری نفرت کا مستحق نہیں۔ ویسے بھی تعلیمات رسولؐ میں کسی مسلمان کے ساتھ تین دن سے زیادہ بول چال کا خاتمہ یا انقطاع تعلق ناجائز اور حرام ہے۔ کجا یہ کہ ایک پوری قوم کو اس سلوک کا سزاوار ٹھہرا دیا جائے۔ وہ برصغیر کے مستقبل کا جو نقشہ اپنے ذہن میں رکھتے تھے اس میں بھی بنگلہ دیش کو ایک اہم کردار ادا کرنا تھا۔ مگر لوگ تھے کہ ان پر شکست کے گہرے اثرات ہذیان بن کر طاری تھے۔ یہ ایک شدید جذباتی کیفیت تھی' جس میں ملّت کا باشعور اور دانشور طبقہ بھی مبتلا ہو گیا تھا۔ کسی کے سامنے کوئی واضح راہ عمل نہیں تھی۔ یہ کیفیت سمجھ میں آنے والی تھی۔ ایک ایسی قوم جس نے ماضی سے ہمیشہ کامیابی اور فتوح کا ورثہ پایا ہو اپنی تاریخ کی سب سے بڑی شکست کو آسانی سے ہضم نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن شکست کے دکھ کو سینے سے لگا کر خودکشی بھی نہیں کی جا سکتی' قوم کو بہرحال زندہ رہنا ہوتا ہے اور جدوجہد اور حقیقت پسندی سے کام لے کر اپنے وقار کو بحال بھی کرنا ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر رہنماؤں کا کام انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ کوئی اناڑی سیاستدان ہوتا تو تاریخ کے اس نازک مرحلے پر یا تو عوامی دباؤ کے سامنے جھک کر ملکی مفاد کے خلاف ایسا فیصلہ کر جاتا جو بعد میں قوم کے لئے

www.bhutto.org

نقصان دہ ثابت ہوتا اور یا پھر رائے عامہ سے بے نیاز ہو کر یکطرفہ طور پر بنگلہ دیش کو تسلیم کر لینے کا اعلان کر دیتا۔ مگر اس وقت کی صورت حال اتنی نازک تھی کہ ایسا کرنے پر ملک ایک شدید قسم کے ایجی ٹیشن کی زد میں آجاتا اور کسی مستحکم حکومت کا وجود برقرار رکھنا محال ہوتا۔ ظاہر ہے کہ داخلی اور بیرونی دونوں دشمن اس کا فائدہ اٹھاتے اور نہ جانے پاکستان کس قسم کے حالات سے دوچار ہو جاتا۔ مگر جناب بھٹو نے ان میں سے کسی ایک راستے کا بھی انتخاب نہ کیا' وہ اس مسئلے کو لے کر عوام میں گئے۔ لیاقت باغ راولپنڈی اور کراچی کے عظیم اجتماعات میں انہوں نے عوام کی رائے معلوم کی۔ مگر جواب نفی میں پایا اس کے باوجود وہ دل برداشتہ نہیں ہوئے اور ایک ماہر معالج کی طرح وہ اپنے مریض کے علاج میں مشغول رہے۔ ماہرانہ انداز میں ذرائع ابلاغ کو استعمال کیا' مذاکرے کرائے اور اخبارات میں دونوں نقاطِ نظر کی روشنی میں طویل مباحثے چلے۔ فوائد اور نقصانات کو الگ الگ نمایاں کیا اور ایسی فضا تیار کی کہ قوم کا اجتماعی ضمیر اس کڑوی گولی کو نگلنے پر آمادہ ہو سکے۔ جس میں اس کی اپنی صحت اور مفاد مطلوب تھا اور پھر تسلیم کرنے کے فیصلے کا اعلان کرنے کی خاطر جس وقت کا انتخاب کیا وہ اپنی مثال آپ تھا' اس موقع پر بنگلہ دیشی لیڈروں کی آمد نے لاہور کے مشتعل مزاج کو نہ صرف ٹھنڈا کیا بلکہ مائل بہ محبت کر دیا یہ واقعہ تاریخ سیاست کا ایک ایسا عجیب و غریب باب ہے جس کا جتنا تفصیلی اور جس جس پہلو سے بھی مطالعہ کیا جائے' تاریخ کے طالب علموں کو اتنی ہی بصیرت و رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

www.bhutto.org

بیسواں باب

مستقبل کا صورت گر

ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ حادثہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنی پارٹی کا منشور پورے اور نارمل پاکستان کی صورت حال کی بنیاد پر مرتب کیا تھا۔ لیکن جب انہیں اقتدار دیا گیا تو پاکستان نہ پورا تھا اور نہ ہی نارمل' لیکن اس کے باوجود انہوں نے اقتدار سنبھالتے ہی خارجہ اور داخلی مسائل سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ اپنے منشور پر بھی عمل شروع کر دیا اور پاکستان ایشیا کا واحد ملک ہے جہاں ایک سیاسی پارٹی نے اپنے انتخابی منشور کو حالات کی ناسازگاری اور دگرگونی کے باوجود اس طرح عملی جامہ پہنایا ورنہ یہاں انتخابی وعدے کون پورے کرتا ہے؟ یہ ابھی انقلاب کی ابتدا ہے۔ بھٹو کے ذہن میں اس انقلاب کو جس کی انہوں نے ابتدا کی ہے تکمیل تک پہنچانے کا ایک بھرپور اور مکمل سائنسی منصوبہ ہے۔ سیاست معاشیات کا انتہائی مرکوز خیال ہے اور اسے معاشیات پر مقدم ہونا چاہئے اور وہ سیاست ہی ہے جس کے ذریعے کوئی ترقی پسند جماعت اقتدار حاصل کر کے فرسودہ معاشی تعلقات کو ختم کرنے کی بنیاد ڈال سکتی ہے' اسی طرح معاشی تعلقات کی نوعیت بھی انتہائی براہ راست اور فوری طور پر سیاست کے شعبے پر اثرانداز ہوتی ہے۔ عام طور پر کلاسیکی جمہوری ملکوں میں دولت اپنا اقتدار بالواسطہ طور پر استعمال کرتی ہے' جیسے کوئلے' فولاد کی تجارت کے اجارہ دار اور بینکوں کے مالک پس منظر میں رہ کر اپنے مہروں کو آگے لاتے ہیں اور یہ اس طرح اپنا طبقاتی مفاد جو لازماً محنت کشوں کے استحصال پر مبنی ہوتا ہے۔ محفوظ کر لیتے ہیں لیکن گذشتہ چند ہی سال کے اندر پاکستان کا معاشی ڈھانچہ اس طرح بدل دیا گیا ہے کہ مجموعی طور پر مزدوروں اور محنت کشوں کو اپنا انقلابی کردار ادا کرنے کے لئے زیادہ مناسب ماحول مل گیا ہے۔ اب ملک میں کوئی بڑی مل' بینک یا انشورنس کمپنی' کسی ایک خاندان یا فرد کی ملکیت نہیں رہ گئے' جو دولت کے ان سرچشموں کی قوت استعمال کر کے

www.bhutto.org

محنت کش طبقوں کی سیاسی امنگوں کو کچل سکے۔ جاگیرداری نظام پر پہلی ضرب لگائی جا چکی ہے اور مناسب حد تک دوسری زرعی اصلاحات کی بھی ضرورت پڑے گی بعض انتہا پسند لوگ اس سے مطمئن نہیں ہیں۔ لیکن ان کی یہ خواہشات انقلابی استدلال پر مبنی نہیں' ہر معاشرے میں انسانوں کے درمیان معاشرتی تعلقات میں انقلابی تبدیلیاں ان خارجی قوانین سے معین ہوتی ہیں' جن کے مطابق طریقۂ پیداوار کا ارتقاء ہوتا ہے۔ ایک طبقہ پیداوار سے دوسرے تک عبوری دور کی ضروریات تعلقاتِ پیداوار اور پیدا آور قوتوں کے کردار کے درمیان مطابقت رکھنے والے قانون کے عمل سے پیدا ہوتی ہے' ہمارے ہاں جو فرسودہ اور قدیم طریقۂ پیداوار رائج ہے اس کے تحت جاگیردارانہ نظام پر اتنی ہی ضرب لگائی جا سکتی ہے جتنی انقلاب کے عمل کو متحرک رکھنے میں معاون ثابت ہو سکے۔ ہاں اس کے ساتھ جس چیز کی اصل ضرورت ہے وہ طریقۂ پیداوار کو فرسودگی سے نکال کر جدید سائنسی اور مشینی ترقی کی سطح پر لانے کی ہے۔ یہی وہ عمل ہو گا جو جاگیرداری کے انقلابی خاتمے کی خارجی بنیاد بنے گا اور یہ خارجی بنیاد فراہم کرنا در حقیقت زیادہ انقلابی عمل ہو گا۔ بھٹو نے اپنے انقلابی اقتدار کے عہد میں ان دونوں معیشتی شعبوں میں جہاں ایک طرف دولت مندوں کی گرفت کو کمزور کر کے انہیں سیاسی اور معاشی لحاظ سے نیچے اتارا ہے وہاں دوسری طرف ہاریوں اور مزدوروں کو آگے بڑھایا ہے یہی طبقات در حقیقت انقلاب کی محرک قوتیں ہیں۔

اب ہم اپنی تاریخ کے نازک ترین دور میں آ چکے ہیں' بالخصوص آئندہ منعقد ہونے والے انتخابات میں وہ طبقے جن کے مفادات کو بھٹو نے زِک پہنچائی ہے' اپنی زندگی اور موت کی آخری جنگ لڑیں گے۔ ان انتخابات میں یہ فیصلہ ہونا ہے کہ ملک میں عوامی انقلاب کا جو عمل بھٹو نے شروع کیا ہے' اسے آگے بڑھانا ہے یا ایک بار پھر استحصالی طبقوں نے ابھرتے ہوئے محنت کشوں کی قوم کو کچل دینا ہے۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ بھٹو نے استحصالی طبقوں کی منہ زور قوت کو کافی حد تک لگام ڈال دی ہے' لیکن ابھی وہ اتنے کمزور بھی نہیں ہوئے کہ سازشوں اور فریب کاریوں کو نظر انداز کیا جا سکے۔ لہٰذا ان انتخابات میں سنہ 70ء کی طرح ہاریوں اور مزدوروں کو اپنے بے پناہ انقلابی شعور کے ساتھ منظم ہو کر ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں اپنا کردار ادا کرنا ہو گا اور اپنے ووٹوں کے ذریعے عوام دشمنوں کی رہی سہی قوت کو کچل کے پاکستان پیپلز پارٹی کو اس انداز میں دوبارہ ایوانِ اقتدار تک پہنچانا ہو گا کہ اس کے قائد اپنے انقلابی نظریئے پر عمل کرنے میں زیادہ مضبوط اور قوی ہوں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب محنت کشوں کے حقوق کی محافظ یہ انقلابی پارٹی ملک کی واحد نمائندہ اور عوامی پارٹی کے روپ میں دوبارہ اقتدار میں آئے۔ کیونکہ انقلاب کا اگلا مرحلہ زیادہ دشوار گزار' کٹھن اور بھرپور تبدیلیوں کا حامل ہو گا۔ اب کے انتخابات میں صرف دو ہی قوتوں کا مقابلہ ہے۔ محنت کش عوام کی واحد جماعت پاکستان پیپلز پارٹی اور استحصالی قوتوں کے وہ مختلف ٹولے جو مختلف ناموں سے پاکستان میں انقلاب کو ختم کرنے کے خواہش مند ہیں۔ مجھے

www.bhutto.org

پاکستان کے باشعور عوام پر کامل اعتماد ہے کہ وہ انقلاب کے ان دشمنوں کو میدان انتخاب میں اس بری طرح چت کر دیں گے کہ ان کی کوئی قابل ذکر عددی طاقت ان کی قابل احترام انقلابی اسمبلی میں رجعت پسندی' فرسودگی اور انقلاب دشمنی کے جراثیم لے کر نہیں پہنچ سکے گی۔

اب آگے چل کر ہمیں ایک نئی طرز کی عوامی جمہوریت کی داغ بیل ڈالنی ہے اور اس ملک کے غریب اور نادار عوام کے حقیقی دشمنوں غربت' جہالت' بیماری اور خانماں بربادی کے خلاف ایک طویل اور فیصلہ کن جنگ کا آغاز کرنا ہے۔ بھٹو کچھ تو انتخاب سے قبل ہی ایسے اقدام کرنے والے ہیں۔ جو لوگ واقعی پارٹی یا حکومت کا نام استعمال کر کے ناجائز مفادات حاصل کرنے کے مرتکب ہوئے ہیں وہ خواہ کسی بھی اعلیٰ پوزیشن یا مرتبے کے مالک کیوں نہ ہوں' ان کو عبرت ناک سزائیں دی جائیں گی۔ سیاست کو گندگی' مفاد پرستی اور عوام دشمنی سے پاک کرنے کے لئے انہوں نے بھرپور عملِ جراحی کرنے کا ایک شاندار منصوبہ بنا رکھا ہے۔ ایسے افراد کو نہ صرف مقدمات کے ذریعے عدالتوں میں لایا جائے گا بلکہ ان کی بداعمالیوں پر مشتمل وہائٹ پیپر بھی شائع کئے جائیں گے تاکہ یہ لوگ عوام کے سامنے پوری طرح بے نقاب ہوں اور دوسرے لوگ بھی ان کے انجام سے عبرت حاصل کریں۔ اس آپریشن کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ خود پاکستان پیپلز پارٹی نئے سرے سے ایک پاک صاف اور شفاف کردار کی پارٹی بن کر ابھرے گی اور آئندہ بننے والی حکومت میں جناب بھٹو کے ساتھ جو لوگ شریکِ اقتدار ہوں گے وہ صرف عوام کی خدمت اور فلاح و بہبود کے جذبے سے سرشار ہوں گے اور کوئی یہ جرأت نہیں کر سکے گا کہ اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے ناجائز مفادات حاصل کر سکے۔ مستقبل میں بھٹو جو بھرپور انقلابی عمل شروع کرنے والے ہیں اس کے لئے انہیں مضبوط اور بے داغ کردار کے حامل ساتھیوں ہی کی ضرورت ہو گی اور یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے وہ تمام ممکنہ اقدامات کر رہے ہیں۔

کوئی بھی معاشرہ اپنی نصف آبادی کو پیداواری عمل سے الگ رکھ کر جدید دور کی ضروریات کے مطابق ترقی و خوشحالی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر نہیں کر سکتا۔ اسلام نے خواتین کو مردوں کے برابر حقوق دے رکھے ہیں' لیکن ہم نے ہندوانہ طرزِ معاشرت کے اثرات کے ساتھ اپنی آبادی کے اس نصف حصّے کو بالکل اپاہج اور ناکارہ بنا دیا ہوا ہے۔ جناب بھٹو نے پاکستان کی مظلوم خواتین کو صدیوں کے جبر و استبداد اور معاشرتی غلامی کی پستیوں سے نکالنے کے لئے ایک عظیم انقلابی منصوبہ بنا رکھا ہے' جس پر وہ جلد ہی عمل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں' اس مقصد کے لئے شاید عائلی قوانین میں بھی تبدیلیاں کی جائیں گی جن کے تحت خواتین کو کافی حقوق دیئے جائیں گے اور انہیں ظلم و ستم سے چھٹکارا دلایا جائے گا اور قانونی طور پر ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں گے کہ مرد اُن پر ظلم نہ کر سکے' پاکستان کی مذہبی اور تہذیبی اور سماجی اقدار کو

www.bhutto.org

ملحوظ رکھتے ہوئے ایسے اقدامات بھی کئے جائیں گے کہ خواتین معاشرے کی فعال رکن بن کر پیداواری عمل میں شرکت کر سکیں۔ کیونکہ جب تک خواتین معاشی طور پر آزاد نہ ہوں گی ان کی آزادی کا تصوّر بے معنی ہے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا کہ مختلف سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں خواتین کے لئے ملازمتوں کا ایک لازمی حصّہ مقرر کر دیا جائے۔ ایسی چھوٹی صنعتوں کا وسیع پیمانے پر قیام بھی ممکن ہے جہاں صرف خواتین کام کر سکیں اور یہ صنعتیں اس انداز میں ہر گاؤں اور قصبے میں پھیلا دی جائیں کہ پورے ملک کی عورتیں اپنے گھروں میں رہتے ہوئے ان میں کام کر سکیں۔ تعلیم یافتہ اور ہنرمند خواتین کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ان کے والدین اور شوہر انہیں معاشرے میں اپنا کردار ادا کرنے سے روکتے ہیں۔ اگر یہ مسئلہ اسی طرح برقرار رہا اور ترغیب و آمادگی کے تمام طریقوں کے استعمال کے بعد بھی مردوں نے اس قسم کی لایعنی رکاوٹیں پیدا کرنے کا سلسلہ جاری رکھا تو عین ممکن ہے کہ ایسی خواتین کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے انہیں قانونی طور پر حقوق دیئے جائیں' خواتین کو ان کے صدیوں سے کھوئے ہوئے حقوق دلوانے کے لئے اس انقلابی منصوبے کی تشکیل میں محترمہ بیگم نصرت بھٹو کی بے پناہ اور گہری دلچسپی کا ذکر نہ کرنا ان کے جذبۂ خدمت کے ساتھ ناانصافی ہو گی۔ اس انقلابی منصوبے کی تکمیل میں ان کی پُرخلوص کوششیں کافی حد تک دخیل ہیں۔

تعلیمی نظام کے سلسلے میں بھی ایک شاندار انقلابی پروگرام مرتب کیا گیا ہے' طلبہ کی عملی سیاست میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی کی وجہ سے ہمارا تعلیمی معیار افسوسناک حد تک پست ہو گیا ہے۔ اس معیار کے ساتھ ہم ترقی کی مطلوبہ رفتار حاصل نہیں کر سکیں گے۔ جناب بھٹو کو نئی نسل کے اس فنی و تعلیمی زوال پر شدید تشویش ہے۔ اب وہ نظامِ تعلیم میں ایسی تبدیلیاں لانے کا ارادہ رکھتے ہیں جن کے تحت طلبہ کے لئے علم و ہنر کے اکتساب کا فریضہ انجام دینا لازمی ہو جائے۔ تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ طلبہ کا سیاست میں ملوّث ہونا ان کی تعلیم اور تربیت پر مضر اثرات ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی نے طلبہ میں اپنی ذیلی تنظیم نہیں بنائی۔ طلبہ میں پیپلز پارٹی کی ہم خیال جو تنظیمیں کام کر رہی ہیں' پارٹی نے باضابطہ طور پر انہیں کبھی اپنی شاخ قرار نہیں دیا' میرا اندازہ ہے کہ مستقبل میں طلبہ کو عملی اور اجتماعی سیاست میں ملوّث ہونے سے روکنا پڑے گا۔ تاکہ سیاسی پارٹیاں انہیں گمراہ کر کے' ان کے تعلیمی مستقبل کو اپنے مفادات کی خاطر تباہ نہ کر سکیں' ہمیں ایک اچھے اور شاندار مستقبل کے لئے علم و ہنر کے بلند ترین معیار کی ضرورت ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے تعلیمی معیار کو کافی سخت کرنا پڑے گا۔ جناب بھٹو نظامِ تعلیم میں کی جانے والی تبدیلیوں میں یہی مقصد پیشِ نظر رکھیں گے۔

مستقبل میں پارٹی کی انقلابی اور سائنسی بنیادوں پر تنظیم کرنے کے لئے بھی وہ ایک شاندار منصوبہ بنا چکے ہیں۔ اس میں ان کا اپنا مقام ایک فکری و نظریاتی رہنما کا ہو گا جو پارٹی کو فکر اور سیاسی فلسفے سے مالا مال

www.bhutto.org

www.bhutto.org

کرتا ہے۔ ایسے اقدامات کئے جائیں گے کہ نظریاتی انتشار کو جنم دینے والی گروہ بندیاں نہ پیدا ہو سکیں پارٹی کے لئے فکری و نظریاتی رہنمائی فراہم کرنے کی ذمہ داری صرف قائد کی ہو گی۔ جو لوگ ان نظریات سے انحراف کریں گے یا ان میں الجھاؤ پیدا کرنے کی کوشش کریں گے ان کا سختی سے احتساب کیا جائے گا۔ کیونکہ کسی بھی انقلابی پارٹی میں نظریاتی انتشار یا فکری الجھاؤ اس کے انقلابی کردار کو مجروح کرتا ہے اور اسی طرح قیادت میں عدم مرکزیت بھی انقلابی عمل میں خلل انداز ہوتی ہے۔ قائداعظمؒ کے بعد قیادت کی عدم مرکزیت نے ہمیں جس انتشار، بے جہتی اور بالآخر تباہی سے دوچار کیا ہے، اس کی مثال ہمارے لئے کافی سبق آموز ہے، ہم دوبارہ ایسے تجربات کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ قدرت نے ایک طویل عرصے اور بے پناہ قومی نقصانات کے بعد ہمیں ایک ایسا قد آور رہنما عطا فرمایا ہے جو ہماری عظیم قوم کو اس کا باوقار اور جائز مقام دلوانے کا اہل ہے۔ ہمیں اس عظیم لیڈر کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے اس کی قیادت میں پوری طرح متحد ہو کر آگے بڑھنا ہو گا۔ پارٹی کے رہنما کے انقلابی افکار و نظریات سے عوام کو مسلح کرنے کے لئے وسیع پیمانے پر ایک اشاعتی پروگرام شروع کیا جائے گا تاکہ عوام کے انقلابی شعور کی سطح کو بلند کیا جا سکے۔ پارٹی کے اندر ہر سطح پر انتخابات کرائیں جائیں گے اور عہدیداروں کے لئے خدمت، دیانت اور نظریاتی پختگی کے حد درجہ سخت معیار مقرر کئے جائیں گے۔ عوامی جمہوری اداروں کو فروغ دینے اور نچلی سطحوں تک عوام کو اقتدار فراہم کرنے کے لئے انتہائی آزادانہ ماحول میں بلدیاتی انتخابات کرائے جائیں گے اور پیپلز پارٹی اچھے مثالی کارکنوں اور شاندار پروگرام کے ساتھ ان انتخابات میں حصہ لے گی۔ یہاں پارٹی کو ایک مضبوط اور نظریاتی کارکنوں کا لیڈر ملے گا جو سیاست کی عملی تربیت کے مرحلوں سے گزرتا ہوا آگے بڑھے گا اور اسی طرح عوامی جمہوریت کی صحیح روح کارفرما ہو سکے گی۔ مجھے یقین ہے کہ جناب بھٹو پارٹی کو جن انقلابی بنیادوں پر منظم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، ان کے حصول کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی ہمارے ملک ہی کی نہیں بلکہ پورے ایشیا میں ایک مثالی، منظم اور نظریاتی لحاظ سے پختہ انقلابی پارٹی ہو گی جو اس برّ اعظم کو جدید اور سائنسی سیاست کے سلسلے میں رہنمائی فراہم کرے گی۔ کسی انقلاب کی معنویت اور کیفیت کا اندازہ اس امر سے کیا جاتا ہے کہ وہ معاشرے میں افراد کے باہمی معاشی تعلقات اور نظام ملکیت پر کس انداز میں اثر ڈالتا ہے؟ پیپلز پارٹی نے اپنے مختصر سے دور حکومت میں ثابت کر دیا ہے کہ وہ ان بنیادی انقلابی اصولوں کی روشنی میں ایک حقیقی انقلابی پارٹی ہے۔ مستقبل میں جناب بھٹو اس سمت میں مزید اقدامات کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ زرعی اصلاحات میں مزید توسیع کی جائے گی اور مشترکہ فارمنگ پر زور دیا جائے گا تاکہ فرسودہ اور روائتی طریقۂ پیداوار بدل کر معاشرے کی انقلابی حالت کو زیادہ مستحکم بنایا جائے۔ اس بار شہری جائیدادوں کی طرف بھی توجہ دینا لازمی ہو گا ممکن ہے اس سلسلے میں کوئی معیار مقرر کر کے حدِ ملکیت قائم کر دی جائے۔ یہ قدم اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہو گا کیونکہ اسلام ہمیں تعلیم دیتا

www.bhutto.org

ہے کہ اپنی ضرورت سے زائد چیزوں کو غریبوں اور ناداروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ تاکہ انسانوں کے مابین تفاوت اور مالی فرق کم ہو۔

معاشرتی برائیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے بھی ایک وسیع تخلیقی اور انقلابی پروگرام پر عمل کیا جائے گا۔ رسہ گیروں اور غنڈوں کے سرپرستوں کے خلاف انتہائی سخت تادیبی کارروائیاں ہوں گی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سرکاری مشینری کو پوری طرح پاک اور صاف کیا جائے گا۔ رشوت اور سفارش کے اثرات کو ختم کرنے کے لئے ایسے مؤثر اقدامات کئے جائیں گے کہ ان کے ذرائع کو استعمال کر کے کوئی شخص کسی فرد یا پوری قوم کی حق تلفی نہ کر سکے گا۔ اس معاملے میں جناب بھٹو بے حد حساس واقع ہوئے ہیں وہ پاکستان کو ایک ایسے مثالی معاشرے میں ڈھالنا چاہتے ہیں جہاں غریب کسان اور شہروں کے مزدور، چوری، غنڈہ گردی، اغوا اور رسہ گیری کے خوف سے آزاد ہو کر سکھ اور آرام کی نیند سو سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ ہر ممکن تدبیر پر عمل کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ اسی طرح فرقہ واریت، اوہام پرستی اور دیگر ایسی خرافات کے خلاف بھی زبردست جنگ کی جائے گی جو ہماری معاشرتی زندگی کو گھن کی طرح کھا رہی ہے۔ اس کے لئے اسلام کی انقلابی روح اور جدید علوم کی روشنی میں نہ صرف تربیتی مہمات چلائی جائیں گی بلکہ زیادہ ضرر رساں توہمات اور خرافات کے خاتمے کے لئے قوانین کا سہارا بھی لینا پڑا تو اس سے بھی گریز نہیں کیا جائے گا۔ ہمارا مذہب خود ایک انقلابی تحریک ہے اور ہر تحریک کے دو پہلو ہوتے ہیں، اس کا پروگرام اور عمل، بدقسمتی سے آج تک ہم پروگرم کو سنبھال کر بیٹھے رہے ہیں لیکن عمل کی طرف نہیں آئے۔ جناب بھٹو اب اسلام کی انقلابی روح کو معاشرے میں عملی طور پر جاری و ساری دیکھنا چاہتے ہیں اور میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آنے والے چند سالوں میں جناب بھٹو اسلام کی شاندار خدمات انجام دیں گے اور نئی دنیا کو عملاً ثابت کر کے دکھائیں گے کہ یہ مذہب آج بھی انسانیت کی فلاح و بقاء کے لئے رہنمائی کا عظیم کردار ادا کر سکتا ہے کچھ بعید نہیں کہ بھٹو کی قیادت میں چند برسوں کے اندر پاکستان انقلابی مسلمانوں کا سب سے ترقی پسند اور جدید ملک بن کر دنیائے اسلام کے نقشے پر ایک نئے انداز میں سامنے آئے۔

قدرت نے ہمارے ملک کو بے پناہ قدرتی خزانوں سے مالا مال کیا ہے لیکن یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ اپنی نظریاتی گمراہی، بے عملی اور سیاسی انتشار کی وجہ سے ہم ان عطیاتِ خداوندی سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکے۔ لیکن جناب بھٹو نے اس میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دینے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ وہ نہایت وسیع پیمانے پر تحقیق، جستجو اور دریافتوں کا سلسلہ شروع کر چکے ہیں اس کے لئے محدود وسائل کے باوجود کثیر رقوم فراہم کی جا رہی ہیں اور مستقبل میں اس سلسلے کو مزید تیز تر کیا جائے گا۔ اب تک جو سروے رپورٹیں اور تحقیقاتی نتائج سامنے آئے ہیں وہ حوصلہ افزا اور اطمینان بخش ہیں۔ معدنی دریافتوں کے پروگرام کی جناب

www.bhutto.org

بھٹو بذات خود نگرانی کرتے ہیں اور کچھ بعید نہیں کہ آنے والے مختصر سے عرصے میں ہم زمینی خزانوں سے کوئی ایسی دولت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں جس کی وجہ سے ملک کی اقتصادی کایا پلٹ ہو سکے۔ اگر خدا نے جلد ہی ان امیدوں کو پورا کر دیا تو جناب بھٹو اس عطیۂ خداوندی سے قوم کو ایسے انداز میں مستفید کرنے کے عزائم رکھتے ہیں کہ ہم نہ صرف اقتصادی طور پر خوش حال ترین اقوام میں شامل ہو جائیں گے بلکہ اپنے خطّے کی ایک مضبوط قوم بھی بن جائیں گے جو عالمی سیاسیات میں ایک شاندار انقلابی کردار کی حامل ہوگی۔

خارجہ امور میں جناب بھٹو کی مہارت ایک مسلمہ امر ہے۔ ان کی شخصیت صرف پاکستان تک محدود نہیں وہ ایشیا کے بلند مرتبہ رہنما ہیں اور انہیں معلوم ہے کہ تیسری دنیا میں انہیں ایک عظیم انقلابی کردار ادا کرنا ہے۔ لیکن اس وسیع میدان میں پوری تیاری کے ساتھ داخل ہونے کے لئے نہ صرف اپنے پڑوسیوں کے ساتھ معاملات درست کرنا ضروری ہے بلکہ داخلی طور پر قوم کو معاشی لحاظ سے مضبوط اور خوش حال بنانا بھی لازمی ہے۔ ناانصافی کے شکار افراد پر مشتمل قوم اور اس کا رہنما کبھی کوئی عالمی کردار ادا نہیں کر سکتا۔ اس کا انحصار بھی پڑوسیوں کیساتھ متنازعہ مسائل حل کرنے پر ہے ہمارے لئے سب سے بڑا مسئلہ کشمیر ہے۔ جس کی وجہ سے گذشتہ انتیس برس سے ہماری معیشت کو کمر توڑ بوجھ برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ جناب بھٹو نے عزم کر رکھا ہے کہ وہ پاکستانی عوام کی امنگوں' خواہشوں اور طاقت کے مطابق اس مسئلے کا کوئی کامیاب حل تلاش کریں مجھے یقین ہے کہ تاریخ نے یہ سعادت انہیں کے لئے محفوظ کر رکھی ہے کہ وہ دنیا کے اس خطّے کے سب سے پیچیدہ اور دشوار مسئلے کو حل کریں۔ اس مسئلے کے حل ہو جانے کے بعد ہم اپنے وسائل کو غریب اور مفلس عوام کی زندگی بہتر بنانے پر صرف کر سکتے ہیں اس طرح پڑوسیوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات اور داخلی طور پر معاشی استحکام کا حامل پاکستان عالمی برادری میں زیادہ مؤثر اور فعال کردار ادا کر سکے گا اور تیسری دنیا جناب بھٹو ایسے عظیم رہنما کی خداداد صلاحیتوں سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے گی۔ افغانستان کے ساتھ بھی مذاکرات کا آغاز ہو چکا ہے اور انشاءاللہ جلد ہی کچھ اس کے ساتھ بھی کشیدگی اور تناؤ میں کمی واقع ہو جائے گی جو آگے چل کر اچھے اور دوستانہ تعلقات پر منتج ہو سکتی ہے۔

دفاعی لحاظ سے جناب بھٹو اس وقت بھی پاکستان کو اتنا طاقتور بنا چکے ہیں کہ وہ ماضی میں زیادہ آبادی' رقبے اور وسائل کے باوجود کبھی اتنا مضبوط نہیں تھا۔ لیکن مستقبل میں انہوں نے دفاعی استحکام کا جو شاندار منصوبہ بنا رکھا ہے اس کی تکمیل ہونے پر ہم اپنے خطّے کی مضبوط ترین قوت ہوں گے جو اس علاقے کے امن اور استحکام کی ضامن ہوگی۔ مستقبل کے پاکستان کے دفاع کا انحصار روائتی طریقوں اور تعداد یا افراد پر نہیں جدید ترین تکنیک' کارکردگی اور معیار پر ہوگا۔

www.bhutto.org

رومانیہ کے صدر چاؤ شسکو صدر بھٹو کے ہمراہ لاہور ایئرپورٹ پر

www.bhutto.org

مستقبل کے اس اجمالی سے خاکے سے آپ نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو کے عزائم اور پروگرام ہماری عظیم قوم کی دیرینہ امنگوں اور تمناؤں پر مشتمل ہیں ہر عہد اور قوم اپنے مثالی پیکر اور شبیہ کے مطابق اپنا رہنما تلاش کرتی ہے اور وہ رہنما اپنے دور اور اپنی قوم کی ممتاز خصوصیات کا انتہائی واضح اور صاف انعکاس ہوتا ہے اور دوسروں کے مقابلے میں اپنے دور کی ضروریات کا بدرجۂ غائت اظہار کرتا ہے وہ اپنی قوم کی اجتماعی روح کا امین ہوتا ہے۔ یہ وہی رہنما ہوتا ہے جو تاریخ اور واقعات کی رفتار پر اپنی عظیم شخصیت اور کردار کی گہری چھاپ چھوڑ جاتا ہے ذوالفقار علی بھٹو ایک ایسے ہی عظیم اور تاریخ ساز رہنما ہیں۔ سات کروڑ پاکستانی عوام کی امیدوں 'امنگوں اور تمناؤں کی تجسیم۔

www.bhutto.org

پس نوشت

سطور گذشتہ 76ء میں لکھی گئی تھیں اس وقت سے لے کر اب تک بہت سا پانی پل کے نیچے سے گذر چکا ہے انسان سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ اور ہے' سیدنا علی مرتضیٰؓ نے فرمایا تھا "عرفت ربی بفسخ العزائم" میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی منسوخی سے پہچانا ہے۔ انسان ارادے باندھتا ہے لیکن کوئی بالاتر طاقت انہیں منسوخ کر دیتی ہے 'تقدیر کی یہی لہر ارادۂ الٰہی کا دوسرا نام ہے اور ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں'۔

"ذوالفقار علی بھٹو کوئی شک نہیں عبقری تھے' اعلیٰ تعلیم یافتہ اور انتہائی وسیع المطالعہ راہنما تھے اسی لئے میں نے انہیں "دیدہ ور" کا نام دیا ہے کہ وہ وقت کے نبض شناس تھے' جاگیردارانہ طبقہ سے تعلق رکھنے کے باوجود انہوں نے غریب عوام میں اپنے حقوق کا شعور پیدا کیا اس بے زبان انبوہ کو زبان دی وہ ہاتھ جو پہلے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے جوتے صاف کرتے تھے انہیں ان کے گریبانوں تک پہنچا دیا' 70ء کے عام انتخابات میں ان کا لایا ہوا یہ عوامی اور جمہوری انقلاب ہماری تاریخ میں سنہری الفاظ سے لکھا جائے گا کہ انہوں نے پہلی دفعہ سیاست کو محلوں سے نکال کر جھونپڑیوں تک پہنچا دیا' عوام کو ایک نئی منتخب قیادت عطا کی جو خود ان کے اندر سے اُبھر کر اوپر آئی تھی مگر وہ جو کہتے ہیں بڑوں کی غلطیاں بھی بڑی ہوتی ہیں ان سے بھی بعض ایسی غلطیاں ہوئیں جنہوں نے "مستقبل کے اس صورت گر" کو ماضی کا حصہ بنا دیا' امام اعظم ابو حنیفہؒ کا یہ واقعہ کس کو معلوم نہیں کہ وہ گلی سے گذر رہے تھے دیکھا کہ کچھ بچے کھیل رہے ہیں' بارش ہو چکی تھی اور گلی میں پھسلن تھی امام نے بچوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا "بچو! ذرا دیکھ بھال کے کھیلو کہیں پھسل نہ جانا" امام کی یہ نصیحت سنی تو ایک بچے نے کہا "حضرت! ہمارے پھسلنے کی

www.bhutto.org

کوئی بات نہیں، سنبھل کے تو آپ کو چلنا چاہئے' خدانخواستہ اگر کہیں آپ پھسل گئے تو زمانہ پھسل جائے گا"۔

واقعہ بلاتشبیہ عرض کیا گیا ہے مدعائے گفتگو یہ ہے کہ عام لوگوں کی غلطیاں تو انفرادی سطح سے آگے نہیں بڑھتیں مگر بڑوں کی غلطیاں بعض اوقات پورے نظام کو درہم برہم کر دیتی ہیں' بھٹو صاحب کے معاملے میں بھی یہی ہوا کہاں تو ان کی قیادت میں قوم نئے انتخابات کے بعد اس نئے عزم سے جمہوریت کاملہ کی جانب سرگرم سفر ہونے کو تھی اور کہاں مارشل لاء کے قعرِ مذلت میں جا گری' 77ء کے یہ انتخابات کیسے ہوئے بھٹو صاحب سے کہاں کہاں غلطی ہوئی اس صورت حال سے بیرونی طاقتوں نے کیا کیا فائدہ اٹھایا یہ ایک طویل داستان ہے اور اسے میں نے اپنی کتاب "اور لائن کٹ گئی" میں بالتفصیل قلم بند کر دیا ہے۔

اس کہانی کا انجام بڑا دردناک ہوا' کاش! یہ سب کچھ نہ ہوتا اس کا خمیازہ گیارہ سال قوم نے بھگتا اور نہ جانے! ابھی کتنا عرصہ اور بھگتے گی' "لائن کٹ جانے کے بعد سے بھٹو کی پھانسی تک" کا عرصہ ہماری تاریخ کا بہت اہم مگر بڑا پراسرار عرصہ ہے وہ وقت زیادہ دور نہیں جب ان حالات سے بھی نقاب اٹھے گا مگر اس کے لئے قارئین کو ابھی کچھ اور وقت انتظار کرنا پڑے گا میں نے بھٹو مرحوم کی الم ناک موت پر جو شعر کہے تھے وہ میرے دوسرے مجموعہ کلام "لمحے" (مطبوعہ 1985) میں شامل ہیں' فی الوقت انہیں ہی اپنے ذہن میں تازہ کر لیجئے زندگی ہے تو تفصیلات پھر سہی۔

راز دنیا پہ کھلا ہے یہ ترے قتل کے بعد
لوگ مر کے بھی رہا کرتے ہیں زندہ کیسے
کون کتنا ہے ترے قتل کی سازش میں شریک
اک نہ اک روز نقاب اٹھے گا ہر چہرے سے
شہر تو محوِ مناجات و دعا تھا' پوچھو
حاکمِ شہر نے وہ رات گزاری کیسے؟
جیسے دراصل ہوا کرتے ہیں کوثر حالات
بسا اوقات نظر آتے نہیں ہیں ویسے

www.bhutto.org